(سلسلۂ مشاہیر اسلام)
نمبر (۱)

سوانح حیات

سُلطان ابنِ سعُود

مُرتّبہ

سیّد سردار محمد حسنی بی، اے (آنرز)

تمام اسلامی ممالک کے حوادث پر بالعموم

اور

عرب و حجاز کے کوائف پر بالخصوص

نگاہ رکھنا

ہر مسلمان کا مذہبی و اخلاقی فرض ہے

ملنے کا پتہ

مینیجر سلسلہ مشاہیر اسلام

اندرون دروازہ سیداں

جالندھر شہر

۱۹۳۶ء

اشاعت اول :۔ دو ہزار ۲۰۰۰

قیمت فی جلد دو روپے

ہانڈہ الیکٹرک پریس جالندھر شہر میں باہتمام لالہ کیشب چندر ہانڈہ بی اے مینیجنگ پروپرائیٹر طبع ہوئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوانح حیات

سلطان عبد العزیز ابن سعود آل عزیز آل سعود

والئے

حجاز و نجد و ملحقاتہا

جسمیں

پہلی سعودی حکومت کے محیر العقول کارنامے عرب میں ترکی اور مصری حکومتوں کے الجھے ہوئے حالات خاندان رشید کی المناک سرگذشت تحریک وہابیت کی تبلیغ و اشاعت۔ وہابیوں کا جزر و مد تحریک اخوان کی بناء و نتائج میں سلطان ابن سعود کے عہد بعہد کے حالات و کوائف اور درخشندہ فتوحات۔ فتح حجاز کے مفصل واقعات۔ دستور ملکی کا قیام و نفاذ انتظامات ملکی کی اصلاحات علوم و فنون کی ترویج و تشویق۔ انسانیت و مدنیت کیلئے گرانقدر مساعی نجدی معیشت و معاشرت مغربی حکومتوں سے تعلقات اور سلطنت سعودیہ کے اُن سے متعدد معاہدات شرح و بسط سے درج کئے گئے ہیں

اور

عرب کے اقتصادی امکانات اور سلطنت سعودیہ اور تحریک وہابیت کے مستقبل پر مختلف پہلوؤں سے سیر حاصل بحث کیگئی ہے۔

مرتبہ

سید سردار محمد حسنی بی اے (آنرز)

۱۹۳۶ء

(سلسلہ مشاہیر اسلام)

جالندھر شہر

محمد عبدہ کے سوانح حیات

اور

مصر کی تحریکِ اصلاح و تجدد

اس کتاب میں شیخ الاسلام مفتی محمد عبدہ کے کارنامہائے حیات اور مصر کے پورے دورِ جدید کی تاریخ کا مفصل بیان ہے تحریکِ اصلاح و تجدد کا مکمل تذکرہ اور علامہ موصوف کی ذہنی کاوشوں اور اصلاحی اقدامات پر مبسوط تبصرہ ہے۔ اس مشہور و معروف قائدِ فکر کی معرکتہ الآرا تقاریر و تحاریر کا انتخاب بھی شامل ہے شروع میں سید جمال الدین مرحوم افغانی کی مختصر سوانح عمری دیگئی ہے۔

یہ کتاب مصر کے عصرِ حاضرہ کی بہترین شرح ہے۔

زیرِ طباعت

جدید ترکی

اس کتاب میں جدید ترکی کی مکمل تاریخ اور دورِ جدید کی جملہ اصلاحات کا مفصل تذکرہ ہے سیاسی تعلیمی۔ اقتصادی۔ معاشرتی۔ تمدنی۔ اخلاقی۔ عسکری غرضیکہ ہر قسم کے دلچسپ حالات شرح و بسط سے درج کئے گئے ہیں۔ اور جدید ترکی کے خارجی تعلقات پر نہایت درست بحث کیگئی ہے

زیرِ طباعت

فہرست مضامین

دیباچہ

سلطان ابن سعود کے سوانح حیات کا ایک مختصر خاکہ ناظرین کی خدمت میں پیش ہے۔

کیونکہ انسان کی زندگی کائنات کا سب سے پوشیدہ راز ہے۔ اور انسانی شخصیت کو سمجھنا اور سمجھ کر دوسروں کو سمجھانا بہت دشوار امر ہے۔ اسلئے سلطان ابن سعود جیسے زعیم ملت اور قائد اعظم کی سوانح عمری کسی بڑے آدمی کو لکھنی چاہیئے تھی۔ نہ کہ میرے ایسے گمنام اور ہیچ میرز شخص کو۔ بہر حال جیسا کچھ بن آیا حاضر ہے۔

سلطان ابن سعود کی زندگی کا بیان دراصل ایک قوم کی ماضی کی روشنی میں اسکے حال اور استقبال کی تفسیر کرنا ہے۔ کہ ابن سعود نجدی قوم کا قائد ہی اور تحریک وہابیت کا نمائندہ حال بھی۔ ایک خواب گراں سے جاگنے والی ملت ایک بیدار ہونیوالے ملک کی ساری مستعدی سارا ذوق و شوق ساری سرگرمی اور گرمجوشی ساری حوصلمندی اور قوت ایثار اس ایک شخصیت میں جلوہ گر ہے۔ اسکی ذات آغاز کار کی تمام تکلیفوں اور پریشانیوں بے ترتیبیوں اور ہنگاموں کا مظہر بھی ہے۔ نامساعد حالات سے جنگ پیہم بے سر و سامانی بے یاری و بے مددگاری ہمرہوں کی خفتہ پائی ہم نواؤں کی کج فہمی۔ غرض کون کونسے افکار و آلام تھے جن سے اسکے قلب و روح کو صدمہ نہیں پہنچا۔ مختصراً وہ نجدی قوم کی سرفروشی عرب کے جذبۂ آزادی کی کشمکش اور جہاد حریت کی اجمالی تصویر ہے

ابن سعود ایسے شخص کی سیرت نگاری ایک شخص کی سیرۃ لکھنا نہیں وقت کی پوری تاریخ مرتب کرنا ہے۔ کس پہلو کو لیا جائے کس کو چھوڑا جائے۔ کون کونسے رُخ نمایاں کئے جائیں۔ اور کونسے مدھم ہی رہنے دئے جائیں۔ کیا کیا پھیلایا جائے۔ اور کیا کیا سمیٹ لیا جائے۔ ہر ہر موضوع ایک مفصل اور مبسوط گفتگو کا طالب ہر ہر عنوان ایک ضخیم دفتر کا متقاضی۔

سلطان ابن سعود کے بارے میں مسلمانان عالم میں ایک عظیم اختلاف رونما ہے۔ ایک جماعت اسے غدار ملک۔ اسلام دشمن ضمیر فروش متعصب تنگدل اور نا معلوم کن کن خطابات سے سرفراز کرتی

ہے۔ اسکے برعکس ایک دوسری جماعت ہے جو اُسے قوم کا قائدِ اعظم اور ملّت کا محبوب ترین رہنما سمجھتی ہے۔ اور اپنی بہترین امیدوں کو اسکے دامن سے وابستہ کئے ہوئے ہے مصر کے ایک باکمال انشا پرداز مصطفیٰ لطفی منفلوطی کا خیال یہ ہے۔ کہ

"اگر تم یہ دیکھو کہ کسی شاعر کسی عالم کسی قائدِ ملّت یا زعیمِ وطن کے باب میں ایک اختلافِ عظیم رونما ہے محبّت و عقیدت کی نظروں میں وہ ایک پیکرِ ملکوتی ہے۔ اور چشمِ بدبیں میں تمثالِ شیطان تو سمجھ لو کہ وہ ایک بہت بڑی شخصیت ہے عظمت کا تاج اسکے سر پر ہے۔ اور کبریائی کا آغوش اُسی کیلئے کھلا ہوا ہے۔

دیکھو! حضرت علیؓ سے ایک جماعت نے محبّت کی اور دنیا و مافیہا سے بیخبر ہو گئی۔ دوسرے گروہ نے آپ سے بغض و نفرت کا اظہار کیا۔ اور اتنا غلو کہ کفر کے درجہ میں آگیا۔ ابو بکرؓ و عمر رضی اللہ عنہما کو اُمّت کا ایک فرقہ "شیخین" کہتا ہے۔ اور دوسرا اُنکی صداقت و اخلاص کو بھی مشتبہ سمجھتا ہے محی الدین ابن عربی کو ایک دنیا سرتاج گروہ صوفیا اور قطب الاولیا سمجھتی ہے لیکن دوسری دُنیا؛ وہ زندیقوں اور ملحدوں کا پیشوا مانتی ہے۔ ابن رشد کو ایک زمانے نے "فیلسوف اسلام" کا خطاب دیا لیکن ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے برسر عام مسجد جامع کے اندر اُنکے مُنہ پر تھوکا۔ امام غزالی کو ایک خلقت نے "حجۃ الاسلام" کہا۔ اور دوسری مخلوق نے انکی "احیاء العلوم" کو پرزے پرزے کر ڈالا۔ ابو العلا معرّی کے ایک جماعت قدم چومتی رہی۔ دوسری ٹولی نے سرِ بازار اُس پر تبرا بھیجا۔

سقراط کے جامِ زہر پی لینے پر بھی بعض زبانیں سب و شتم میں مصروف رہیں۔ اور بعض آنکھیں اُسکے حالِ زار پر خون کے آنسو بہا رہی تھیں متنبّی کو بہت سوں نے سیّد الشعراء کہا۔ اور بہت سے ایسے بھی تھے۔ جو اُسکے کلام کو آورد اور تصنّع کا نمونہ سمجھتے رہے شیکسپیئر کو ایک جماعت نے اتنا بڑھایا۔ کہ اُسے نامعلوم کیا کیا سمجھا۔ اور دوسری نے اتنا گرایا۔ کہ پناہ بخدا۔ نپولین کو بعض لوگ انبیا کی صف میں رکھتے ہیں بعض اُسے نیچے درجے کا احمق اور بدباطن سمجھتے ہیں گلیلو۔ نٹشے۔ ٹالسٹائی وغیرہ نے بھی قوم کی خوشی اور ناخوشی کے بڑے بڑے مزے اُٹھائے ہیں یاد رکھئے! یہ افتراقِ عظیم۔ آرا و افکار کا یہ تصادم۔ خیالات و جذبات کا یہ اختلاف اسی شخص کے بارے میں ہو سکتا ہے جسکی عظمت باج گزار ہو۔ ہر کہ و مہ کو یہ رتبہ بلند کہاں ملتا ہے"! (ماخوذ)

ابن سعود کی سیرت کا مطالعہ بھی اسی نظریۂ عظمت کی روشنی میں کرنا چاہئیے۔

بُعدِ مسافت۔ وسائلِ نقل و حرکت کی کمی اور مطبوعات کے عام فقدان کیوجہ سے عرب کے حالات

کوائف پر جہل و ظلمت کے اس قدر پردے چھائے ہوئے ہیں۔ کہ تحقیق و تدقیق کی راہ میں قدم قدم پر دقتیں حائل ہیں۔ میں نے سنین اور واقعات کیلئے مختلف انگریزی تصانیف سے استفادہ کیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر سینٹ جان فلبی اور امین ریحانی کی تحاریر ہیں۔ ان سے زیادہ جامعیت۔ دقت نظر اور تفصیل کے ساتھ بہت کم مصنفوں نے قلم اٹھایا ہے۔ ابن سعود۔ سلطنت سعودیہ اور نجدی معاشرت پر خامہ فرسائی کرنے کیلئے ان تحریروں کو پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ مجلہ "الہلال" کلکتہ کی مختلف اشاعتوں میں بعض گراں قدر اور قابل وثوق مضامین ابن سعود اور سلطنت سعودیہ کے بارے میں شائع ہوئے تھے۔ میں نے ان سے اہم اقتباسات اخذ کئے ہیں۔ حجاز کے امن و امان اور جدید اصلاحات کے بارے میں سید اسمعیل غزنوی صاحب کی ایک نہایت عمدہ تحریر عربی زبان میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے اسکے ایک حصہ کا اردو ترجمہ کرکے شامل کر دیا ہے۔ حتی الوسع کوشش کیگئی ہے۔ کہ مستند اور صحیح واقعات درج کئے جائیں اور ساقط الاعتبار روایات پر حصر نہ کیا جائے۔

کوشش کیگئی ہے۔ کہ عبارت آرائی کو ذرا بھی دخل نہ دیا جائے جہانتک ہو سکے۔ واقعات اور مواد کو نہایت سیدھی سادھی زبان میں پیش کیا جائے۔ حاشیہ آرائی سے حتی المقدور اجتناب کیا جائے کہ سوانح نگاری کا اصل اصول یہی ہے۔ میں نے واقعات و حوادث کو اپنے حنفی عقائد سے بھی متاثر نہیں ہونے دیا اور حالات و کوائف کے بیان کو اصول دیانت پر منحصر رکھا ہے۔ مذہبی معتقدات پر جرح و نقد کرنے سے کامل گریز کیا ہے۔ البتہ موقع اور محل کی مناسبت کے ماتحت ان خصوصی عقائد اور ماحول کا ذکر کر دیا ہے۔ جن کے پیش نظر ابن سعود کے بعض افعال و اعمال رونما ہوئے۔

کتاب کے بیشتر حصے میں صاحب سیرت کے واقعات و حوادث افعال و اعمال اور کارنامہ ہائے حیات پر گفتگو ہے۔ صرف ایک مختصر حصے میں اسکے اخلاق و عادات اور عام حالات زندگی سے بحث کیگئی ہے۔ اس کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ کہ کارنامے ترتیب اور تاریخ سے بیان ہوں۔ نجد کے ماحول اور وہابیوں کے خصائص کو ذہن نشین کرانے کیلئے تحریک وہابیت سلطنت وہابیہ کے دور اول۔ عرب میں مصری حکومت اور نجدی معاشرت و خصائل پر مستقل ابواب کی ابزاری کر دیگئی ہے۔

اس سلسلہ میں کوشش کیگئی ہے۔ کہ عنوان کا آغاز ترتیب تاریخی کے ماتحت کیا جائے۔ اور پھر اس عنوان کے ماتحت جتنے واقعات قابل ذکر ہوں قلمبند کر دئے جائیں۔ تاکہ واقعات کا تسلسل قائم

رہے کسی عنوان میں شاید یہ خیال ہو. کہ بعض باتیں غیر ضروری یا غیر متعلق ہیں لیکن آگے چلکر معلوم ہوگا کہ ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ اس کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے. کہ ابن سعود کے کارنامہ ہائے حیات کے ساتھ ہی اگر ممکن ہو سکے تو اسکی خصوصیت ممیزۂ قیادت کو روشن کرنے کیلئے اس فضا اور ماحول کا تذکرہ بھی کر دیا جائے جسمیں ابن سعود نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ تاکہ اسکے کارناموں کی صحیح قدر و قیمت ذہن نشین ہو سکے بعض مسائل مثلاً انہدام مقابر اور ملوکیت حجاز وغیرہ پر نہایت حزم و احتیاط سے عرض مطالب کیا گیا ہے۔ اور اُن سے جلد از جلد گذرنے کی کوشش کیگئی ہے. صرف نفسِ واقعہ کو ملائم سے ملائم الفاظ میں بیان کیا ہے. نزاعی مسائل میں اعتدال وصواب کی راہ یہی ہے۔

بعض بعض مقامات پر کم فرصتی کے باعث واقعات کی پوری تحقیق نہیں ہو سکی۔ یا اندازِ بیان اور واقعات میں کچھ خلط ملط سا ہو گیا ہے بعض واقعات کا اعادہ شائد غیر ضروری معلوم ہو۔ لیکن بامر مجبوری ایسا کیا گیا ہے۔ واقعہ زیر بحث کا اعادہ بعض حالات میں تفہیم مطالب کیلئے ناگزیر تھا۔

تاریخی مواد کی کمی نفس مضمون کی دقت اور میری علمی بے بضاعتی اور ادبی فرومائیگی کے سبب کتاب میں بہت سی اہم فروگذاشتیں رہ گئی ہونگی۔ ان کیلئے میں ناظرین سے تہہ دل سے معذرت خواہ ہوں۔

ان صفحات میں ابن سعود کی سیرت کا ایک عکس ضرور ہے۔ مگر بس ایک خاکہ دھندلا سا اور نامکمل، اسکی تکمیل کا پورا حق عالمِ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی سرگذشت لکھنے والا مورخ ادا کر سکے تو کر سکے ؂

عرب کے جغرافیائی اور طبعی حالات

(۱)

براعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں عرب ایک بہت بڑا ملک واقع ہے جسکے شمال کی طرف صحرائے شام مشرق کی طرف خلیج فارس جنوب کی طرف بحر ہند اور مغرب کی طرف بحیرۂ قلزم واقع ہے۔ یہ وسیع ملک جس کا رقبہ فرانس سے ۴ گنا ہے چند حصص یا صوبجات میں منقسم ہے جو بلحاظ پیداوار آب ہوا اور لوگوں کی شکل و شباہت کے ایک دوسرے سے کم و بیش مختلف ہیں۔

جغرافیائی اصطلاح میں عرب کو ایک عظیم سطح مرتفع کہہ سکتے ہیں۔ اسکے مغربی کنارے پر شمال سے لیکر جنوب تک پورے طول میں ایک سلسلہ ہائے کوہ چلا گیا ہے جو کہ بحیرہ قلزم سے مشرق کی طرف ساحل سمندر سے دس سے لیکر پندرہ میل کی مسافت پر واقع ہے۔ بعض مقامات پر یہ پہاڑ ہزاروں فٹ اونچے ہیں۔ بعض پر انکی بلندی نسبتاً بہت کم ہے جوں جوں مشرق کی طرف جائیں انکی بلندی بتدریج کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔

عرب کے شمال میں پہاڑی علاقہ ہے۔ قدیم الایام میں اسکے اندر توریت کے ادومی اور مدینی لوگ آباد تھے۔ اس کے نیچے خاص صوبہ حجاز ہے جسمیں مشہور و معروف شہر مدینہ منورہ (جسکو زمانۂ قدیم میں یثرب کے نام سے پکارتے تھے) مکہ معظمہ جسمیں آنحضرت رسول مقبول صلعم کی جائے ولادت ہے۔ اور جدّہ جہاں مسلمان حجاج جہاز سے اترتے ہیں واقع ہیں حجاز کا صوبہ بحیرہ قلزم اور ان پہاڑوں کے سلسلہ کے مابین پھیلا ہوا ہے جو خاکنائے سویز سے شروع ہوکر بحر ہند تک پہنچا ہے۔

جزیرہ نما عرب کے جنوب مغربی گوشہ کو صوبہ یمن کہتے ہیں۔ صوبہ حجاز اور یمن کے نشیبی قطعات اراضی کو تہامہ کہتے ہیں۔ اور بعض اوقات حجاز کے جنوبی حصہ کو بھی اسی نام سے پکارتے ہیں۔ حضرالموت کا صوبہ یمن کے مشرق میں واقع ہے جو بحر ہند کے کنارے مشرق کی طرف بڑھتا گیا ہے۔ پھر اور آگے اسی نام کی خلیج پر صوبہ عمان واقع ہے۔ ملک کا وہ مرتفع علاقہ جو صوبہ حجاز کی پہاڑیوں سے شروع ہوکر بجانب شرق الحصاء اور البحرین کی طرف جو خلیج فارس پر واقع ہیں پھیلا ہوا ہے۔ نجد کہلاتا ہے۔ یہ بڑا وسیع علاقہ ہے صحراؤں اور چٹانوں سے ڈھنپا ہوا ہے جنمیں بعض بعض جگہ مرغزار جنکو نخلستان کہتے ہیں۔ واقع ہیں۔ یہ نخلستان صحرا میں رحمت حق کا حکم رکھتے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس وسیع ملک میں قابل جہاز رانی کوئی دریا نہیں۔ جہاں تہاں چھوٹے چھوٹے پہاڑی ندی نالے ہیں جو فصلوں کو سرسبز کرتے ہیں۔ بارش بہت ہی کم ہوتی ہے۔ اور ملک ما سوا اُن قطعات کے جہاں پانی بافراط موجود ہے۔ عام طور پر خشک اور بنجر ہے۔ لیکن جہاں کہیں پانی ہے۔ وہاں سرسبزی کی بھی کوئی حد نہیں۔ یمن کا بالائی علاقہ جسکو جبل الیمن کہتے ہیں۔ مونٹ بلانک کی بلندی کے برابر ہے۔ اور کئی وسیع اور سرسبز وادیوں سے معمور ہے۔ جہاں قہوہ، خرما، ترکاریاں اور انواع و اقسام کے پھلدار درخت پھلتے پھولتے ہیں۔ آب و ہوا معتدل ہے۔ سردیوں میں اکثر دھند پڑتی ہے۔ برسات کے موسم بھی دو ہیں۔ ایک بہار میں دوسرا خزاں میں۔

صوبہ حجاز کی سرزمین ناہموار ہے۔ خاص کر مکہ معظمہ کے گردونواح میں جو بحیرۂ قلزم سے پچاس میل اور جبل قراع کی ریتلی چٹانوں سے تیس میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ سورج کی تمازت سے جھلسی ہوئی چٹانیں ننگی وادیاں جنمیں کہیں کہیں جھاڑیاں اُگی ہیں جو مویشیوں کے کھانے کے کام آتی ہیں۔ اور خشک و سنسان ریتلی زمینیں اس علاقہ کا منظر پیش کرتی ہیں مگر اس ویران اور خشک علاقے کے مشرق کی طرف ایک قطعہ اراضی ہے جو نہایت ہی خوشنما سبزی اور سایہ دار درختوں سے بھرپور ہے۔ اسمیں سیب، انجیر، انار، شفتالو اور انگور بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ اس قطعہ کو طائف کہتے ہیں

طبعی خط و خال کے اعتبار سے عرب کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ شمالی پہاڑی علاقہ حجاز اور نجد کی وسیع سرزمین ایک حصہ ہے۔ یمن کا سرسبز علاقہ عسیر اور عمان کے ساحلی علاقے دوسرے حصے میں ہیں۔ تیسرا حصہ ربع الخالی ہے۔ یہ وسیع صحرا عرب کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ سینکڑوں میل تک جھلسی ہوئی ریت اور بے آب و گیاہ سرزمین کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ سبزی اور پانی کا نام و نشان نہیں۔ جاندار مخلوق عنقا ہے۔

عرب کی آب و ہوا عام طور پر گرم خشک ہے۔ نجد میں ٹمپریچر سائے میں کبھی ۱۰۴ سے کم نہیں ہوتا۔ مکہ معظمہ میں ٹمپریچر کبھی کبھی ۱۳۰ تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی نجد کے شمالی حصے میں جہاں سلطنت عراق کی حدود شروع ہوتی ہیں۔ دھند پڑتی ہے۔ اور کافی سے زیادہ خنکی ہو جاتی ہے۔ نجد کی بعض پہاڑیوں پر برف بھی پڑتی ہے۔ ایک سیاح کا بیان ہے کہ اس علاقہ میں رات کو سفر کرتے ہوئے اسے ایک عمدہ پوستین بھی سردی سے محفوظ نہ رکھ سکی۔ یقیناً ایک ملک میں آب و ہوا کا یہ تفاوت تعجب انگیز ہے۔

عرب کی آب و ہوا گو خشک ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مضر صحت نہیں بلکہ بہت مفید ہے۔ جہاں گرمی شدت سے ہوتی ہے حبس نام کو بھی نہیں ہوتا۔ جن علاقوں میں سردی پڑتی ہے شدت سے پڑتی ہے۔ لیکن خشک رطوبت کیوجہ سے آب و ہوا خراب کہیں بھی نہیں ہوتی۔ صحرائے عرب کی صبح کی ہوا جسکو نسیم کہتے ہیں فرحت بخش اور

مسرت خیز ہوتی ہے۔ اسکے نرم نرم جھونکے دل و دماغ کی تھکن کو دور کرتے اور جسم کو چاق و چوبند کر دیتے ہیں۔ یہ ہوا اس قدر جان بخش اور روح افزا ہے۔ کہ مشرق کے شعرا اسکی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان رہے ہیں۔

عرب کے سارے ملک میں آبادی کی کیفیت یکساں نہیں۔ ملک کہیں بھی گنجان آباد نہیں لیکن جہاں جہاں چراگاہیں اور پانی بافراط موجود ہوتا ہے یا زراعت کیلئے سہولتیں میسر ہوتی ہیں۔ وہاں آبادی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے چنانچہ یمن اور عسیر کی آبادی پینتیس لاکھ سے کچھ زیادہ ہے۔ حجاز کی آبادی تقریباً دس لاکھ ہے۔ عمان اور حضرالموت میں بھی تقریباً اسی قدر ہے۔ نجد کی آبادی تقریباً تیس لاکھ ہے۔ ناظرین کو واضح رہے کہ عرب میں آجتک باقاعدہ مردم شماری کبھی نہیں ہوئی مختلف حکومتوں اور سیاحوں کی قیاس آرائیاں ہیں لیکن بظاہر مصرحہ بالا اندازہ سب سے زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

کیونکہ سلطان ابن سعود کے سوانح حیات بیان کرنیکے سلسلہ میں نجد کے مختلف علاقوں کا ذکر خصوصیت سے بار بار آئیگا۔ اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ نجد کے بعض حالات کی تصریح کر دی جائے۔

حدود نجد: مشرق میں خلیج فارس قطار سے لیکر راس المشعب تک، راس المشعب سے لیکر راس القلیعۃ تک نجد اور کویت کے درمیان سرزمین بے آئین ہے مغرب میں مملکت حجاز واقع ہے جنوب میں سرحد بحیرۂ قلزم کے قنفذہ کے مقام سے شروع ہو کر عسیر کے شہر ابہا کے نیچے سے ہوتی ہوئی وادی دواسر کے جسمیں نجران واقع ہے جنوب میں سے ہوتی ہوئی ربع الخالی کے شمالی کنارے کے پاس سے گذرتی قطار کے علاقہ تک چلی جاتی ہے۔

شمال میں نجد کی حدود عراق و نجد کے درمیانی بے آئین علاقہ تک ہیں۔ یہ علاقہ ۲۹ و ۳۰ عرض بلد اور ۴۵ و ۴۶ طول بلد پر واقع ہے۔ پھر یہ حد شمال کو ہوتی ہوئی شمال مغرب کی طرف جہاں ۳۹ درجہ طول بلد اور ۳۲ عرض بلد واقع ہے چلی جاتی ہے۔ یہاں شمال میں جبل نیرہ ہے جنوب مغرب میں وادی رجل ہے پھر جنوب مشرق میں یہ حد اس مقام تک پہنچتی ہے جہاں ۳۸ طول بلد اور ۳۰ عرض بلد کا اتصال ہوتا ہے۔ اس طرح پر وادی سرحان نجد کی حدود میں شامل ہے لیکن عقبہ تک کا وہ علاقہ جہاں سے حجاز ریلوے گذرتی ہے ابھی تک زیر غور ہے۔ حکومت انگلشیہ اور مملکت سعودیہ میں طویل گفت و شنید کے باوجود عقبہ اور معان کے متعلق تصفیہ نہیں ہو سکا۔ اور تنازعہ اب تک باقی ہے۔

واضح رہے کہ نجد کی شمالی شمال مشرقی اور شمال مغربی حدود کا تصفیہ مملکت سعودیہ عراق شرق یردن اور انگریزی حکومتوں کے مابین معاہدات کی رو سے ہوا ہے ایک معاہدہ عقیر کے مقام پر ۲ دسمبر ۱۹۲۲ء کو ہوا تھا۔ دوسرا ۲ نومبر ۱۹۲۵ء کو حدہ الحجاز کے مقام پر ہوا۔

نجد کا رقبہ تقریباً ۹۰۰۰۰۰۰۰۰ مربع میل ہے۔

جیسا کہ قبل ازیں بیان ہو چکا ہے۔ نجد کی آبادی تقریباً تیس ۳۰ لاکھ ہے لیکن پوری سعودی مملکت کی آبادی اس وقت پنتالیس ۴۵ لاکھ سے کم نہیں۔

نجد کے بڑے بڑے پہاڑ جبل طوائق جبل عجا جبل سلمہ اور جبل شمار ہیں۔

نجد کا سب سے بڑا صحرا دہنا ہے یہ صحرا ربع الخالی کے بعد عرب کا سب سے بڑا صحرا ہے۔

نجد کی بڑی بڑی وادیاں وادی الرما۔ وادی سرحان اور وادی دواسیر ہیں۔

نجد کے بڑے بڑے نخلستان الحصا۔ القطیف۔ الاریہ اور التیما ہیں۔

نجد کے بڑے صوبے القاسم۔ الاریا اور جبل شمار ہیں۔

نجد کے بڑے بڑے قبائل المطیر حرب عتیبہ عجمانی دواسیر۔ العجمان۔ العواضم۔ السہوط۔ بنی مرہ۔ قحطان ہیں۔

نجد کے بڑے بڑے شہر الریاض دارالسلطنت بریدہ۔ انیزہ۔ حائل طرمدہ۔ شقرہ۔ مجمع جفوف۔ القطیف جریلہ ہیں۔ علاوہ ازیں مملکت سعودیہ میں مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ۔ جدہ طائف ینبوع۔ جوف۔ ابّہا وغیرہ بڑے شہر ہیں۔

اسوقت سلطنت سعودیہ پورے نجد قدیم ریاست حائل۔ حجاز عسیر اور الحصا کے صوبجات کے مجموعہ کا نام ہے۔

نجدی عام طور پر وہابی ہیں۔ حائل اور الحصا میں اہل تشیع بھی ہیں۔ الحصا میں شیعہ آبادی تیس ۳۰ ہزار ہے۔ الحصا اور حجاز میں عام آبادی سُنّی المذہب ہے مملکت سعودیہ میں مختلف سکوں کا رواج ہے ہندوستانی روپیہ عام ہے میریا تھریسیا کے ڈالر بھی چلتے ہیں عمّان کے پچھلی صدی کے ایک سلطان کے جاری کئے ہوئے تانبے کا سکّہ بھی جاری ہے۔ نجد کی بازاروں میں زیادہ تر اسی کا چلن ہے۔ ایک ڈالر کے معاوضے میں ایسے ساٹھ ۶۰ سکّے دستیاب ہو جاتے ہیں۔

عرب میں معیار زندگی و معیشت اسقدر پست ہے۔ کہ تانبے کے ایک سکّہ میں ایکدن کی گذران ہو سکتی ہے، بدوی آبادی چاندی کے سکّوں کو بہت پسند کرتی ہے۔ انکے شیوخ اور امراء کو وظائف چاندی کے سکّوں کی صورتیں ہی دئیے جاتے ہیں سونے کے سکّے کا عام رواج نہیں ہے اور نہ ہی اقتصادی پستی کیوجہ سے ابھی ہو سکتا ہے۔

ملک کے محاصل قدیم الایّام کی طرح سے دو طرح کے ہیں ایک لازمی دوسرے غیر یقینی چنگی اور درآمد و برآمد کے محصول لازمی ہیں۔ زکوٰۃ کی آمدنی غیر یقینی ہے۔ زکوٰۃ ابھی تک جنس کی صورت میں وصول کی جاتی ہے۔

یمن اور طائف کے علاوہ عرب کا سارا ملک پانی کا بیحد محتاج ہے۔ نجد کے باشندوں کی فلاح و بہبود کیلئے بارش کی بیحد ضرورت رہتی ہے۔ اگر بارش معقول مقدار میں ہو جائے تو بعض علاقے سرسبز ہو جاتے ہیں۔ مویشیوں کے غلّے بڑھ جاتے ہیں۔ لوگ مطمئن اور خوش رہتے ہیں لیکن خشک سالی کی صورتیں مویشی تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ رعایا غربت فاقہ

کے مصائب برداشت کرتی ہے۔ دُنیا کا کوئی ملک قدرت کی کرمفرمائیوں کا اتنا محتاج نہ ہوگا جتنا نجد ہے۔ بارانِ رحمت کے بغیر ایک سال کا بھی گذارا نہیں یہی وجہ ہے کہ قحط اکثر پڑتا رہتا ہے۔ اور وسیع آبادیاں تباہ ہوجاتی ہیں۔

طبعی کوائف کیوجہ سے سعودی سلطنت کی مخدوش حالت

(۳)

موجودہ مملکت سعودیہ کے جنوب مغربی گوشہ میں یمن کی آزاد ریاست واقع ہے ملک کی زرخیزی اور قدیم تمدن نے وہاں کے باشندوں میں اتنی صلاحیت پیدا کردی ہے، کہ امام یمن کی دانشمندانہ رہنمائی میں یہ لوگ سرعت سے شاہراہ ترقی پر گامزن ہیں۔ امام کے سیاسی تعلقات سلطان ابن سعود سے اتنے خوشگوار نہیں جتنے کہ عرب مصالح ومنافع کی بناپر ہونے چاہئیں تھے فریقین کی جدوجہد اور طویل سیاسی گفت وشنید کے باوجود ابھی تک کشیدگی دور نہیں ہوسکی۔ بدرجہ اقل وہ یگانگت وہم آہنگی پیدا نہیں ہوئی جس کی فی زمانہ ضرورت ہے۔

یمن کے ایک گوشہ میں انگریزوں کی بندرگاہ عدن واقع ہے یہاں نہ صرف انگریزوں کی معقول بحری طاقت موجود ہے بلکہ ایک عظیم ہوائی مستقر تیار ہورہا ہے۔ گذشتہ یمنی انگریزی تنازعہ نے یہ امر روز روشن کی طرح واضح کردیا ہے کہ ضرورت کیوقت میں عدن سے انگریزوں کی نقل وحرکت اور ہوائی جہازوں کی تاخت وتاراج کہاں تک پہنچ سکتی ہے یمن کے مشرق میں حضرالموت کے علاقے میں سلطان لحج وغیرہ کے اثرورسوخ کیوجہ سے انگریزی اثر قائم ہے عمان کا سلطان والئے مسقط انگریزوں کے زیرحمایت ہے مشرق میں کویت بحرین اور قطار وغیرہ کے شیوخ وامراء انگریزوں کی معاونت کے بیحد محتاج ہیں اور اُنکے زیراثر ہیں۔ عام طور پر معلوم ہے کہ یہ لوگ ہندوستانی والیان ریاست کی طرح ماتحتی کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ اور انگریزی احکام سے سرمو تجاوز کرنے کی جرأت وقدرت نہیں رکھتے۔

خلیج فارس انگریزوں کے ماتحت ہے۔ اُنکا ایک طاقتور بیڑہ وہاں متعین ہے متعدد بندرگاہیں اُنکے اقتدار میں ہیں ممکن نہیں کہ اُنکے منشا وایما کے بغیر خلیج فارس یا عرب کے مشرقی ساحلی علاقہ جات میں کوئی کاروائی ہوسکے۔

نجد کے شمال میں ایکطرف عراق کی ریاست ہے۔ اور دوسری طرف شرق یردن دونوں ریاستیں انگریزوں کی Man datos میں فرق صرف اتنا ہی کہ عراق میں ملکی باشندوں کو زیادہ حقوق حاصل ہے۔ اور نام نہاد طور پر حکومت کا ڈھانچہ اُنکا اپنا ہے شرق یردن کا نظم ونسق کلیتاً انگریزی ہائی کمشنر کے ہاتھ میں ہے۔ امیر عبداللہ والئے شرق یردن کے جذبات سلطان ابن سعود کے

خلاف ہمیشہ برانگیختہ رہتے ہیں شریف خاندان کی تلخ روایات اور دیرینہ عداوت مخاصمت کا اثر تو عراق میں بھی نمایاں ہے موصل کے مقام پر انگریزوں کا ایک بہت بڑا ہوائی مستقر ہے جسکے عسکری اثرات کا اندازہ جس قدر زیادہ کیا جائے اسی قدر کم ہے پٹرول کی برآمد عراق کی طبعی زرخیزی اور صلاحیت اور وہاں کے باشندوں کی کمزوری اور پست ذہنیت نے انگریزوں کے مقاصد اور عربی ممالک میں انکے ارادوں کو مستحکم کر دیا ہے۔ ایک زمانہ میں مصر پر قبضہ جمانے کی وجہ یہ بیان کیجاتی تھی کہ ہندوستان کا نزدیک ترین راستہ کسی صورت میں بھی ترک نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہر سویز پر قبضہ جمانا اس غرض کیلئے ضروری ہے۔ اب تو انگریزوں کا عمل دخل جزیرہ نما سینائی پر بھی ہو گیا ہے فلسطین اور عراق میں سے راستہ بھی ہندوستان کے قبضے کیلئے ویسا ہی ضروری ہے جیسا کہ نہر سویز کا۔ اس راستے میں ہوائی جہازوں کے سٹیشن اور موٹروں لاریوں کے گذر کیلئے سڑکیں بن رہی ہیں سلطنت انگلشیہ کیلئے ہندوستان کی مصئونیت اس قدر ضروری ہے۔ کہ وہ عرب کے ان علاقوں سے اپنا تسلط اٹھا نیکے لئے بظاہر آسانی سے تیار نہیں ہو سکتے نتیجہ یہ ہے کہ ممالک عربیہ میں انگریزوں کا اثر کوئی عارضی چیز نہیں ہے خوب سوچی سمجھی ہوئی پالیسی کا مستقل نتیجہ ہے۔ اور بڑے دور رس نتائج کا حامل ہے۔

اختتام جنگ پر انگریزوں نے عقبہ و معان پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ تسلط ابتک بدستور قائم ہے۔ یہ مقامات حجاز کی عسکری محافظت کیلئے بڑے اہم ہیں گویا حجاز کی کنجی ہیں سلطان ابن سعود نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن انگریز رضامند نہیں ہوئے سلطان میں اتنی طاقت نہیں کہ انگریزوں کو زبردستی دھکیل دے۔

انگریزوں کی بحری طاقت بحیرۂ قلزم میں بھی موجود ہے۔ ناظرین کو معلوم ہے کہ بحیرۂ قلزم کی دوسری جانب سوڈان اور مصر کے ساحل ہیں سوڈان پر انگریزوں کا پورا تسلط ہے مصر میں بھی ان کا سیاسی اثر قائم ہے سلطان کے پاس بحری بیڑہ موجود نہیں۔ اور نہ ہی مستقبل قریب میں کوئی امید ہے کہ اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ انگریزی اثر کی مقاومت ہو سکے۔

ناظرین نے مذکورہ بالا تصریح سے دیکھ لیا ہوگا۔ کہ سلطنت سعودیہ چاروں طرف سے انگریزی اثر و طاقت سے گھری ہوئی ہے جسکا لازمی نتیجہ یہ ہے۔ کہ سلطان ابن سعود کیلئے انگریزوں سے خوشگوار تعلقات قائم رکھنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ اسے وہ آزادئ عمل حاصل نہیں۔ جو بُعدِ مسافت یا فقدانِ اثر کیوجہ سے میسر ہوتی۔

طبعی حالات کی مجبوری سے نجد و حجاز کی آزادی اصل میں اتنی حقیقی نہیں جتنی بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ یا جتنی بین الاقوامی قانون کی نگاہ میں ہے؛

سلطان عبد العزیز ابن سعود

عبد العزیز ابن عبد الرحمٰن آل فیصل آل سعود ۱۹۰۲ء عیسوی میں نجد کا امیر اور وہابیوں کا امام مقرر ہوا۔ اسکے ایک سال بعد اس نے اپنے آبائی دار السلطنت ریاض کو خاندان آل رشید سے فتح کیا ۱۹۲۱ء کے موسم گرما میں جب حکومتِ انگریزی شریف فیصل کو عراق عرب کا بادشاہ بنا رہی تھی، علمائے و امرائے نجد نے مجلس مشاورت ملی میں باتفاق رائے امام عبد العزیز ابن عبد الرحمٰن آل سعود کو سلطان نجد و ملحقات کا خطاب دیا۔ اس واقعہ کے تقریباً پانچ برس بعد جب وہ حجاز اور حرمین الشریفین فتح کر چکا۔ تو انتخاب عامہ نے اس کو ۸ جنوری ۱۹۲۶ء کو بادشاہ حجاز قرار دیا۔ اور اگلے سال ۱۹ جنوری ۱۹۲۷ء کو اس کے والد عبد الرحمٰن کی اجازت سے اس کو ریاض میں بھی نجد و ملحقات کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ پہلے مواقع پر بھی اس کے سن رسیدہ والد کی اجازت باضابطہ حاصل کر لی گئی تھی۔

شجرۂ نسب خاندان آل سعود
آل سعود۔ بکر بن وائل ابن جدیلہ ابن اسد ابن ربیعہ ابن نضر ابن معد ابن عدنان کی اولاد میں سے ہیں۔ بکر اور مکرن ابن مکران پہلے سعود کے دادا میں بارہ پشتیں ہوتی ہیں۔
سعود ابن محمد ابن مکرن ابن مکران
طوہنیان
محمد امیر اوّل 1747 - 1765 جس نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کی لڑکی سے شادی کی
مشعری
سعود
ابراہیم
طوہنیان
عبداللہ امیر نہم 1841-1843
عبدالعزیز (امیر دوم 1765-1803)
سعود اعظم (امیر سوم 1803-1814)
عبداللہ
ترکی امیر ششم 1824-1834 قتل کیا گیا
حسن
عبدالرحمن
مشعری
محمد
مکران
مشعری امیر پنجم 1820
خالد امیر ہشتم 1837-1841 تخت سے اتارا گیا
فیصل
عبداللہ امیر چہارم 1814 میں قسطنطنیہ میں قتل کیا گیا
فیصل امیر ہفتم 1834-1837 تخت سے اتارا گیا بحالی بطور امیر دہم 1843 تا 1867
جلیولی
محمد امیر دوازدہم 1869-1877
سعود
عبداللہ امیر یازدہم 1867-1869 " سیزدہم 1877-1885
عبدالرحمن
عبدالمحسن
سعد
عبداللہ والئی الحصاء
محمد
عبدالعزیز سلطان (ابن سعود)
عبداللہ
سعد
ترکی 1919 میں مر گیا
سعود
فیصل
محمد
خالد
منصور
سعد

حضرة صاحب الجلالة ملك المملكة العربية السعودية الملك عبدالعزيز بن عبدالرحمن الفيصل
آل السعود المعظم حفظه الله تعالى وابقاه

باب اوّل

سُلطان کی ولادت اور طفولیت

نومبر ۱۸۸۰ء کی ایک صبح کو جبکہ مؤذّن مسجدوں میں اذانیں دے رہے تھے۔ امام عبدالرحمٰن کے ہاں سارہ خاتون کے بطن سے عبدالعزیز پیدا ہُوا۔ یہ عبدالعزیز بعد میں اپنے جدِ اعظم کے نام پر ابن سعود مشہور ہُوا۔ عبدالرحمٰن میانہ قد اور فربہ اندام آدمی تھے۔ سارہ خاتون جنوبی نجد کے قبیلہ دواسیر کے شیخ احمد سدیری کی دختر تھیں۔ ان کے قبیلے کے قد و قامت بڑے تھے چنانچہ یہ بھی بہت جسیم تھیں۔ عرب میں دستور ہے۔ کہ معزز گھرانوں کی مستورات سخت پردے میں رہتی ہیں۔ اور رات کے پردے میں بھی محرم کی موجودگی یا معتبر غلام کی معیّت کے بغیر کہیں آجا نہیں سکتیں۔ چنانچہ سارہ خاتون بھی زندگی بھر پردہ میں رہیں۔ انہیں عام رواج کے مطابق لکھنا پڑھنا نہیں سکھایا گیا تھا۔ اور نہ ہی اُنہیں بیرونی دُنیا کے حوادث کو اُن کی واقفیت ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ نہائت نیک بخت۔ عبادت گُذار اور معاملہ فہم تھیں۔ یہی وجہ تھی۔ کہ اپنے گھرانے میں ان کا اثر و رسُوخ بہت بڑھا ہُوا تھا۔

عبدالعزیز کی ابتدائی پرورش اور تربیت ریاض کے آبائی مُحل کے ایک گوشہ میں ہُوئی۔ اسکی والدہ دُودھ پلاتیں تھیں۔ محل میں بہت سی عمارتیں تھیں اور ضرورت کے مطابق ان میں ایزادی ہوتی رہتی تھی۔ ایک حصّہ میں زنانخانہ تھا۔ دُودھ چُھڑانے تک عبدالعزیز یہیں اپنی والدہ کے پاس رہا۔ بعد میں ایک حبشی غلام کے سُپرد ہُوا۔ اب تربیت اور حفاظت اس غلام کے ذُمّہ ہوئی۔ کبھی کبھی اپنی والدہ کے پاس بھی جاتا تھا۔ والدہ اور حرم کی دیگر مستورات بہت پیار کرتی تھیں۔ لیکن عبدالعزیز کو شرُوع ہی سے اپنی ہمشیرہ نُورہ سے بہت محبّت تھی چند غلام بچے بھی اسکے ساتھ پرورش پاتے تھے سب اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ بعد میں یہ عبدالعزیز کے معتمد باڈی گارڈ قرار پائے

جونہی کہ عبدالعزیز چلنے پھرنے کے قابل ہُوا۔ عبدالرحمٰن نے اس کی تربیت اپنے ذمہ لیلی۔ امام عبدالرحمٰن شریعت کے سخت پابند تھے۔ اور علمائے دین کے زیر اثر رہتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنی اولاد کی پرورش بڑی محنت اور کاوش سے کی اور شروع ہی سے انہیں پکے وہابی بنا دیا۔ عبدالعزیز کو تعلیم کی غرض سے ریاض کے مذہبی مکتب میں بھیجا گیا۔ لیکن شروع میں سلطان عبدالعزیز کو کھیل کود کا بہت شوق تھا۔ تعلیم سے زیادہ شغف نہ تھا لیکن سات برس کی عمر ہی سے وہ صوم وصلوٰۃ کا سخت پابند ہو گیا تھا۔ اور پنج وقتہ نماز اپنے والد کے ساتھ جامع مسجد میں ادا کیا کرتا تھا۔ قرآن مجید کی بعض سورتیں بھی یاد کر لیں تھیں۔

عبدالرحمٰن عزم راسخ کر چکے تھے۔ کہ یا تو وہ خود یا اُن کی اولاد مسعود اعظم کی پوری سلطنت پر قبضہ کر لیگی۔ اور تمام عرب کو متحد اور وہابی کر کے از سر نو ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھیگی۔ انہوں نے اپنا ارادہ اپنی اولاد کے اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا تھا۔ وہ جانتے تھے۔ کہ اس غرض کے حصول کیلئے جنگ وجدل کرنا اور مشقت اٹھانی پڑیگی۔ اس لئے انہوں نے ابتدا ہی سے اولاد کو مشقت اور جانکاہی کی تعلیم دی۔ چنانچہ عبدالعزیز ابن سعود کو شمشیر زنی اور بندوق اور رائفل کے نشانہ کی تعلیم دی گئی۔ اور بغیر زین اور باگ کے گھوڑے کی سواری سکھلا دی گئی۔ اُسے لمبے سفر پر بھیجا جاتا۔ کہ سفر و ماندگی کا عادی ہو جائے۔ موسم سرما کی سرد راتوں کو بھی اسے دو گھڑی رہے جگا دیا جاتا تاکہ صبح سویرے بیدار ہونے کی عادت راسخ ہو جائے۔ گرما کی تپتی ہوئی ریت اور جلتی ہوئی چٹانوں پر عبدالعزیز کو ننگے پاؤں چلنا پڑتا۔ اُسے کشتی۔ دوڑ۔ نیزہ زنی وغیرہ مردانہ ورزشوں میں مسابقت کرنے کا شوق دلایا گیا زندگی نہایت سادہ تھی۔ یہانتک کہ اکل وشرب کی بہت معمولی مقدار مقرر تھی۔

عبدالعزیز جب جوان ہُوا۔ تو بہت طویل القامت اور سڈول تھا۔ مشقت اور زور آزمائی کا بیحد عادی تھا۔ جاندار اتنا تھا۔ کہ نچلا بیٹھنا مشکل تھا۔ جب غصہ میں آتا۔ تو جنون کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ لیکن خوبی یہ تھی۔ کہ غصہ بہت جلد فرو ہو جاتا تھا۔

ابھی تک عبدالعزیز ریاض سے باہر کی زندگی سے باخبر نہ تھا۔ وہاں کے باشندے سادہ اطوار اور خشک طبیعت رکھتے تھے۔ اجنبیوں سے نفرت کرتے تھے۔ ریاض کے گرد اگرد

وسیع صحرا تھا کبھی کبھی تاجروں کے قافلے اس طرف سے گذرتے تھے۔ اور یمن سے چائے۔ افریقہ سے مصالح اور حبشی غلام اور خلیج فارس کی بندرگاہوں سے پارچات اور تانبے کے برتن لاتے تھے۔ اور بیرونی ممالک کی خبریں زبانی بیان کیا کرتے تھے۔

اُس زمانے میں ریاض کے گرد و نواح میں لوٹ مار اور غارتگری کا بہت زور تھا۔ قبیلہ شمّر کے لوگ متحد ہو کر محمدؐ ابن رشید کی جو کہ لائق اور بہادر شخص تھا۔ قیادت میں زور پکڑ رہے تھے۔ اور ریاض اور گرد و نواح کے دیہات کو فتح کرنے کے درپے تھے۔ ریاض کے اردگرد مضبوط فصیل بنی ہوئی تھی۔ رات کو باقاعدہ چوکی پہرہ ہوتا تھا۔ کوئی شخص بغیر اجازت شہر کے اندر نہ آسکتا تھا۔ نماز کے اوقات میں بھی شہر کے دروازے بند کر دئیے جاتے تھے۔ محل شاہی بھی محفوظ قلعے میں واقعہ تھا۔ ریاض میں دو گروہ تھے۔ امام عبدالرحمٰن کے تین بھائی اور تھے۔ پچھلے دس برس سے اس کے بھائی عبداللہ اور سعود حکومت کے لالچ میں ایک دوسرے سے برسرِپیکار تھے۔ عبداللہ نے سعود کو شہر بدر کر دیا تھا۔ اور وُہ اب الحصا کے قبیلہ عجمان کے ہاں اقامت پذیر تھا۔ عجمان کو ساتھ لیکر اُس نے ریاض پر حملہ کیا۔ اور عبداللہ کو باہر نکال پھینکا۔ ناگہاں سعود کی موت واقعہ ہوئی۔ اور عبداللہ واپس آگیا۔ لیکن سعود کی اولاد اُس سے پھر چھیڑ چھاڑ کرتی رہی۔ فریقین کی حمائت میں ریاض کے باشندے آپس میں بٹے ہوئے تھے۔ گلی کوچوں میں لڑ پڑتے تھے۔ محل شاہی میں بھی بلوہ ہو چکا تھا۔

عبدالرحمٰن اور اُن کے بھائی محمدؐ فریقین میں مصالحت پیدا کرنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ اُنہیں خوف تھا کہ خانہ جنگی سے فائدہ اُٹھا کر کہیں ابن رشید ریاض پر قابض نہ ہو جائے۔ فریقین اُن کی مساعی سے ناراض ہو گئے۔ اور اُنہیں اپنی اور اپنے خاندان کی حفاظت کرنی پڑی۔

آخرکار سعود کے لڑکوں نے عجمان کے آدمیوں کی ایک جمعیت بنالی اور ریاض کو فتح کر لیا۔ اور عبداللہ کو قید کر دیا۔ اس قسم کے حالات کو محمدؐ ابن رشید نے غنیمت جانا۔ اور ریاض پر دھاوا کر کے فتح کر لیا۔ سعود کے لڑکوں کو شہر سے باہر بھگا دیا۔ عبداللہ کو حائل میں لے جا کر قید میں رکھا۔ اور اپنی قوم کے ایک آدمی سلیم نامی کو شہر کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس

جنگ میں محمد بن فیصل ابن رشید کے ہجد عبید کے ہاتھوں مارا گیا۔ لیکن ابن رشید نے اس خیال سے کہ عبدالرحمن امن پسندی اور عافیت کوشی میں مشہور ہیں۔ اور وہابیوں میں خاص اثر رکھتے ہیں۔ انہیں اپنے خاندان کے ساتھ شاہی محل ہی میں رہنے دیا۔ حائل میں عبداللہ بیمار ہو گیا۔ ایک ایرانی ڈاکٹر حائل کی راہ سے حج کو جا رہا تھا۔ اس نے محمد بن رشید کو عبداللہ کی خطرناک حالت سے مطلع کیا۔ اور کہا کہ عبداللہ قریب المرگ ہے۔ ابن رشید نہیں چاہتا تھا۔ کہ اس پر زہر خورانی کا الزام لگایا جائے۔ اس لئے اس نے عبدالرحمن کو مریض کی نگہداشت کے لئے ریاض سے طلب کیا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ حائل پہنچیں عبداللہ راہئے ملک عدم ہو گیا۔

عبداللہ بن فیصل کی وفات پر عبدالرحمن بزرگ خاندان ہوئے۔ عبداللہ ناکارہ اور کمزور طبیعت تھا اور اکثر بیمار رہتا تھا۔ لیکن عبدالرحمن مستقل مزاج تھے۔ اور مضبوط دل و دماغ رکھتے تھے۔ ریاض کو دشمنوں کے پنجے میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ خود مختار حکومت کے دلدادہ تھے۔ اور آل رشید کی ماتحتی ناگوار تھی۔

چنانچہ انہوں نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں دیر نہ کی۔ انہوں نے اپنے بھتیجوں سعود کے لڑکوں سے مصالحت کی راہ پیدا کرنی چاہی۔ لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ وہ انہیں غاصب سمجھتے تھے۔ اور اپنے تئیں جائز حقدار جانتے تھے۔ لیکن پھر بھی عبدالرحمن نے شہر کے لوگوں کو آل رشید کے خلاف بغاوت کی ترغیب دی۔ اور ساتھ ہی بیرون شہر سے حملہ کا انتظام کیا۔ نجد ہی رؤسا کی خفیہ مجالس مشاورت ہوئیں دیہات اور قبائل میں نقیب بھیجے گئے۔ لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ نجد کے باشندے آل رشید سے خائف ہو چکے تھے۔ شہر میں حکومت کا لشکر موجود تھا۔ پہلی بغاوت میں ناکامی ہو چکی تھی۔ سلیم شماری حاکم ریاض نے بہتوں کو تہہ تیغ کر دیا تھا۔ لیکن عبدالرحمن نے حوصلہ قائم رکھا۔ وہ جاسوسوں اور خائنوں میں گھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ پیشتر اس کے کہ وہ عملی اقدام کر سکیں۔ حکومت کو ان کے ارادے کا علم ہو گیا۔ اور حاکم شہر کو حکم صادر ہوا کہ وہ عبدالرحمن اور انکے حامیوں کا خاتمہ کر دے۔ سلیم نے چاہا کہ وہ ایک ہی دفعہ میں آل سعود کا قلع قمع کر دے وہ سمجھتا تھا۔

کہ یہ خاندان مغرور اور جھگڑالو ہے۔ جبتک ان کا ایک فرد بھی موجود ہے۔ مستقل امن و اماں ممکن نہیں چنانچہ اس نے یہ تجویز کی کہ عید کے روز وہ عبدالرحمٰن کی ملاقات کیلئے جائے۔ اور ساتھ فوج کے چیدہ جوان لے جائے۔ اور جونہی کہ رسم کے مطابق خاندان کے مرد ملاقات کی غرض سے جمع ہوں سب کو تہہ تیغ کر دیا جائے۔

لیکن کسی طرح سے امام عبدالرحمٰن کو اس تجویز کا علم ہو چکا تھا۔ انہوں نے بھی عزم راسخ کر لیا۔ کہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے گردنیں نہیں کٹوائیں گے۔ اور حفاظت خود اختیاری میں جانیں لڑا دینگے چنانچہ جتنی جمعیت پاس موجود تھی۔ اُن کو اسلحہ بند کر دیا گیا۔ مقررہ وقت پر سلیم اپنے ہمرائیوں سمیت عبدالرحمٰن کے پاس پہنچا۔ فریقین کی رسمی ملاقات بڑے اخلاق و آداب سے ہوئی۔ اس خیال سے کہ شک نہ پیدا ہو۔ عبدالرحمٰن نے اپنے خاندان کے چند آدمیوں کو بلا لیا تھا۔ اور ان میں کمسن عبدالعزیز موجودہ سلطان بھی اپنے حبشی محافظ کی معیت میں موجود تھا۔ سلیم اور عبدالرحمٰن دونوں ایک دوسرے کے ارادوں سے بے خبر بڑے اخلاق سے گفتگو کرتے رہے۔ اور قہوہ نوشی کی۔ آخر کار حسب تجویز کے مطابق سلیم نے خواہش ظاہر کی کہ خاندان سعود کے باقی افراد بھی ملاقات کیلئے بلائے جائیں۔ عبدالرحمٰن پہلے سے تیار تھے۔ انہوں نے اپنی تجویز کے مطابق غلام کو اشارہ کیا۔ اُن کے خادم دوڑتے ہوئے کمرہ میں آئے۔ گارد کے سپاہیوں کو قتل کر دیا۔ اور سلیم کو کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔

جسیم حبشی غلام کے پیچھے کھڑے ہوئے عبدالعزیز نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کشت و خون کا نظارہ دیکھا۔ جونہی کہ یہ خبر مشہور ہوئی۔ اہالیان ریاض اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ابن رشید کی سپاہ کو مار بھگایا۔ گرد و نواح کے دیہات اور قبائل کے لوگ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بغاوت کو فرو کرنے کیلئے ابن رشید یلغار کرتا ہوا آیا۔ عبدالرحمٰن مقابلہ کیلئے کھلے میدان میں نکلے۔ صحرا کے قواعد کے مطابق ایک ہفتہ تک چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں لیکن ہر معرکے میں امام عبدالرحمٰن نے ہزیمت اٹھائی۔ آخر کار انہوں نے اندرون شہر میں پناہ لی۔ ابن رشید نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اور گرد کے علاقوں پر ابن رشید کا تسلط ہو گیا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا۔ ریاض کے باشندوں کو پانی اور سامان رسد کی تکالیف

محسوس ہوئیں۔ محاصرین نے نخلستان تباہ و برباد کر دئے۔ نہریں اور چاہات منہدم کر دئے اور باغات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اہالیان شہر نے مطالبہ کیا۔ کہ امام عبدالرحمٰن دشمن سے صلح کر لیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر لوگ بہت بگڑے۔ اور بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ امام عبدالرحمٰن کا ارادہ آخری دم تک جنگ و جدل کرنے کا تھا۔ لیکن عوام سے مجبور ہو کر صلح کا پیغام بھیجنا پڑا۔ امن و امان کا سفید علم لیکر جو جمعیت عبدالرحمٰن کی طرف سے ابن رشید کے پاس گئی۔ اس کے ساتھ عبدالعزیز موجودہ سلطان بھی بطور ضامن موجود تھا ابن رشید بھی محاصرہ سے تنگ آچکا تھا۔ اس کی سپاہ کے اکثر آدمی میدان جنگ سے واپس جا چکے تھے۔ مال غنیمت کا امکان نہ دیکھکر باقی بھی دل برداشتہ ہو رہے تھے۔ اس لئے ابن رشید صلح کیلئے آمادہ ہو گیا۔ شرط یہ طے ہوئی کہ سلیم حاکم ریاض بلا تامل اس کے حوالہ کر دیا جائے اور عبدالرحمٰن اس کی بجائے ریاض کے حاکم قرار پائیں۔

ابن رشید واپس ہوا۔ لیکن اس کی مراجعت کیساتھ ہی قبائل نے پھر شورش کی۔ امام عبدالرحمٰن بھی اپنے چیدہ آدمیوں کو ساتھ لیکر ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ عبدالرحمٰن اپنے ساتھ عبدالعزیز کو لیتے گئے۔ اس کی عمر اس وقت صرف دس برس کی تھی۔ لیکن کمسنی اور ناتجربہ کاری کے باوجود عبدالعزیز باغی قبائل کی نقل و حرکت میں ساتھ دیتا رہا۔ ابن رشید بغاوت کا سنتے ہی لوٹا اور صحرائیوں کو مار مار کر بھگا دیا۔ اس وقت ابن رشید نے عزم راسخ کر لیا۔ کہ آل سعود کو ہمیشہ کیلئے برباد کر دیا جائے۔ عبدالرحمٰن مقابلے میں ٹھہر نہ سکے۔ ان کے مٹھی بھر ساتھی ابن رشید کی طاقت و سطوت سے خائف ہو گئے تھے۔ بعض رفاقت چھوڑ رہے تھے۔ اہل قبائل منتشر ہو چکے تھے۔ امام عبدالرحمٰن کے تحفظ کی واحد صورت صرف یہ تھی کہ ریاض میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہیں۔ اس وقت صرف ملکیتی حبشی غلام ساتھ تھے۔ کہ عبدالرحمٰن نے عبدالعزیز کو اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھایا۔ اور شہر کا راستہ لیا۔ اہالیان شہر پہلے محاصرہ کا تلخ تجربہ اٹھا چکے تھے۔ اب پھر اس مصیبت میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ عبدالرحمٰن کے کہنے سننے پر متوجہ نہ ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی شرط پر ابن رشید سے صلح کر لی جائے۔

ابن رشید بھی نہایت سرعت سے ریاض کی طرف بڑھا۔ اُوپر ذکر آچکا ہے کہ اس نے تہیہ کر لیا تھا۔ کہ آل سعود کو نیست و نابود کر دیا جائے۔

جب عبدالرحمٰن کو ابن رشید کے ارادوں کا علم ہُوا۔ تو انہوں نے ریاض سے ہجرت کر جانا چاہا۔ چنانچہ نصف سے زیادہ رات جا چکی تھی۔ کہ انہوں نے اپنے خاندان کو نیند سے بیدار کیا۔ اسی وقت ابن رشید کی سپاہ کے چند آدمی ریاض کے گرد و نواح میں نظر آئے تھے۔ یہ وقت خاندان سعود کیلئے بڑا خطرناک تھا۔ جلدی سے شہر سے چلدیں تو جان بچ جائے۔ ورنہ پورا خاندان آل رشید کے رحم پر تھا۔ دشمن کی آمد آمد تھی۔ صرف چند گھنٹے باقی تھے۔ رات کے اندھیرے میں سفر کی تیاری ہوئی۔ جس قدر سامان اُٹھ سکتا تھا۔ ساتھ لیا۔ عبدالعزیز اور اس کا بھائی محمد ایک اُونٹ پر بیٹھے۔ جب سامان اُونٹوں پر لد چکا۔ تو مستورات بھی بیٹھیں۔ صبح ہونے سے پیشتر ہی یہ قافلہ شہر کے مشرقی دروازہ کی راہ سے صحرا کی طرف چل دیا۔ اور صحرائے دہنا میں سے ہوتا ہُوا صوبہ الحصا کی طرف رُخ کیا۔ وہاں پہنچ کر عبدالرحمٰن نے قبیلہ ہائے عجمان کے شیخ حطین کے ہاں اقامت کی۔ عجمانیوں نے ان خانماں برباد مسافروں کو پناہ تو دی۔ لیکن اخلاق سے پیش نہ آئے۔ سعود کی اولاد ایک عرصہ سے اُن کے ہاں اقامت گزین تھی۔ اور اس قبیلہ میں ان کی شادیاں بھی ہو چکی تھیں۔ یہ لوگ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ عبدالرحمٰن سے ناراض تھے۔ اور عجمانیوں کو ترغیب دیتے تھے۔ کہ ان کو نیچے ہاں سے نکال دیں۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ عبدالرحمٰن کو یہاں بھی خطرات درپیش تھے۔ ہر وقت جان جانے کا اندیشہ رہتا تھا۔ قبائل عجمان کے لوگ ظالم و خونخوار اور غیر مستقل مزاج تھے۔ تمام باتوں کو مدِنظر رکھکر عبدالرحمٰن نے اپنے خاندان کی محافظت کا یہ بندوبست کیا کہ ان سب کو بحرین بھیجدیا۔ عبدالعزیز ابن سعود کو اس وقت بلغمی بخار آتا تھا۔ اور آرام کی سخت ضرورت تھی۔ اُسے بھی گھر والوں کے ساتھ بحرین بھیج دیا گیا۔

خاندان کے بارے میں مطمئن ہونے کے بعد عبدالرحمٰن نے حصول مدد کیلئے ہاتھ پاؤں مارے۔ انہیں پے درپے شکستیں ہوئی تھیں۔ لیکن انہوں نے ابھی تک ہار نہ مانی تھی شیوخ میں سے کوئی بھی ان کی مدد کیلئے تیار نہ ہُوا۔ البتہ لوٹ کے لالچ سے بعض بدوی ساتھ ہو گئے۔

انہیں کو لیکر عبدالرحمٰن نے ریاض پر چھاپا مارا۔ لیکن افسوس کا مقام ہے۔ کہ اہالیان نجد میں سے کسی نے بھی مدد نہ کی۔ ابن رشید کی سپاہ نے آسانی سے انہیں پسپا کر دیا۔ مراجعت کے وقت صوبہ الحصا کے ترک والی نے عبدالرحمٰن کو طلب کیا۔ آئینی طور پر تو ترکی حکومت تمام جزیرۃ العرب کی فرمانروا تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ پورا عمل دخل ساحلی صوبجات یمن۔ عسیر۔ حجاز۔ کویت اور الحصا اور شمال میں عراق عرب اور شام و فلسطین تک ہی محدود تھا۔ اندرون عرب حائل۔ نجد اور حضر الموت سے کچھ سروکار نہ تھا۔ ان ممالک میں ترکوں کی پالیسی نہائت سادہ تھی۔ بڑی غرض یہ تھی۔ کہ اندرون عرب کے قبائل خالص ترکی صوبہ جات پر حملہ نہ کرنے پائیں۔ اس غرض کے حصول کیلئے ترک خواہاں تھے کہ صحرائے عرب میں توازن قائم رہے۔ اور کوئی عرب شیخ یا امیر اس قدر طاقتور نہ ہونے پائے۔ کہ کسی وقت خطرہ کا باعث ثابت ہو۔

ظاہر ہے کہ خاندان سعود کی پوری شکست اور آل رشید کی مکمل فتح ترکی حکومت کے مصالح کے خلاف تھی چنانچہ ترک والی عبدالرحمٰن سے بڑی مروت کے ساتھ پیش آیا اور خواہش ظاہر کی کہ اگر عبدالرحمٰن ریاض میں ترکی سپاہ کے قیام کو منظور کرلیں۔ اور ترکی سیادت کو قبول کر کے خراج دینا قبول کریں۔ تو انہیں توپ خانہ اور عساکر سے ابن رشید کے خلاف مدد کی جائیگی۔ عبدالرحمٰن کے خاندان کی تلخ روایات اس مصالحت کے خلاف تھیں۔ عبدالرحمٰن ترکوں کو پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ اور خالص وہابی علاقے میں ترکوں کے قیام کو برا جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے شرائط مذکورہ بالا کو ماننے اور اس طرح پر ترکوں کی عسکری امداد حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ ترکوں نے اس انکار کو برا مانا۔ انہیں شکائت تھی۔ کہ بیس برس پہلے بھی الحصا میں جو بغاوت والئے قطار نے کی تھی۔ وہ عبدالرحمٰن کے ایما پر کی تھی۔ وہ سمجھے کہ اب بھی اس صوبہ میں ہیجان کی جو لہر اٹھ رہی ہے۔ اسمیں عبدالرحمٰن کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ حفاظتی تدابیر یہ کی گئیں کہ ترکی سپاہ میں ایزادی کر دی گئی۔ اور حکومت کی نگاہ میں عبدالرحمٰن خطرناک قرار پائے۔ عبدالرحمٰن ابن رشید کے سامنے سے جان بچا کر بھاگے تھے۔ قبائل عجمان کی طرف سے بھی اندیشے تھے۔ ان کے چچا زاد بھائی پہلے ہی

خون کے پیاسے تھے۔ اب ترکی عمال بھی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ تو مجبوراً الحصا کو بھی چھوڑا۔ اس وقت عبدالعزیز بھی صحت یاب ہو چکا تھا۔ اور اپنے والد کے پاس بحرین سے واپس آگیا تھا۔ دونوں چند خدمتگاروں کو ساتھ لیکر جبرین کے نخلستانوں میں پہنچے۔ اور وہاں سے ربع الخالی کی طرف چلدئے ناظرین کو معلوم ہوگا۔ کہ ربع الخالی کئی سو میل طول اور عرض کا ایک صحرا عرب کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ آبادی کا نام ونشان نہیں۔ کئی کئی سو میل تک پانی میسر نہیں آتا بعض حصص میں چند وحشی قبائل آباد ہیں جن کی معاشرت بہت پست ہے۔ ان میں سب سے مشہور قبیلہ مرہ ہے عبدالرحمن نے انہی لوگوں سے پناہ طلب کی صحرا کے اخلاق کے مطابق ان وحشیوں نے عبدالرحمن کو امان دی۔ اور کئی ماہ تک دونوں باپ بیٹا ان کے پاس اقامت پذیر رہے۔ عبدالعزیز کے ساتھ اسکا چھوٹا بھائی محمد اور محمد جلیوی جو بعد میں شائستہ اور نمایاں خدمات بجالایا تھا۔ اس کی والدہ اور گھر کی مستورات بآرام وسہولیت بحرین میں مقیم تھیں۔

قبیلہ مرہ کے بدوی بالکل سادہ اور وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ خور ونوش کی چیزیں بہت کمیاب تھیں۔ جبرین کے نخلستانوں سے تھوڑی سی کھجوریں میسر آجاتیں تھیں۔ اور کبھی کبھی صحرائی شکار مل جاتا تھا پانی نمکین اور پینے کے قابل نہیں تھا۔ یہ لوگ دیہات بناکر نہیں رہتے تھے بلکہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ آج یہاں ہیں۔ تو کل دوسری جگہ۔ جہاں کہیں چراگاہ نظر آتی مویشی لیکر وہیں پہنچ جاتے کبھی کبھی کوئی قافلہ اس طرف سے گذرتا۔ تو لوٹ مار بھی کر لیتے تھے۔ پھر تعاقب کے خوف سے صحرا کی وسعتوں میں گم ہو جاتے تھے۔ اس قبیلہ میں بود و باش کرنے سے عبدالعزیز بالکل بدوی ہو گیا۔ صحرا کی زندگی میں بسا اوقات سر ڈھانپنے کیلئے کپڑا تک میسر نہ آتا تھا۔ عبدالعزیز انکے ساتھ سفر کرتا رہا اور صحرا کی زندگی کا اچھی طرح سے عادی ہو گیا۔

اس عرصہ میں عبدالعزیز کو صحرا میں قدموں کے نشان پہچاننے اور اونٹوں کی پرورش اور نگہداشت میں مہارت پیدا ہو گئی۔ تھوڑی غذا اور تھوڑے سے سامان کے ساتھ صحرا میں لمبے لمبے سفر کرنے کا طریقہ معلوم ہو گیا۔ جو کہ بعد کی زندگی میں ازحد مفید ثابت ہوا۔

اب عبدالعزیز ابن سعود کا عنفوانِ شباب تھا۔ صحرا کی سادہ اور پرصعوبت زندگی اور ہر وقت کے خطرات اور خدشات نے عبدالعزیز کے جسم کو قوی اور توانا اور دماغ کو پرافکار و بیدار کر دیا۔ انہیں

بے مثال خود اعتمادی اور عزم راسخ پیدا ہو گیا۔ وہ بالکل لاغر ہو گیا تھا۔ لیکن ہر قسم کی مصیبت جھیلنے اور مشقت برداشت کرنے کیلئے تیار رہتا تھا۔ بدوی زندگی کی کڑی روش نے عبدالعزیز میں وہ تمام خصائل پیدا کر دیئے۔ جو بعد میں پوری آب و تاب کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں نمایاں ہوئے ظاہر ہے کہ اگر مبداءِ فیاض نے اسکی طبیعت میں جوہر خاص نہ ودیعت کیا ہوتا۔ تو ایسے مایوس کن حالات اور حوصلہ فرسا کوائف میں اس کا سنبھلنا محال تھا۔

عبدالرحمٰن اس زندگی کو پسند نہ کرتے تھے۔ انہیں قبیلہ مرہ کے وحشیوں سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ نہ صرف ان بدویوں کی زندگی فسق و فجور کا مجموعہ تھی۔ بلکہ معتقدات میں بھی یہ لوگ بڑے توہم پرست اور مشرک تھے۔ اسلام کی حقیقی تعلیم ان تک کبھی پہنچی بھی نہ تھی۔ عبدالرحمٰن کی عزت نفس اور احساسات مذہبی کو ایسے لوگوں کے ساتھ سکونت اور معاشرت سے صدمہ پہنچتا تھا کبھی کبھی عبدالرحمٰن ان لوگوں کو ریاض پر حملہ کرنے کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ لیکن ابن رشید کے سامنے ان لوگوں کی ترکتازیاں محض بیکار تھیں۔ عبدالرحمٰن نے ابھی تک حوصلہ نہ ہارا تھا اور اپنے بیٹوں کو ریاض کی فتح و تسخیر کیلئے تیار کرتے رہتے تھے۔ لیکن ناموافق حالات کے ہجوم میں کوئی خاص اُمید باقی نہ رہی تھی۔ عبدالرحمٰن پر صعوبت زندگی کے پچاس برس پورے کر چکے تھے۔ اور کہولت کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اب ایسی جگہ کی تلاش میں تھے۔ جہاں اپنی مستورات کے ساتھ اطمینان و آرام کی زندگی بسر کر سکیں اُنہوں نے بعض شیوخ کی طرف پناہ کیلئے رجوع کیا۔ لیکن طاقتور مخالفین کی وجہ سے کہیں بھی رسائی نہ ہو سکی۔

آخر کار جب ہر طرف سے سلسلہ امید منقطع ہو چکا تھا۔ محمد والئے کویت نے انہیں طلب کیا۔ اور ماہانہ وظیفہ دینا قبول کیا۔ حقیقت میں اسکی دعوت اپنی طرف سے نہ تھی۔ اس عرصہ میں الحصا کا سابق ترک والی تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ حافظ پاشا متعین ہوا۔ نئے والی نے ترکی حکومت کی مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے عبدالرحمٰن کی امداد و معاونت کی ضرورت محسوس کی۔ ابن رشید اب اس قدر طاقتور ہو گیا تھا۔ کہ ترکی حکومت کو بھی خدشہ لاحق ہوا۔ حافظ پاشا نے محسوس کیا۔ کہ عبدالرحمٰن سے ابن رشید کی بڑھتی ہوئی طاقت کے کمزور کرنے کا کام نکل آئیگا۔ آپس کی چپقلش میں دونوں اس قدر کمزور ہو جائینگے کہ ترکی حکومت کیلئے اس بارے میں تردد کی گنجائش نہ رہیگی لیکن حافظ پاشا

عبدالرحمن کے وقار کو جانتا تھا۔ اس لئے اُس نے محمد والئے کویت سے یہ طے کر لیا کہ جب تک عبدالرحمن کویت میں قیام پذیر رہینگے ترکی حکومت والئے کویت کے توسط سے ماہانہ وظیفہ بسر اوقات کیلئے دیتی رہیگی۔ عبدالرحمن نے کہ اس بڑھاپے میں امن و آرام کے جویا تھے۔ خوشی سے محمد کی دعوت قبول کی۔ اور اہل و عیال کے ساتھ کویت میں رہائش اختیار کرلی۔

باب دوئم

سلطان کی جلاوطنی

خاص عرب کی سرزمین قدرت کی عنائت فرمائیوں سے محروم ہے پانی کی بیحد قلت ہے اور صحرا قابل کاشت نہیں۔ کسی قدر زراعت ہے بھی تو غیر منفعت بخش۔ صنعت و حرفت کیلئے بھی کچھ ایسی گنجائش نہیں۔ موجودہ معلومات کے اعتبار سے معدنی دولت بھی نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگ بدویانہ اور غیر مستقل زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ پانی اور چراگاہ کی تلاش میں جگہ بجگہ پھرتے ہیں ظاہر ہے کہ جب آبادی کے بیشتر حصہ کی کیفیت یہ ہو تو تمدن اور معاشرت کی ترقیات محال ہیں یہی وجہ ہے کہ عرب کی ریاستیں غیر مستقل اور ناپائیدار ہوتی ہیں۔ ان کا قیام اور استحکام فرمانروائے وقت کی شخصیت پر ہوتا ہے۔ اور کیونکہ بیدار مغز اور مدبر حکمران کے جانشین ہمیشہ ویسے ہی قابل اور کارکن نہیں ہوتے۔ اس لئے ایک ہی ریاست کا بہت دیر تک یورپ کی سلطنتوں کی طرح قائم رہنا خلاف قیاس ہے۔

عرب کے حالات مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں۔ کہ اکثر ملکوں کی طرح وہاں کے سیاسی حالات و کوائف کسی سلسلہ نظام کے ماتحت منضبط نہیں ہیں۔ بدیں وجہ سیاسی پیشین گوئی اور خیال آرائی کچھ زیادہ قابل وثوق نہیں جنگ عظیم کی وجہ سے عرب کے تعلقات غیر ممالک سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اور حالات میں معتد بہ تبدیلی ہو گئی ہے۔ لیکن پھر بھی گذشتہ

واقعات کی روشنی میں مستقبل کے متعلق بھروسہ سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

انیسویں صدی کے آواخر میں جبکہ امارت حائل اپنے عروج پر تھی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کہ ریاض کی سلطنت دوبارہ زور پکڑیگی۔ اور حائل کی طاقتور امارت کو نقشہ عرب سے معدوم کر دیگی یہ صحیح ہے۔ کہ اسی صدی کے شروع میں ریاض کی سلطنت اور تحریک وہابیت نے ترکوں کی سلطنت عثمانیہ کی بنیادوں کو ہلا دیا تھا۔ لیکن ترکوں نے سالہائے مابعد میں اس تحریک کو بالکل کچل ڈالا تھا اور اس سلطنت کی بیخکنی کر دی تھی۔ اب اس طاقت کا پھر اُبھرنا اور تحریک کا پنپنا ناقابل یقین سی بات تھی۔

بظاہر اس قسم کے حالات تھے جب سلطان ابن سعود پیدا ہوا۔ ابھی تک عرب کے شیوخ اور امیر آپس میں جنگ کر لیا کرتے تھے لیکن پھر بھی عثمانی اقتدار ملک پر قائم تھا۔ اور قانونی اور بین الاقوامی نگاہ میں عرب سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا۔

خاص عرب میں ابھی تک تحریک عربیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ اور حب وطنی اور قومی ترقی کے پاکیزہ جذبات محدود سے چند ہستیوں کے سینوں تک محدود تھے۔

اس زمانے میں سعودی خاندان برسر تنزل تھا۔ گذشتہ صدی کے وسط میں جب کہ اس خاندان نے شیخ محمد بن عبدالوہاب سے سلسلہ اتحاد و موالفت پیدا کیا تھا۔ تو طاقت اور ناموری پیدا ہوئی تھی اور تھوڑے سے عرصہ میں تمام عرب مفتوح ہو گیا تھا۔ لیکن سلطنت عثمانیہ میں ابھی جان باقی تھی۔ ترکوں نے عرب کے اکثر حصص واپس لیلئے تھے۔ اور اس خاندان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو بے حد کمزور کر دیا تھا۔ اس انحطاط کے زمانہ میں بھی یہ خاندان اندرون عرب کے کچھ علاقے پر قابض رہا۔ ان کا اصلی پایۂ تخت درعیہ مصری افواج نے آل سعود سے چھین لیا تھا۔ لیکن اس کی بجائے قریب ہی اب شہر ریاض قائم ہو گیا تھا۔

عرب میں آئے دن خانہ جنگیاں برپا رہتی ہیں۔ اور نہ ہی ریاستوں کی حدود باقاعدہ طور پر قائم ہوتی ہیں۔ ایک قابل حکمران اپنے غافل ہمسائے کے علاقہ پر چھاپہ مارنے سے کبھی نہیں چوکتا۔ اس زمانے میں قبیلہ بنی شمار کی نامور سلطنت حائل میں قائم تھی۔ ان کے مشہور معروف امیر محمد بن رشید نے عرب کے صحرائے شمالی کے تمام علاقوں کو فتح کر لیا تھا۔ یہ شخص بڑا لائق اور نامور گذرا ہے۔ وہ

ترکی حکومت کے حقوق شہنشاہیت کو بدل وجان تسلیم کرتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا خاندان جنگ عظیم کے زمانے تک ترکوں کا وفادار اور جانثار رہا۔

۱۸۸۵ء میں محمد ابن رشید نے وہابیوں کے پائیہ تخت ریاض کو فتح کر کے اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ یہ بادشاہ وہابیوں سے عدل و انصاف کا سلوک کرتا رہا۔ اور عوام کو بظاہر اس کے خلاف شکایت کی گنجائش نہ تھی۔ وہابی آبادی بظاہر امن وامان سے رہتی تھی۔ لیکن پھر بھی اپنی محکومیت اور غلامی پر خوش نہ تھی۔ ۱۸۹۲ء میں انہوں نے حکمران کے خلاف بغاوت کی۔ اور بہت کشت وخون کیا۔ لیکن آخر کار شکست کھائی۔

اس واقعہ سے وہابیوں کا رہا سہا رسوخ جاتا رہا۔ اور وہابیوں کے امیر عبدالرحمٰن جو موجودہ سلطان کے باپ تھے۔ اور اس وقت تک ریاض میں ہی بطور حائل کی رعیت کے آباد تھے۔ اس خیال سے کہ حکومت ان کے خاندان سے بغاوت کیلئے بازپرس کریگی۔ اور سخت سلوک روا رکھیگی۔ ساحل خلیج فارس کی طرف بھاگ گئے۔ لیکن ترکوں کی طرف سے خیر مقدم نہ دیکھکر اور کچھ عرصہ خستہ و خراب ہو کر کویت کو چلے گئے۔ اور سلطان مبارک والئے کویت کی پناہ میں اقامت گزین ہو گئے۔

شیخ مبارک نے کویت پر زبردستی قبضہ کیا ہوا تھا۔ لیکن عمدہ نظم ونسق اور موتیوں کی تجارت کی وجہ سے اس کی رعیت خوش اور مرفہ الحال تھی۔ اندرون عرب کے حکمران اور عرب قبائل کے شیوخ اور امرا کویت کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور حملہ کرنے کیلئے مناسب موقعہ کی تلاش میں تھے۔ ترک تجارتی نقطہ نگاہ سے اس علاقہ پر مدت سے دانت رکھے بیٹھے تھے۔ جرمنی کی حکومت بغداد ریلوے کو کویت تک پھیلانا چاہتی تھی۔ زار روس بھی اس با موقع بندرگاہ پر نظر جمائے بیٹھا تھا۔ علیٰ ہذالقیاس حکومت انگلشیہ بھی اپنے مفاد سے غافل نہ تھی۔ سلطان مبارک اپنی تمام مشکلات کو بخوبی سمجھتا تھا۔ اور اپنے استحکام اور محافظت کیلئے کسی اجنبی طاقت کا سہارا ڈھونڈ رہا تھا۔ آخر کار سلطنت انگلشیہ سے کویت کے تعلقات پیدا ہو گئے۔ اور کویت اس حکومت کے ظل حمایت میں آگیا

اس جلاوطنی کے زمانے میں عبدالرحمٰن کے ساتھ اس کا خاندان بھی موجود تھا۔ اور ضمناً اس کا لڑکا عبدالعزیز موجودہ سلطان بھی۔ اس زمانے میں عبدالعزیز نے اپنے مستقبل اور قیام سلطنت سعودیہ کے لئے تجاویز سوچیں۔ اس نوجوان کے ابتدائی دس سال تو سلطنت حائل کے دست نگر ہو کر

اور اپنے خاندان کے زوال دیکھنے میں صرف ہوئے۔ اور اس کے بعد تقریباً دس سال ساحل خلیج پر دربدر پھرنے اور بدوؤں کے عادات و خصائل مطالعہ کرنے میں۔ یہی وہ تربیت تھی جو سلطان عبدالعزیز کو عہد طفولیت اور عنفوان شباب میں نصیب ہوئی۔ سلطان نے اسی زمانے میں ریاض کو دوبارہ فتح کرنے کا عزم صمیم کر لیا تھا۔ عبدالرحمٰن غریب الوطنی کے زمانے میں بیٹے کے عزم راسخ کو دیکھ رہے تھے اور جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ اس ارادہ کو جامۂ عمل کیسے پہنایا جائے۔ عبدالرحمٰن کے پاس خویش و اقارب کے علاوہ جانثاروں کی نہائیت مختصر سی جمیعت تھی۔ شیخ مبارک والئے کویت نے اس کو امن و مسکن عطا کیا تھا۔ اس سے امداد کی توقع بھی تھی۔ شیخ کو جب اس تجویز کا علم ہوا۔ تو وہ بھی خفیہ طور پر امداد کرنے کیلئے بدل و جان تیار ہوا۔ کیونکہ امارت حائل کا کانٹا اس کے پہلو میں بھی آرام دہ نہیں تھا۔ خاندان حائل کا سرآوردہ فرد محمد ابن رشید فاتح ریاض ۱۸۹۷ء میں فوت ہو چکا تھا۔ لیکن قابل جانشین چھوڑ کر نہیں گیا تھا عبدالعزیز شیخ مبارک والئے کویت کے نظم و نسق کو بغور مطالعہ کرتا تھا۔ اور تجربہ حاصل کر رہا تھا۔ وہ شیخ کی حائل و ریاض کی سلطنت کے خلاف تجاویز سے بھی بے خبر نہیں تھا۔

چنانچہ اُنیسویں صدی کے آواخر میں عبدالعزیز نے یہ محسوس کیا۔ کہ ریاض پر حملہ کرنے کا مناسب وقت آگیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ عبدالعزیز نے حالات کا اندازہ غلط کیا تھا اندرون عرب میں ابھی آل رشید کا اثر و نفوذ زبردست تھا۔ اور اُن کی طاقت کافی تھی۔

پیشتر اس کے کہ ریاض فتح ہو۔ اور آل سعود کا پرچم پھر اس پر لہرائے۔ عبدالعزیز کو ابھی کچھ عرصہ انتظار کھینچنا تھا۔

بابِ سوئم

سُلطان کی کویت میں سکونت

ناظرین کو معلوم ہو گا کہ خلیج فارس کے ساحل پر کویت ایک چھوٹا ساعربی قصبہ ہے۔ جو کہ ایک اوسط درجہ کی بندرگاہ کا کام دیتا ہے۔ کویت کے ایک طرف سمندر ہے۔ اور دوسری طرف وسیع صحرا ہے۔ خاص کویت کی زمین خشک اور بے آب و گیاہ ہے۔ پورے شہر میں ایک باغ بھی نہیں۔ البتہ کہیں کہیں اہلی کے مربل سے درخت نظر آجاتے ہیں۔ اسی شہر میں خاندان سعود مختصر سے ایک منزلہ مکان میں رہتا تھا۔ جس میں صرف تین کمرے صحن کے ارد گرد بنے ہوئے تھے۔ چھتیں نیچی تھیں اور کھجور کے تنے کی بنی ہوئی تھیں۔ اور کھڑکیاں پرانی وضع کی تھیں۔ پیشتر ازیں بیان ہو چکا ہے۔ کہ خاندان سعود نہایت وسیع تھا۔ اس لئے اس تنگ و تاریک مکان میں بڑی دقت سے گذران اوقات ہوتی تھی۔ ریاض میں اُن کا محل وسیع عمارت تھی۔ قبیلہ مرّہ کے ہاں بھی یہ لوگ وسیع صحرا میں رہتے چلے آئے تھے۔ ان وجوہات سے موجودہ مکان کی تنگی اور بھی زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ یہ لوگ بڑی عسرت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ گو ترکوں نے ابتداء میں ماہانہ وظیفہ دینا مقرر کیا تھا۔ لیکن وُہ باقاعدگی سے ادائیگی نہیں کرتے تھے۔ اور محمد والئے کویت خود اپنے پاس سے بھی نہیں دیتا تھا۔ والئے کویت ان لوگوں سے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔ لیکن کیونکہ بے حد بخیل تھا۔ اس لئے اُنکی پرورش کی طرف توجہ نہ تھی۔ آخر کار یہ وظیفہ بالکل بند ہو گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ ترکوں نے ایک دفعہ پھر انہی شرائط پر عسکری امداد پیش کی۔ عبدالرحمن نے دوبارہ انکار کیا۔ جب ترکوں کو ان سے کوئی اُمید نہ رہی۔ تو اُنہوں نے مدد بالکل بند کر دی۔ اس مرحلہ پر انہیں (عبدالرحمن) معلوم ہُوا کہ ترک والئے کویت کی وساطت سے اُنہیں وظیفہ دیتے رہے ہیں۔ اس بات پر اُنہیں بیحد رنج ہُوا۔ لیکن غربت و افلاس کی وجہ سے وصول شُدہ رقومات واپس نہ کر سکے۔

اس کے بعد حالت یہاں تک نازک ہوئی۔ کہ بسا اوقات خورد و نوش اور لباس تک میسّر نہ آتا تھا۔ اور عبدالرحمٰن اپنے وقار اور جاہ کے باوجود قرض برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔
جب عبدالعزیز ابن سعود کی عمر پندرہ برس کی ہوئی۔ تو اس کی والدہ ماجدہ نے ایک بدّی لڑکی سے منگنی کر دی۔ لیکن غربت کا بُرا ہو کہ شادی کے معمولی اخراجات بھی میسّر نہ تھے۔ آخرکار ایک امیر تاجر نے مالی امداد پیش کی۔ عبدالرحمٰن رنجیدہ خاطر تو بہت ہوئے۔ لیکن مجبوراً رضامند ہو گئے۔

یقیناً یہ زندگی ذلت و بدحالی کی تھی۔ یہ مفلوک الحال خانماں برباد جلاوطن اپنے پاکیزہ وطن سے دُور دل میں ناقابلِ حصول اُمیدیں لئے افلاس و پریشان حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ گردوپیش گناہ اور آلودگی اور نکبت و گمراہی کا ہجوم تھا۔ کویت میں چند اہالیان نجد بھی رہتے تھے۔ بعض نجدی تجارت کی غرض سے آمدورفت رکھتے تھے۔ ان لوگوں سے خاندان سعود کو ریاض کے حالات سے وقتاً فوقتاً آگاہی ہو جاتی تھی۔ لیکن اب تک اُمید افزا نظر نہیں آتے تھے۔ ابن رشید کی حکومت کو گونہ استحکام ہو گیا تھا اور کسی کو بغاوت کرنے کی جرأت نہ رہی تھی۔
لیکن عبدالعزیز ابن سعود کیلئے نئے تجربات و مشاہدات کیلئے بے نظیر موقعہ میسّر تھا اب تک اس نے صرف خشک وہابیوں اور وحشی صحرائیوں کی معاشرت ہی دیکھی تھی۔ کویت کی آبادی مخلوط تھی۔ انواع و اقسام کے لوگ تھے۔ ہندوستانی۔ ایرانی۔ عرب۔ ارمنی۔ ترک اور یہودی مختلف قومیتوں کے لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ لیکن شہری تمدن کی وجہ سے سب کے سب مہذب خوش کلام اور پُرا خلاق تھے۔ عبدالعزیز کو پیشتر ازیں فسق و معصیت کی زندگی دیکھنے کا اتفاق نہ ہُوا تھا۔ وہ کویت میں معمولی شہری کی زندگی بسر کرتا تھا۔ ہر قسم اور ہر طبقہ کے لوگوں سے میل جول رکھتا تھا نتیجہ یہ ہُوا کہ اس کی نظر کو وہ وسعت اور دقّت حاصل ہوئی جس کا جو اندرون عرب کے باشندے میں محال ہے۔ لیکن یہ اعتراف ضروری ہے۔ کہ اس کی ذاتی زندگی اب بھی محض مذہبی تھی۔ صوم و صلوٰۃ کی پوری پابندی بدستور سابق تھی۔ عبدالرحمٰن بھی اپنے فرائض نگہداشت سے غافل نہیں تھے چنانچہ عبدالعزیز کی جوانی کے دامن عفت پر کوئی داغ اور بدنما دھبّہ نہیں۔
اس وقت عبدالعزیز اپنی عمر کے اعتبار سے بہت تنومند اور قوی ہیکل ہو گیا تھا۔ قوائے

ذہنیہ تربیت یافتہ تھے۔ اور اخلاق میں مصادقت اخلاص حق شناسی اور صاف گوئی حاصل تھی

اس قیام میں محمد والئے کویت کا بھائی مبارک عبدالرحمن کے پاس اکثر آیا جایا کرتا تھا مبارک کے تعلقات اپنے بھائی سے کشیدہ تھے کئی برس پیشتر جبکہ وہ جوان تھا۔ دونوں میں تنازعہ ہو چکا تھا۔ اور وہ اسی باعث بمبئی چلا گیا تھا۔ وہاں کی پرشور زندگی میں وہ اپنا تمام اثاثہ کھو بیٹھا تھا یہاں تک کہ اپنی والدہ کے جواہرات بھی بیچ کر کھا چکا تھا جب وہاں سے واپس پھرا تو ایک دمڑی بھی پاس نہیں تھی۔ اس کے بھائی کی اس کے ساتھ ہنوز نفرت باقی تھی۔ محمد والئے کویت خود کمینہ خصائل کا انسان تھا۔ اور اپنے بھائی کی فیاضی اور سبک سری کو برا جانتا تھا۔ اس سے خائف بھی رہتا تھا۔ کیونکہ کویت کے باشندے مبارک سے محبت رکھتے تھے۔ محمد مبارک کو تہی دست رکھتا اور موقع بموقعہ اس کی تحقیر کرتا رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ مبارک کے تعلقات عبدالعزیز سے دوستانہ ہو گئے مبارک اس پر بزرگانہ شفقت رکھتا تھا۔ اکثر دعوتیں کھلاتا بہت باتیں کرتا۔ اور اپنے دنیاوی تجربات وخیالات سے مستفید کرتا رہتا تھا۔

جب کہ ابن سعود کی عمر سترہ برس کی تھی۔ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ مبارک بھائی کے تحقیر آمیز سلوک سے تنگ آ کر ایک رات اپنے ایک عزیز اور ایک عجمانی خادم کی معیت میں محل میں جا گھسا۔ اور بھائی کو قتل کر کے کویت کا والی بن بیٹھا۔ لوگ پہلے ہی محمد کی سخت گیری اور تحصیل زر سے نالاں تھے انہوں نے لطیب خاطر مبارک کی حکومت قبول کر لی۔ اس واقعہ کے چند ہفتے بعد محمد ابن رشید بھی مر گیا۔ اس کا جانشین عبدالعزیز ابن رشید طماع نالائق اور محض ناکارہ تھا محمد ابن رشید نے بڑی عظمت وسطوت سے حکومت کی تھی لیکن عبدالعزیز کے اوائل عہد میں ہی اکثر قبائل اس کی خفیف حرکتوں کی وجہ سے بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔

مبارک والئے کویت کے تخت نشین ہوتے ہی خاندان سعود کی اہمیت میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ یہ لوگ والئے ملک کے گہرے دوست سمجھے جانے لگے۔ اور آل رشید کے جانی دشمن۔ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ ریاض سے پیغام پہنچنے لگے کہ نجد کے لوگ ان کیلئے چشم براہ ہیں۔ اور حکومت رشید سے بغاوت کرنے پر کمر بستہ ہیں۔

پیشتر ازیں ذکر آچکا ہے۔ کہ خلیج فارس میں اقتدار حاصل کرنیکے بارے میں جرمنی اور انگریزوں کی رقابت تھی جب جرمنوں نے دیکھا کہ شیخ مبارک نے انگریزوں سے تعلقات استوار کر لئے ہیں تو انہوں نے ترکوں سے جو کویت پر برائے نام حقوق سیادت رکھتے تھے۔ اسے معزول کرا دینا چاہا۔ شیخ مبارک اپنے بھائی کو قتل کر چکا تھا۔ اور ترکوں نے اس کی حکومت کو بالفعل تسلیم نہ کیا تھا یہی وجہ اُسے معزول کرنے کیلئے کافی تھی۔ عام طور پر معلوم ہے کہ سیاسی اغراض کو پیش نظر رکھکر اس زمانے میں قیصر جرمنی نے اپنے آپ کو مسلمانوں کا بہی خواہ اور ترکوں کا دوست ظاہر کیا تھا۔ بدیں وجہ اُسے عثمانی حکومت میں اُن دنوں رسوخ حاصل تھا۔ لیکن ترک بھی انگریزوں کی مداخلت کے خوف سے شیخ مبارک کیخلاف کوئی کاروائی نہ کر سکے۔ البتہ انہوں نے یہ چال چلی کہ ابن رشید کو شیخ کے خلاف اُکسایا۔ اور اسلحہ اور مال و دولت سے اُسے مدد بھی دی۔ ابن رشید بھی کویت پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ اب ارادہ میں مزید تقویت ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ کویت سے اندرون عرب پر حملہ کر دینا بہت آسان ہے۔ اس لئے کویت کو کمزور کر دینا اس کی سلطنت کی مصلحت بھی تھی۔

جب شیخ مبارک کو اس تحریک کا علم ہوا۔ تو اسے فکر پیدا ہوئی۔ مبارک کے پاس نہ تو باقاعدہ فوج تھی۔ اور نہ ہی اس کی رعیت جنگجو تھی۔ شہر کی فصیل تک قائم نہ تھی۔ اس لئے اس نے قبائل عرب میں مددگار و حلیف پیدا کرنے کیلئے داعی اور نقیب بھیجے۔ مرہ۔ عجمان۔ مطیر کے قبائل اس کے ساتھ ہو گئے۔ پھر قبیلہ منطفق کا شیخ سعدون بھی آگیا۔ اس وقت مبارک کیلئے خاندان سعود کی معاونت کی بھی سخت ضرورت تھی۔ اب وہ عبدالرحمٰن کو مشوروں میں شامل کرنے لگا۔ اور کمال اعتماد کا اظہار کرتا رہا۔

لیکن کیونکہ عبدالرحمٰن متقی اور پرہیزگار تھے۔ اور شیخ مبارک جدید معاشرت رکھتا تھا۔ اور شریعت حقہ کے احکام کی بھی پوری متابعت نہیں کرتا تھا۔ اس لئے وہ اس سے خوش نہ تھے۔ بلکہ ابن سعود کو بھی حکم دیدیا تھا۔ کہ وہ شیخ سے زیادہ میل جول نہ رکھے۔ لیکن ابن سعود خفیہ طور پر شیخ سے ملاقاتیں کیا کرتا رہا پیشتر ازیں ذکر کیا جا چکا ہے۔ کہ شیخ مبارک ابن سعود کو بہت چاہتا تھا۔ اور بار بار اپنے پاس طلب کیا کرتا تھا۔ اسے سلطنت کے نظم و نسق کی کیفیت بتاتا رہی اور سرکاری ملاقاتوں میں اُسے بھی اپنے ساتھ رکھتا۔ اور مجالس مشورت میں بھی اسے شامل کرتا۔ اس کی ان کرم فرمائیوں کا

نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ ابن سعود جدید سیاست، مغربی تمدن اور انتظامِ مملکت کے سلیقوں سے بخوبی آشنا ہو گیا۔ فی الحقیقت یہی وہ تربیت تھی جس کے زیرِ اثر ابن سعود کے جوہرِ خاص نے پرورش پائی۔ اور مابعد کی زندگی میں محیّر العقول کارنامے کئے۔

شیخ مبارک نے ارادہ کیا۔ کہ ابن رشید کے حملے سے پیشتر ہی اس پر حملہ کر دے۔ چنانچہ اس نے اپنے حلیف اور مددگار جمع کئے۔ جب دس ہزار کا مجمع ہو گیا۔ تو اس نے حائل کا رُخ کیا۔ عبدالرحمٰن کو تو اپنے ساتھ لیا۔ اور ابن سعود کو تھوڑی سی فوج دیکر جنوب کی طرف رخصت کر دیا۔ تاکہ وہ وہاں اہالیان نجد کو ابن رشید کے خلاف شورش پر آمادہ کرے۔ ابن سعود کے ساتھ اس کا بھائی جلیوی اور نجد کے چند اور لوگ بھی تھے۔ ابن سعود نے مستعدی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ نجد کے لوگ ابن رشید کی حکومت سے خوش نہ تھے۔ شورش پر آمادہ ہو گئے۔ اور ابن سعود کے ساتھ جوق در جوق شامل ہونے لگے۔

یکایک خبر پہنچی کہ مبارک اور رشید کی جنگ صارف نامی گاؤں کے قریب ہوئی تھی۔ مبارک کے بہت سے ساتھی بھاگ گئے چنانچہ اسکو شکست فاش ہوئی۔ اگر موسلادھار بارش نہ ہو جاتی تو اسکی فوج کی مکمل تباہی یقینی تھی۔ شیخ مبارک ہزیمت اُٹھا کر کویت کو واپس جا رہا تھا۔ اس خبر کو سُن کر ابن سعود کے نئے ساتھی بھی بھاگ گئے۔ ابن سعود مجبوراً پیچھے ہٹا۔ اور کویت پہنچا دیکھا کہ شیخ مبارک اور عبدالرحمٰن شہر کی مدافعت کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ابن رشید بھی تعاقب میں پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ سرزنش کے طور پر بہت سے نجدی دیہات کو خاک سیاہ کرتا آیا۔ صرف شہر بُریدہ میں ۱۸۰ آدمیوں کو پھانسی دیدیا۔ اور بہتوں پر بھاری جرمانے کئے۔ نجد کی بغاوت فرو کرنے کے بعد کویت کی طرف چل پڑا۔ جاہر کے مقام پر کویت کی رہی سہی فوج کو شکست فاش دی پھر کویت کا محاصرہ کر لیا۔ آخر کار انگریزوں نے مداخلت کی۔ ایک جنگی جہاز کویت کی محافظت کیلئے بھیجدیا۔ ابن رشید انگریزوں سے مقابلہ کا یارا نہ رکھتا تھا۔ مجبوراً محاصرہ چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

اس معرکہ سے عبدالرحمٰن کو مزید مایوسی پیدا ہوئی۔ ابھی تک خاندان سعود کی قسمت گردش میں تھی۔

باب چہارم

ریاض کی فتح خاندان آلِ سعود کے دورِ جدید کا افتتاح

صارف کے مقام پر لشکر کویت کو ایسی سخت ہزیمت برداشت کرنی پڑی کہ عبدالعزیز کے خیالات بالکل تبدیل ہو گئے۔ اس جنگ میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ اور آگ کا طوفان برپا ہوا۔ کویت کے لشکر میں عبدالرحمٰن عبدالعزیز کے والد بھی شامل تھے۔ انہیں شکست سے اس قدر صدمہ ہوا کہ انہوں نے ریاض کی حکومت کے حقوق سے اپنے بیٹے عبدالعزیز موجودہ سلطان کے حق میں دستبرداری دے دی۔ اب تک تو عبدالعزیز کا ارادہ صرف ریاض کو فتح ہی کر لینے کا تھا۔ اب خاندان بھر کی تمام ذمہ داریاں اس کے سر پڑ گئیں۔ عبدالعزیز نے پہلے ہی معرکے میں بھانپ لیا تھا۔ کہ اگر کھلے میدان میں آلِ رشید کی افواج کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ تو چپکے سے چھاپہ مارنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ اس ارادہ کو لیکر پھر مشرقی صحرا کی طرف چل پڑا۔ اب کی بار کویت کا لشکر ہمراہ نہ تھا۔ البتہ شیخ مبارک نے رسد باربرداری اور اسلحہ وغیرہ سے پھر امداد کر دی تھی۔ تقریباً چالیس آدمیوں کی جمعیت ساتھ تھی۔ اکثر رشتہ دار تھے۔ ان میں سے عبداللہ بن جلیوی بھی ساتھ تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے زمانہ مابعد میں نہایت شائستہ اور نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ اور اپنے امیر اور عزیز کی وفاداری اور معاونت میں ہمیشہ ثابت قدم رہا۔ آلِ رشید کے حامی سمجھتے تھے کہ عبدالعزیز اس مختصر جمعیت اور معمولی ساز و سامان سے کچھ نہ کر سکیگا۔ لیکن سلطان کا ارادہ یہ تھا کہ یا تو ریاض فتح ہو جائے یا وہ خود میدانِ جنگ میں مر جائے۔ صحرا نوردی کے دوران میں بدوی قبائل کے چند لوگ بھی غنیمت کے لالچ میں شامل حال ہو گئے تھے۔ لیکن جب انہوں نے لوٹ و غارت کا امکان نہ دیکھا تو فرداً فرداً ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبدالعزیز اس وقت فوج جمع نہ کر سکتا تھا۔ نہ تو آدمی ہی مہیا ہو سکتے تھے۔ اور نہ ہی ضروری ساز و سامان۔ کویت سے شیخ مبارک اور عبدالرحمٰن کے

پیغامات مراجعت کیلئے آرہے تھے۔ یہ دونوں سن رسیدہ اشخاص یہ سمجھتے تھے۔ کہ یہ جمعیت آلِ رشید کے ہاتھوں ضرور بالضرور تہہ تیغ کی جائیگی۔ لیکن عبدالعزیز کا ارادہ مستحکم اور بلند تھا عبدالعزیز اس طرح چکر کاٹتے اور صحرا نوردی کرتے دسمبر ۱۹۰۱ء میں جاہات ہرادہ کے قریب پہنچ گیا۔ یہ مقام ریاض کے جنوب میں واقع ہے۔ آلِ رشید کو گمان بھی نہ ہوسکتا تھا۔ کہ عبدالعزیز اس طرف سے حملہ آور ہوگا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ عبدالعزیز آئیگا۔ تو شمال مشرق کی طرف سے۔ اس مقام پر عبدالعزیز کے ذہن میں ایک انوکھی تجویز پیدا ہوئی جنوری ۱۹۰۲ء میں عبدالعزیز اس راستہ پر جارہا تھا جو الحصا سے ریاض کی طرف جاتا ہے۔ ابوجفان نامی چاہات کے قریب اس نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ قرار یہ پایا کہ تقریباً بیس آدمی قریب ہی ایک محفوظ مقام پر چھپ جائیں۔ باقی عبدالعزیز کے ساتھ رات کے اندھیرے میں ریاض کی دوسری سمت کو جائیں۔ اور شہر پر چھاپہ ماریں۔ جبیل کے مقام پر چھپنے والوں کو سمجھا دیا گیا۔ کہ اگر وہ دوسرے دن تک عبدالعزیز کی طرف سے کوئی اطلاع نہ پائیں۔ تو چپکے سے جان بچا کر بھاگ جائیں۔ اور سمجھ لیں کہ عبدالعزیز ہمرائیوں سمیت مارا گیا۔

شہر کے قریب جاکر عبدالعزیز نے ایک تقسیم اور کی۔ اپنے بھائی محمد بن عبدالرحمان کی سرکردگی میں پندرہ آدمیوں کو ٹھہرایا۔ کہ مہم کی کامیابی یا ناکامی کو دُور سے دیکھتے رہیں۔ اور اسکے مطابق عمل کریں۔

۵ جنوری ۱۹۰۲ء کی رات کے اندھیرے میں عبدالعزیز دس جانثار اور آزمودہ کار ہمرائیوں کو ساتھ لیکر ایک کھجور کے درخت کے تنے سے سیڑھی کا کام لیکر شہر کی فصیل پر چڑھ گیا۔ پھر یہ مختصر جماعت آہستہ آہستہ اور پھونک پھونک کے قدم رکھتی ہوئی چند مکانوں کی چھتوں پر سے ہوتی ہوئی حاکم شہر کے مکان کے پاس پہنچ گئی۔ عبدالعزیز نے بڑھکر دروازہ کو زور سے کھٹکھٹایا ایک عورت نے دروازہ کھولا۔ اور کہنے لگی کہ حاکم تو گھر میں نہیں ہے قلعہ میں ہے۔ اور صبح سے پیشتر واپس نہیں آئیگا۔ عبدالعزیز نے بڑھیا کو چُپ کرادیا۔ اور اپنے آدمیوں کو اندر داخل ہونے کیلئے اشارہ کیا۔ گھر کی تمام عورتوں کو جمع کیا گیا اور اُنہیں حکم دیدیا گیا کہ یا تو وہ بالکل خاموش رہیں ورنہ فی الفور اُنہیں تہہ تیغ کردیا جائے گا

مکان کی دوسری منزل میں قلعہ کے چوک کی طرف بڑھاؤ بنا ہُوا تھا۔ عبدالعزیز کے

ساتھی اس بڑھاؤ میں جم گئے۔ اور رات کا بقیہ حصہ جاگتے رہے۔ قہوہ پیا۔ کھجوریں کھائیں اور قرآن خوانی میں مشغول رہے۔

صبح ہوتے ہی قلعہ کے دروازے کھل گئے۔ عبدالعزیز کے آدمیوں نے دیکھا۔ کہ حاکم کے غلام اس کے گھوڑوں کو ٹہلانے کیلئے باہر لا رہے ہیں۔ سب سے آخر میں حاکم خود اپنے باڈی گارڈ کو ساتھ لیکر قلعہ سے نکلا۔ اور گھر کی طرف چل پڑا۔ عبدالعزیز کے اشارہ پر اس کے ساتھی فوراً گھر سے نکلکر حاکم کے ساتھیوں پر یکایک حملہ آور ہوئے۔ اس کھلے چوک میں ریوالور اور تلوار سے فریقین میں لڑائی ہوئی۔ حاکم کے آدمی حملہ آوروں سے تعداد میں تو زیادہ تھے۔ لیکن اتنی جسارت و شجاعت نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ عجلان حاکمِ ریاض چند ہمراہیوں سمیت مارا گیا۔

عجلان نے مرنے سے پیشتر قلعہ کا دروازہ بند کر دئے جانے کا حکم دیدیا تھا۔ چنانچہ غلام دروازہ بند کرنے لگے تھے۔ کہ عبداللہ بن جلیوی نے بھانپ لیا اور بڑی ہمت و جرأت سے غلاموں پر حملہ آور ہو کر انہیں دروازہ بند کرنے سے باز رکھا۔

اس طرح پر جب عبدالعزیز قلعہ میں داخل ہو گیا۔ تو آلِ رشید کی فوج اور شہر کی رعایا نے اظہار اطاعت کیا۔ اور عبدالعزیز شہر پر پوری طرح قابض و متمکن ہو گیا۔

بجلی کی سی تیزی کے ساتھ یہ خبر تمام عرب میں مشہور ہو گئی۔ کہ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آلِ سعود گیارہ برس کی جلاوطنی کے بعد پھر ریاض پر حکمران ہو گیا ہے

باب پنجم

ریاض کی فتح کے بعد

ابن سعود نے شہر ریاض تو فتح کر لیا لیکن علاقہ ابھی تک اس کے پاس نہیں تھا۔ نجد کے دیہاتی اور صحرائی باشندے ابھی تک ابن رشید کی اطاعت میں تھے۔ انہوں نے پہلے بھی اس قسم کے واقعات بارہا دیکھے تھے۔ کہ آج شہر فتح ہوا اور دوسرے دن ہاتھ سے نکل گیا۔ پورے بیس برس سے خاندان سعود ابن رشید سے برابر شکستیں کھا رہا تھا۔ چنانچہ چند سو نفوس تو ابن سعود کے ساتھ شامل ہو گئے۔ لیکن عام لوگ علیحدہ رہے۔ ابن سعود قدیم اور نئے رفقا کیساتھ ابن رشید کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ رشید کے پاس قبائل شمّر کے ہزارہا جنگجو نوجوان تھے۔ اس کی شہرت عام تھی۔ ابن سعود نے مستحکم ارادہ کر لیا۔ کہ بہر صورت ریاض کی محافظت کی جائے۔ اس نے شہر کے استحکامات ایسے طریق پر کر دئے۔ کہ بیرونی حملہ کارگر نہ ہو۔ شہر کی عام آبادی نے اس کام میں مدد دی۔ فصیل بہت سی جگہوں سے گری ہوئی تھی۔ انہوں نے از سر نو تعمیر کر لی۔ شہر کے گرداگرد خندق کھودی۔ برج بنالئے بندوقوں کی باڑ کیلئے فصیل میں سوراخ بنائے۔ سامان رسد جمع کیا۔ ابن رشید کے عہد میں جو اسلحہ زمین میں دفن کر کے چھپا دیا گیا تھا۔ از سر نو برآمد کیا۔ ابن سعود نے شہر کی مدافعت کیلئے عام آبادی میں سے ایک لشکر بھی تیار کر لیا۔

ابن رشید کو جب ریاض کے چھن جانے کا علم ہوا۔ تو اس نے از راہ حقارت کہا۔ کہ بیوقوف میرے جال میں پھنس گیا ہے۔ اب بچکر کہاں جا سکتا ہے۔ اس وقت وہ مصروف تھا۔ اس معاملہ کی طرف توجہ نہ کر سکا۔ اس کے دل میں ابن سعود کی کچھ بھی وقعت اور اہمیت نہ تھی۔ جانتا تھا کہ جب چاہونگا اس بے بضاعت چھوکرے سے نپٹ لونگا۔

لیکن ابن سعود آسانی سے دشمن کے دام میں آنے والا نہ تھا۔ اس کو باقاعدہ عسکری تعلیم نہیں ملی تھی۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اگر کثیر فوج شہر کا محاصرہ کرے تو اس کے لئے شہر کے اندر موجود

رہنا مناسب نہیں ریاض کو محاصرہ برداشت کرنے کے قابل بنا دیا گیا تھا لیکن وُہ خود دشمن کا مقابلہ کھُلے میدان میں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ریاض کی فتح کی اطلاع اپنے والد کو دی اور لکھا کہ ریاض کی حفاظت ان کے سوا کسی اور کے سپرد نہیں کی جاسکتی۔

اطلاع ملنے پر عبدالرحمٰن چُپکے سے کویت سے چل دیے۔ اور اپنے بیٹے عبداللہ کی معیت میں الحصا کے راستہ سے ریاض پہنچے۔ یہ سفر بڑے حزم و احتیاط سے کیا گیا کیونکہ ابن رشید کے خیر خواہ جا بجا موجود تھے۔ اور وُہ خود ریاض پر حملہ کرنے والا تھا۔ ابن سعود نے جلیوی کو ایک سو پچاس آدمیوں کے ساتھ اپنے والد کے استقبال کیلئے بھیجا۔

ریاض کے باشندوں نے عبدالرحمٰن کا استقبال بڑے جوش و خروش سے کیا۔ آمد سے کچھ دنوں بعد عبدالرحمٰن نے شہر کے علماء و مشائخ، عمائد و اکابر کو جمع کیا اور اُنکے سامنے ابن سعود کے حق میں امارت ریاض سے دست بردار ہو گئے۔ نشان کے طور پر اُنہوں نے ابن سعود کو سعود اعظم کی شمشیر عطا کی۔ یہ تلوار پچھلے سو برس سے اس خاندان کے قبضہ میں چلی آتی ہے۔ اور فتح و نصرت کا نشان سمجھی جاتی ہے۔ یہ تلوار نہایت نفیس ہے۔ پھل دمشقی فولاد کا بنا ہُوا ہے دستے پر سونا چڑھا ہُوا ہے۔ اور نیام پر چاندی کا کام کیا ہُوا ہے۔

گو عبدالرحمٰن شجاع اور جنگجو تھے لیکن ابتدائے شباب سے مطالعہ کا شوق رکھتے تھے اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جُوں جُوں عُمر بڑھتی گئی۔ مذہبی شغف زیادہ ہوتا گیا۔ سارا دن قرآن اور حدیث کے مطالعہ میں صرف کر دیتے تھے۔ بسا اوقات مراقبہ کیا کرتے تھے۔ اپنے بیٹوں کی حوصلہ افزائی تو کرتے تھے اور مفید مشوروں سے بھی مستفیض کرتے رہتے تھے لیکن اب خود قیادت کرنا نہ چاہتے تھے۔

ابن سعود بدستور سابق اپنے والد سے بہت تعظیم و تکریم سے پیش آتا۔ نماز کی جماعت میں عبدالرحمٰن امام بنتے اور ابن سعود مقتدی ہوتا۔ ہر معاملہ میں ان سے استصواب رائے کرتا لیکن اب فرمانروائی اور حکمرانی ابن سعود کے ہی ذمّہ تھی۔ اور اسے ہی پورے عرب کے فتح کرنے کی دھن تھی۔

جب شہر کی حفاظت کے انتظامات ہو لئے تو ابن سعود نے اپنے والد کو شہر کی مدافعت

کا ذمہ دار قرار دیا۔ چیدہ سپاہیوں کی ایک جمعیت ساتھ لیکر خود شہر سے چل کھڑا ہوا۔ سواری کا انتظام یہ تھا۔ کہ سو اونٹ اور چالیس گھوڑے پاس تھے۔ اس معرکے میں اس کا بھائی سعد بھی موجود تھا۔ یہ شخص وضع قطع اور عادات واطوار میں ابن سعود سے بہت مشابہ تھا۔ سعد ابھی نوعمر تھا۔ لیکن شانہ نکلتے ہوئے اور جسم توانا تھا۔ حوصلہ مند جنگجو اور وسیع الاخلاق تھا۔ لیکن اس میں ابن سعود کی سی قوت فیصلہ یا ضبط موجود نہ تھا۔

ابن سعود لشکر کو لیکر جنوب کی طرف صوبجات افلج اور خرج میں پہنچا۔ یہاں کے مشائخ دواسیر قبائل کے تھے۔ یہ لوگ اسکی ماں کے مضبوط دل رشتہ دار تھے۔ اور مدت سے خاندان رشید کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے۔

ابن سعود نے بڑی مستعدی سے ایک نظام کے ماتحت کام شروع کیا۔ وہ گاؤں بگاؤں جاتا۔ لوگوں کو آل رشید کے خلاف اکساتا۔ انہیں اسلحہ دیکر مدافعت کی تعلیم کرتا۔ کبھی کبھی دیہاتیوں کی حوصلہ افزائی کیلئے چند آدمی اپنے ہمراہیوں میں سے ان کے پاس بھی چھوڑ جاتا۔

ابن رشید کے سپاہیوں نے ابن سعود کا تعاقب شروع کیا۔ لیکن کبھی بھی اس کے پاس نہ پھٹک سکے۔ ابن سعود ان کے ساتھ لڑنے کیلئے نہ ٹھہرتا۔ بلکہ بڑی سرعت سے آگے نکل جاتا۔ اور وہ دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے۔ انہوں نے دیکھا کہ رفتہ رفتہ علاقہ ہاتھ سے نکلا چلا جاتا ہے۔ اگر وہ کسی گاؤں کے اندر جاتے ہیں۔ تو محصور ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اگر حملہ آور ہوتے ہیں۔ تو دیہاتی مزاحم ہوتے ہیں۔ اور ابن سعود ان کی کمک کو پہنچ جاتا ہے۔ ابن سعود رات کے اندھیرے میں ان کے خیمے وخرگاہ لوٹ لیتا۔ اگر ان کی کوئی جماعت تنہا پیچھے رہ جاتی تو ابن سعود گھیرا ڈال کر اسے تباہ وبرباد کر ڈالتا۔ بعض دیہات انہوں نے فتح بھی کر لئے۔ ابن سعود کو کہیں کہیں زک بھی دی۔ لیکن وہ کبھی حوصلہ نہ ہارتا اور ہمیشہ ان کے پیچھے پیچھے لگا رہتا۔

آخر کار وہ ابن سعود سے خائف ہو گئے۔ اس کی سریع الحرکتی انہیں متحیر کر دیتی تھی۔ اسکی شجاعت وبسالت ضرب المثل ہو گئی تھی۔ اس کے کارنامے زبان زد خلائق تھے۔ جب ابن رشید نے یہ فسانے سنے تو بہت جھنجلایا۔ وہ حکمران تو اچھا نہ تھا۔ لیکن اس کے عمدہ سپاہی ہونے میں کلام نہیں۔ اس نے قبائل شمار میں سے ایک عظیم لشکر تیار کیا۔ اور ابن سعود کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔ جب ریاض کے قریب پہنچا۔ تو معلوم ہوا کہ شہر کی مدافعت کے انتظامات ہو

چکے ہیں۔ اور لامحالہ محاصرہ کرنا پڑیگا۔ ابن رشید محاصرہ کو پسند نہ کرتا تھا۔ وُہ چاہتا تھا کہ جس طرح ابن سعود نے چھ آدمیوں کو ساتھ لیکر ریاض کو فتح کر لیا ہے۔ وُہ بھی بلا محاصرہ کئے شہر فتح کر لے اُسے یہ بھی معلوم ہُوا کہ ابن سعود جنُوب کی طرف گیا ہُوا ہے۔ اور ڈٹ کر مقابلہ کرنے سے ڈرتا ہے وُہ بھی ابن سعود کے تعاقب میں ہو لیا۔ تسرج کے صدر مقام دیلم نے ابن سعود کی اطاعت اختیار کر لی تھی۔ تجویز ہوئی کہ ریاض کا بہانہ رکھکر دیلم پر حملہ کیا جائے۔ ابن رشید کی یہ چال کامیاب رہی۔ وُہ ناجان نامی گاؤں کے پاس جو کہ دیلم سے چار میل کے فاصلہ پر تھا۔ پہنچ گیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ابن رشید نے ارادہ کیا کہ شب بسری کیلئے یہیں ٹھہرے اور صُبح کو دیلم کا رُخ کرے۔

ابن سعود جانب جنُوب بہت فاصلے پر تھا جب اُسے ابن رشید کی آمد آمد کا حال معلوم ہُوا۔ تو وُہ سمجھا کہ فیصلہ کُن وقت آپہنچا۔ ریاض کی فتح نے لوگوں کے دلوں میں اس کی وقعت پیدا کر دی تھی۔ لیکن حقیقی کامیابی کیلئے کھُلے میدان کا معرکہ ضرُوری تھا۔

ابن سعود نے لشکر بھرتی کرنا شرُوع کیا۔ لوگ ابن رشید سے خائف تھے۔ اور مقابلے کے لئے آسانی سے آمادہ نہ ہوتے تھے۔ لیکن ابن سعود کی ترغیب و تحریص دلانے پر اتنا اثر ضرُور ہُوا کہ بعض لوگ اس کے ساتھ شامل ہونے کیلئے تیار ہو گئے۔ اس وقت ابن سعود کی خورد و نوش کا تو کیا ذکر ہے سونے کیلئے بھی فُرصت میسر نہ آتی تھی۔ راستے میں چلتے چلتے کچھ کھا پی لیتا تھا قیام کی مہلت نہ تھی۔

وُہ یلغار پر یلغار کرتا تھا۔ اور فُرصت کے اوقات لوگوں سے بحث و تمحیص میں صرف کرتا تھا۔ ان انتھک کوششوں سے اسکی صحت بھی خراب ہو گئی لیکن اس نے موقعہ کی نزاکت اور وقت کی اہمیت کو سمجھ کر کام کرنا نہ چھوڑا۔ آخر کار ایک ہزار آدمیوں کی جمعیت فراہم ہو گئی۔

یہ جمعیت موضع حوطہ کے قریب قیام پذیر تھی۔ کہ خبر پہنچی کہ ابن رشید ناجان میں مقیم ہے اور دیلم پر حملہ آور ہونے والا ہے۔ حوطہ کا فاصلہ دیلم سے ستر میل کا تھا۔ جو لوگ موقعہ پر موجود تھے۔ اُنہی کو ساتھ لیکر ابن سعود چل پڑا۔ ستر میل کی مسافت راتوں رات قطع کرنی تھی۔ ابن سعود کی اُونٹنی تھکی ماندی تھی۔ اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی تھی۔ ایک جگہ جب ابن سعود نے تیز چلانے کے لئے مہمیز کی تو اُونٹنی چاروں شانے چت گر پڑی۔ ابن سعود بھی گر گیا۔ ایک سانڈنی سوار

پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اُونٹنی کی ٹھوکر سے وہ بھی گرا۔ اس طرح پر چار یا پانچ سوار ایک ہی جگہ گر گئے۔ ابن سعود سب سے پیچھے تھا۔ گارد کے سپاہیوں نے آکر بدقت تمام ابن سعود کو اُٹھایا۔ سخت چوٹیں آئی تھیں۔ اور حواس دُرست نہ تھے۔ جونہی کہ ابن سعود کو ہوش آیا۔ کوچ کا حکم جاری کر دیا۔ ٹھہرنے کا موقعہ نہ تھا۔ تمام رات نہایت سرعت سے چلتے رہے۔ ابن سعود پیچھے رہ جانے والوں کو خود تنبیہ کرتا۔ ان کی جمعیت کو منتشر نہ ہونے دیتا۔ لیکن حالت یہ تھی کہ اسکے سارے جسم میں سخت درد ہوتا تھا۔ لیکن اس نے اپنی تکلیف کا اظہار نہ کیا۔ ابھی اندھیرا ہی تھا کہ یہ لشکر دلم پہنچ گیا۔ دلم کے جانب شمال کھجوروں کے جھنڈ تھے۔ ابن سعود نے لشکریوں کو یہاں ٹھیرایا۔ اور خود شہر کے اندر داخل ہُوا۔ شہر کے دروازے بند کر دئے گئے۔ اور فصیل پر پہرہ چوکی مقرر ہو گیا۔

اس کے بعد ابن سعود کو ضعف آگیا۔ اس نے ہمت سے زیادہ مشقت اُٹھائی تھی۔ پچھلے سات دنوں سے متواتر اُونٹنی پر سوار رہا تھا۔ کھجوروں کے سوا اور خوراک نہ تھی۔ ہفتہ بھر میں سونے کا اتفاق نہ ہُوا تھا۔ اس کے سپاہی اسے ایک گھر کے اندر لے گئے۔ اسکے جسم پر زور زور سے تیل کی مالش کی۔ ابن سعود ظہر کی نماز تک سوتا رہا۔ جب بیدار ہُوا تو جسم میں اینٹھن اور درد باقی تھا۔ لیکن پھر بھی استراحت کی وجہ سے قدرے تازہ دم ہو چکا تھا۔

جب اگلے دن کی صبح ہوئی۔ تو ابن رشید سپاہ کو لیکر شہر کی طرف بڑھا۔ جونہی کہ لشکر کھجوروں کے جھنڈ کے قریب پہنچا۔ ابن سعود نے گولی چلانے کا حکم دیدیا۔ دشمن کے چار گھوڑے اور چھ آدمی تلف ہو گئے۔ اور اُسے پسپا ہونا پڑا۔ ابن رشید نے پھر پہلے سے بڑھکر تعداد میں فوج روانہ کی لیکن پھر دوبارہ ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ اب وہ سمجھا کہ اس کے مقابلہ میں صرف اہالیان دلم نہیں بلکہ منظم سپاہ ہے۔ تمام دن چھوٹے چھوٹے دستے روانہ کرتا رہا۔ تاکہ دشمن کی تعداد اور صحیح کیفیت معلوم ہو جائے۔ لیکن ابن سعود نے بڑی ہشیاری سے اپنے آدمیوں کو روکے رکھا۔ اس نے ہر ایک قبیلہ کے آدمیوں کیلئے ایک مخصوص جگہ متعین کر دی تھی۔ اور تاکیدی حکم صادر کیا تھا کہ وہیں چھپے رہیں۔ بغرض یہ تھی کہ دشمن کو حملہ کرنے پر جرأت دلائی جائے۔

فوجی انتظامات سے فارغ ہو کر ابن سعود شہر میں واپس آگیا۔ وہ کھانا کھا رہا تھا۔ کہ طبل جنگ پر ڈنکا پڑا۔ وہیں کھڑا ہو گیا۔ اور گارد کے سپاہیوں کو ساتھ لیکر دیہات کی طرف چلا پیدل

سپاہ قلب میں تھی میمنہ اور میسرہ پر شتر سوار تھے۔

ابن رشید ہزیمت پر ہزیمت اُٹھا کر تنگ آچکا تھا۔ اور ایک ہی حملہ میں قطعی فیصلہ کر دینا چاہتا تھا۔ اس کی فوج دو رویہ قطار میں بڑے طمطراق سے بڑھ رہی تھی۔ ابن سعود نے ابھی تک فائر کرنے کا حکم نہ دیا تھا۔ اس کی سپاہ نے عجب طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا تھا۔ وہ جوش وخروش کے ساتھ حملہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ابن سعود اس تاک میں تھا۔ کہ دشمن اپنی قیامگاہ سے کافی دور نکل آئے تو جنگ شروع ہو۔ جونہی کہ اس نے فائر کا حکم دیا۔ بیشمار گولیاں فضائے آسمانی کو چیرتی دشمن کی طرف گئیں۔ ابن رشید متحیر تھا۔ کہ دشمن کی تعداد میں اتنا معقول اضافہ کہاں سے ہو گیا۔ وہ ابھی اسی تامل میں تھا۔ کہ ابن سعود نے یکلخت بڑے زور شور سے حملہ کر دیا۔ اور دشمن کی صفیں اُلٹ دیں ابن رشید کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اس کی فوج میدان جنگ سے بے ترتیبی سے بھاگی۔ ابن سعود نے تعاقب کیا۔ اور بہت دُور تک دبا تا چلا گیا۔ ابن رشید کے سینکڑوں آدمی میدانِ جنگ میں کھیت رہے۔ بہتوں کا دوڑ دھوپ میں خاتمہ ہوا۔ قلیل تعداد بھوک پیاس اور تعاقب کی صعوبتوں سے بچکر حائل پہنچی۔

بجلی کی سی سرعت سے یہ خبر تمام عرب میں پھیل گئی۔ برسوں میں یہ پہلی فتح تھی۔ جو کہ خاندان سعود کے ایک فرد کو ابن رشید کے مقابلے میں حاصل ہوئی۔ حرج اور افلاج کے صوبوں میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ باغیوں نے ابن رشید کی فوج کو مار مار کر بھگا دیا۔ اس طرح پر تمام جنوبی نجد میں ابن سعود کا تسلط بیٹھ گیا۔

بیان ہو چکا ہے۔ کہ ابن رشید بھی حوصلہ مند شخص تھا۔ ہمت نہ ہارا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اقتدار کی بحالی کیلئے جنگ کرنا نہایت ضروری ہے اور جنگ بھی جلد از جلد ہونی چاہیئے۔ تاکہ ابن سعود مزید طاقت نہ پکڑ سکے۔ جونہی کہ حائل پہنچا۔ اس نے ایک نیا لشکر مرتب کر لیا۔ اور کویت کی طرف حملہ کرنے کا بہانہ کیا۔ شیخ مبارک والئے کویت نے ابن سعود سے امداد طلب کی۔ وہ پہلے ہی ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ ریاض سے ایک لشکر جرار ساتھ لیکر کویت کی جانب چل پڑا۔ ابن رشید کی خواہش بھی یہی تھی۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ ریاض کے جنگجو شہر سے باہر چلے جائیں۔ تو وہ حملہ آور ہو چنانچہ موقعہ پاتے ہی جنوب کی طرف مُڑا۔ اور ریاض کی طرف یلغار کر دی عبدالرحمن پہلے سے ہی مدافعت

کیلئے تیار تھے۔ ابن رشید نے لاکھ زور مارا۔ لیکن شہر کے اندر داخل نہ ہو سکا۔

جب ابن سعود کو ان حالات کا علم ہُوا۔ تو وُہ ریاض کی طرف واپس نہ لوٹا۔ بلکہ مغرب کی طرف ابن رشید کے راستے کو روکنے کی فکر کرنے لگا۔ اور اس کے علاقے کے بہت سے گاؤں لوٹ لئے۔ قبیلہ شمار کے لوگوں کو جب اپنے دیہات کی یہ دُرگت معلوم ہوئی۔ تو ابن رشید کی فوج چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونے لگے۔ ابن رشید کی فوج چند دنوں میں برف کے تودے کی طرح بہہ گئی۔ ابن سعود نے موقعہ غنیمت جان کر بہت سا علاقہ فتح کر لیا۔ شقرہ۔ تامیدہ اور طاوق وغیرہ قصبات میں ابن رشید کی جو مقامی افواج موجود تھیں۔ ابن سعود کی آمد آمد سنکر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ اور ان قصبات کو قطعاً غیر محفوظ حالت میں چھوڑ گئیں۔ ابن سعود نے لگے ہاتھوں ان پر قبضہ کر لیا۔ ریاض سے پچاس میل تک جانب شمال کا علاقہ ریاض کی سلطنت میں آ گیا۔

ان فتوحات سے ابن سعود کی حیثیت میں نمایاں اضافہ ہُوا۔ اب نجد کا نصف سے زیادہ حصہ اس کے زیر نگیں تھا۔ اس کی شہرت ملک میں پھیل چکی تھی۔ وہ ابن رشید ایسے ہیبتناک امیر کو شکست دے چکا تھا۔ کافی فوج مہیا تھی۔ اور روز افزوں ترقی پر تھی۔

۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء میں ابن سعود اور ابن رشید بار بار دست و گریبان ہوتے رہے۔ ہر معرکہ میں ابن سعود مدمقابل سے بڑھکر رہا۔ ۱۹۰۳ء کے شروع میں قحط اور خشک سالی کی انتہا ہو گئی۔ اور فریقین نے تنگ آکر جنگ سے ہاتھ اُٹھایا۔

حقیقت میں اب سلطنت کیلئے جنگ نہ تھی۔ بلکہ ابن سعود اور ابن رشید کا ذاتی عناد بہت بڑھ گیا تھا۔ اور اب اُن کی ذاتی جنگ تھی۔ رشید قبیلہ شمار کے لوگوں پر بھروسا کر سکتا تھا۔ اور ریاض اور اس کے گرد و نواح کے لوگ ابن سعود کے حامی کار تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے قبائل جنگ میں شرکت تو کرتے تھے۔ لیکن کسی ایک فریق کیلئے بھی وفادار نہ تھے۔ مطیر۔ حرب عتیبہ۔ عجمان کبھی ابن رشید کی طرف ہو جاتے تھے۔ اور کبھی ابن سعود کی طرف۔ جونہی کہ ایک فریق کو خفیف سی شکست ہوئی۔ یہ لوگ بدعہدی پر تُل گئے۔ ایک فوج ہزیمت اُٹھا کر پسپا ہوئی اور یہ دغاباز صحرائی اپنی ہی فوج پر حملہ آور ہو گئے۔ عرب میں باقاعدہ فوج کا نظام نہیں ہے۔

بوقت ضرورت مختلف قبائل سے لوگ بلا لئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ ایسے حالات میں امیر کی ذاتی شخصیت کے علاوہ کامیابی کی اور کوئی ضمانت نہیں ہے

ابن رشید ٹھگنے قد کا سیاہ فام منحنی سا آدمی تھا۔ سخت مزاج۔ کینہ ور اور قدرے بد تمیز واقع ہوا تھا۔ اس میں تحمل و ضبط نام کو بھی نہ تھا۔ اور نہ ہی قبائل سے معاملہ کرنا جانتا تھا۔ وہ زور بازو کے سوا اور کسی طاقت کا قائل نہ تھا۔ زور سے ہی حکومت کرتا تھا۔ لوٹ مار کیلئے جنگ کرتا تھا۔ اور علاقے کے علاقے تباہ و برباد کر دیتا تھا۔

ابن سعود فیاض طبیعت اور فراخدل تھا۔ اور بے انتہا تحمل اور بردباری رکھتا تھا۔ قبائل کے لوگوں کو پرچا لینے کا خداداد ملکہ رکھتا تھا۔ شجاعت اور بسالت میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔ اس میں زبردست خود اعتمادی موجود تھی۔ اور وہ یقین رکھتا تھا کہ اسکی خلقت ہی اس لئے ہوئی ہے۔ کہ خاندان سعود کو کامیاب و بامراد کر دے۔ جو علاقے وہ فتح کرتا تھا۔ ان کی فلاح و بہبود میں منہمک رہتا تھا۔ یہ وہ خصائل تھے جنکو عرب دل سے محبوب رکھتے تھے۔

۱۹۰۳ء کے آواخر میں جبکہ بارشیں ہو گئیں اور قحط جاتا رہا۔ وہ لشکر ساتھ لیکر شمال کی طرف چلدیا۔ حائل اور اسکے درمیان قاسم کا جو کہ نجد کا ہی ایک حصہ ہے۔ زرخیز صوبہ پڑتا تھا۔ بریدہ اور انیزا نجد کے دو مشہور شہر یہیں واقع ہیں۔ یہ صوبہ ابتک ابن رشید کے زیر حکومت تھا۔ لیکن اس کے باشندے دل و جان سے ابن سعود کے فریفتہ تھے۔ ابن سعود بلا مزاحمت اس صوبہ پر قابض ہوتا چلا گیا۔ ابن رشید ریاست حائل کے شمال میں شمّار کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھا۔ ابن سعود نے اس علاقے کے رشیدی حاکم حسین جرید کو شکست دیکر جان سے مار ڈالا۔ انیزا فتح کر لیا۔ اور بریدہ کے گرد گھیرا ڈال کر محاصرہ کر لیا۔ یہ شہر محافظت کا سامان رکھتا تھا۔ یہاں ابن رشید کی کچھ سپاہ بھی موجود تھی۔ سپاہ شہر کے دروازے بند کر کے محصور ہو کر بیٹھ گئی۔

ابن رشید نے یہ خبر سن کر ایک لشکر تیار کیا۔ اور عبید نامی اپنے ایک عزیز کی قیادت میں بریدہ کی حفاظت کیلئے بھیجا۔ ابن سعود راستہ میں ہی اس لشکر پر جا پڑا۔ اور شکست فاش دی شمّار کے لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ عبید گرفتار ہو گیا۔ ابن سعود گھوڑے پر سوار تھا۔ جبکہ عبید اس کے حضور میں پیش کیا گیا۔ ابن سعود نے دریافت کیا کہ کیا یہ وہی عبید ہے جس نے اس کے چچا محمد کو ریاض میں

قتل کیا تھا! پھر وہ گھوڑے پر سے اترا اور وہ تلوار جو اس کے والد نے عطا کی تھی۔ اور جس کو ہر وقت وہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ نیام سے نکالی۔ عبید نے کہا۔ کہ یا ابو ترکی مجھے قتل نہ کرو۔

ابن سعود نے جواب دیا۔ کہ رحم کا کوئی موقعہ نہیں ہے۔ یہ عین انصاف ہے۔ کہ تمہیں قتل کے بدلے قتل کر دیا جائے۔

یہ کہکر شمشیر کی ایک دو ضربوں میں بیچارے کا کام تمام کر دیا۔ پھر تلوار کی دھار کو بوسہ دیا۔ اور صاف کر کے نیام میں کر لیا۔

بریدہ کی سپاہ نے جس کو اب کمک کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ ہتھیار ڈال دئے۔ قاسم کے سارے صوبے نے ابن سعود کی اطاعت اختیار کر لی۔ اب پورا نجد ابن سعود کے تسلط میں تھا۔ اور قدیم آبائی سلطنت کا کوئی حصہ دشمن کے پنجے میں نہ رہا تھا۔

جب ابن سعود ریاض میں واپس پہنچا۔ تو وہاں کی آبادی نے بیحد مسرت کا اظہار کیا۔ بڑے بڑے خشک مزاج وہابی استقبال کیلئے شہر سے باہر آئے۔ فاتحین کا جلوس نکالا گیا۔ جامع مسجد میں علماء و مشائخ اور رؤسا و اکابر نے جمعہ کی نماز کے بعد باقاعدہ طور پر ابن سعود کو نجد کا امیر اور وہابیوں کا امام قرار دیدیا۔

باب ششم

محمد ابن عبدالوہاب اور تحریک وہابیت

ابن سعود کی سلطنت و سطوت کا دار و مدار وہابی آبادی پر ہے۔ اسلئے اس کے گرد و پیش کے حالات۔ وہابیوں کے خصائل و خصائص عادات و اطوار اور جذبات و احساسات کے سمجھنے کیلئے ناگزیر ہے۔ کہ دور جدید کی اس تحریک کے قائد اعظم کے سوانح حیات ذہن نشین کر لئے جائیں۔

نجد کی مشہور و معروف وادی حنیفہ میں آج سے تیرہ سو برس پیشتر مسیلمہ کذاب نے خروج کیا تھا۔ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ اس واقعہ سے تقریباً

گیارہ سو برس بعد اسی وادی میں شیخ محمد ابن عبدالوہاب ظہور پذیر ہوئے۔ جنہوں نے مسلمانوں کو مشرکانہ رسومات چھوڑنے کی تلقین کی۔ اور مذہب اسلام میں مابعد کی ایزادیوں اور بدعتوں کا قلع قمع کردینا چاہا۔ شیخ سے پیشتر نجد کے مسلمانوں کی مذہبی کیفیت مسخ ہو چکی تھی طرح طرح کے خیالات سے یہ لوگ متاثر ہو چکے تھے۔ بعض بدوی صابی رسوم اختیار کر چکے تھے۔ اور بعض قرامطہ کی بدعات رسول مقبول صلعم کے اسلام سے یہ لوگ کوسوں دور تھے۔ مزارات اور قبوں کی پرستش کرتے تھے چٹانوں اور درختوں سے منتیں اور مرادیں مانگتے تھے۔ اگر کبھی کبھی نماز پڑھتے تھے۔ تو خدا کے بندوں کو بھی خدا کے ساتھ شامل کر لیتے تھے۔ قرآن مجید کو نہیں پڑھتے تھے۔ اور نماز۔ زکوٰۃ وغیرہ حقیقی شعائر اسلامی کو ترک کر چکے تھے۔ مؤرخین کا یہ خیال ہے۔ کہ اس زمانے میں نماز اور حج تو ایک طرف اکثر لوگوں کو کعبہ کی سمت بھی معلوم نہ تھی۔ یقیناً ان لوگوں میں بعض علماء اور مشائخ بھی ہوتے تھے۔ جو کہ عام طور پر حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کی فقہ کے قائل تھے۔ بالعموم ملاؤں کی قیل و قال اور صوفیوں کے لاینحل رموز و غوامض میں مصروف رہتے تھے۔ قوم کی بگڑی ہوئی حالت کی اصلاح نہیں کرتے تھے

اس قسم کے علماء میں سے شیخ محمد بن عبدالوہاب کے دادا بھی تھے۔ جو کہ بنی تمیم کے مشہور معروف قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور متبحر عالم ہونے کے علاوہ انصاف اور سخاوت میں دور و نزدیک مشہور و معروف تھے۔ وہ اپنے وقت میں نجد کے شیخ الاسلام تھے اور تفسیر و حدیث کا درس بھی دیتے تھے۔ ان کا دروازہ ہر حاجت مند کیلئے کھلا رہتا تھا۔ پوچھنے والے مسائل دریافت کرتے۔ طالب علم علم حاصل کرتے۔ اور فقرا و مساکین جھولیاں بھر بھر کر خیرات لے جاتے

اسی طرح پر شیخ عبدالوہاب عالم و فاضل ہوتے ہوئے فیاض اور مخلص تھے۔ وہ الاریہ کے مختلف شہروں میں بطور قاضی کام کرتے رہے مذہب اسلام اور فقہ پر متعدد کتابیں تصنیف کیں اور اپنے لڑکے شیخ محمد کو بھی خود تعلیم و تدریس کرتے رہے۔ ان میں بڑی خوبی کسر نفسی کی تھی۔ جو کہ بڑے عالموں میں ضرور ہونی چاہیئے۔ ایثار نفس کی یہ حالت تھی۔ کہ بسا اوقات کہا کرتے تھے۔ کہ میں نے اکثر اہم امور میں اپنے بیٹے کی تجویز پر عمل کیا ہے۔

محمد ابن عبدالوہاب ابن محمد ابن عبدالوہاب ابن سلیمان ابن علی تمیمی ۱۷۰۳ء عیسوی

بمطابق ۱۱۱۵ھ بمقام عیینیہ جو کہ جنوبی نجد کی وادئ حنیفہ میں واقع ہے۔ پیدا ہوئے۔ شروع سے ہی بیحد ذہین اور صحت ور تھے۔ دس برس کی عمر میں کلام اللہ ختم کر چکے تھے۔ انکے والد کا بیان ہے کہ بارہ برس کی عمر میں وہ بلوغت کو پہنچ گئے تھے۔ اسی سال ان کی شادی کر دیگئی۔ بعد ازاں انہوں نے حج کیا۔ اور مدینہ منورہ کی زیارت کی پھر اپنے وطن مالوف کو واپس آکر اپنے والد ماجد سے فقہ امام احمد بن حنبلؒ کی تعلیم شروع کی۔ طالب علمی کی غرض سے متعدد بار حجاز میں گئے۔ اور بصرہ میں جاکر حدیث اور فنون لسان کی تحصیل کی اور کثیر مطالعہ کیا۔

شیخ بصرہ میں نہ صرف تحصیل علم کرتے رہے بلکہ توحید کی تبلیغ واشاعت بھی کرتے رہے۔ شیخ کہتے ہیں۔ کہ بعض مشرک میرے پاس آتے۔ مسائل دریافت کرتے اور میرے جواب دینے پر دم بخود اور مبہوت رہجاتے ہیں کہتا کہ صرف خدا پرستش کے لائق ہے۔ اولیاء اللہ اور خدا کے نیک بندوں کا احترام واجب ہے لیکن ہم نماز صرف خدا کی پڑھتے ہیں اور اسی سے دعا مانگتے ہیں۔ ہم اولیاء اللہ کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور انکی تقلید کرتے ہیں۔ لیکن دعائیں اور مرادیں صرف خدا سے مانگتے ہیں۔

بصرہ سے جب وہ عیینیہ کو واپس آئے۔ تو انہوں نے بڑی گرمجوشی سے اپنے خیالات کی تبلیغ شروع کی اور لوگوں کو بیہودہ رسومات اور گمراہ کن طریقوں سے بچنے کی ہدائت کرنے لگے۔ اس پر بہت سے لوگ ان کے جان نثار اور بہت سے جانی دشمن ہو گئے۔ اسی حالت میں انہوں نے اپنی پہلی کتاب "کتاب التوحید" تصنیف کی۔

اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ نجد کے لوگوں کی توہم پرستی اس قدر بڑھ گئی تھی۔ کہ اولاً انہوں نے ولیوں کی اسقدر تعظیم کی کہ عبادت کے درجہ تک پہنچ گئے۔ بعد ازاں انکے مزاروں کی پرستش شروع کی پھر یہانتک عقیدہ نے غلو کیا۔ کہ ان کے مزاروں کے درخت اور دیگر چیزیں متبرک اور مقدس ٹھیریں۔ قرب و جوار کے لوگ آتے۔ منتیں مانتے اور دعائیں مانگتے۔

شیخ محمد ابن عبدالوہاب کا پہلا قابل ذکر ہمخیال عثمان ابن معمر والئ عیینیہ تھا۔ شیخ نے اس سے حلف لیا کہ وہ ان مزاروں اور متعلقات کو ختم کرنے میں امداد دیگا۔ ابن معمر نے قبول کیا۔ دونوں ہمراہ ہو کر جبیلہ گئے۔ یہاں چند صحابیان رسول صلعم کے مزارات تھے۔ دونوں نے

مزارات مسمار کر دئے۔ درخت کاٹ ڈالے۔ شیخ نے اپنے ہاتھ سے ایک درخت جس کو ابو دجانہ کہتے تھے کلہاڑی سے کاٹ دیا۔ اس درخت سے عوام کو بیحد عقیدت تھی۔ تمام وادی حنیفہ میں اس واقعہ سے ہیجان پیدا ہو گیا۔

دوسرا واقعہ ایک عورت کے متعلق پیش آیا۔ قرآن کریم میں زانیہ کی سزا سنگساری ہے۔ عیینیہ کی ایک عورت پر زناء کا الزام دیا گیا۔ مقدمہ کی سماعت ہونے پر الزام پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا۔ چنانچہ قرآن مجید کے احکام کے مطابق شیخ محمد بن عبدالوہاب نے رجم کی سزا تجویز کی۔ عثمان ابن معمر والئے شہر نے زانیہ کو اپنے ہاتھ سے پہلا پتھر مارا۔ اس واقعہ سے عوام میں شیخ سے نفرت اور خوف کے جذبات پیدا ہو گئے۔ الحصاء کے باشندے اپنی بداعتقادیوں میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ سلیمان والئے الحصاء نے جو کہ عیینیہ کا بادشاہ بھی تھا۔ اور عثمان ابن معمر اس کے ماتحت تھا حکم دیا کہ شیخ محمد ابن عبدالوہاب اپنے وعظ و ارشاد سے باز رہے۔ اور مسلمانوں کے مذہب کو خراب نہ کرے۔ پادشاہ کے اس حکم کے موصول ہونے پر عثمان ابن معمر نے بریت کیلئے شیخ کو عیینیہ سے بھگا دیا۔

عیینیہ سے شیخ درعیہ میں پہنچے اور اپنے ایک شاگرد ابن سویلم کے ہاں مقیم ہوئے۔ ابن سویلم نے امیر محمد ابن سعود والئے درعیہ کی مدد حاصل کر دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن امیر درعیہ شروع میں رضامند نہ ہوا اس کے بھائی جو اس عرصہ میں شیخ کے بیحد مداح ہو گئے تھے۔ اور بعد میں اس کے بہترین مؤید ثابت ہوئے۔ امیر کو شیخ کی متابعت کیلئے ترغیب دیتے رہے۔ آخر شہ امیر کی عقلمند اور ہوشیار بیگم امیر کی مدد کیلئے ساعی ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امیر بھی شیخ کا معترف ہو گیا۔

امیر اور شیخ میں مودت اور موالفت کے اقرار ہوئے۔ چنانچہ تلوار ابن سعود کی تھی اور مذہب شیخ محمد بن عبدالوہاب کا۔ آج اس واقعہ کو دو سو برس گذر چکے ہیں۔ کہ یہ تعلق اور اشتراک عمل قائم ہے۔

معاہدہ کے وقت شیخ محمد بن عبدالوہاب کی عمر ۴۲ سال کی تھی۔ اسی سال شیخ نے توحید کے اجراء و نفاذ کیلئے مشرکین کے خلاف جنگ کر دی۔ پہلا معرکہ ریاض موجودہ دارالسلطنت کے مقام پر امیر ریاض ابن دواس اور ابن سعود کے درمیان پیش آیا۔ ابن دواس سعودی وہابی اشتراک کے سخت مخالف تھا۔ وہ معمولی غلامی کی حالت سے امارت کے رتبہ تک پہنچا تھا اور اپنی شمشیر

کے شروع میں امیر ابن سعود سے مدد حاصل کرکے رہینِ منّت ہو چکا تھا۔ اس بات کے بھروسہ پر امیر ابن سعود نے ابن دوّاس کو شیخ کی متابعت کیلئے دعوت دی۔ لیکن ابن دوّاس نجد کے کسی شیخ یا امیر کی متابعت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ابن دوّاس میں بڑی خوبی اسکی طبیعت کا استحکام و استقلال تھا۔ پورے تیس برس ابن سعود سے برسر پیکار رہا۔ کبھی فتح پاتا تھا کبھی شکست۔ لیکن کبھی ہمّت نہ ہارا۔ پھر بھی رفتہ رفتہ امیر سعود نے ریاض کے علاوہ اس کی مملکت کے دیگر علاقہ جات فتح کرلئے۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب اپنے متابعین کی جرأت کو بڑھاتے اور ان کے ایمان کو تازہ کرتے رہے۔ اسی طرح پر غیر فیصلہ کن جنگوں کا سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ عبدالعزیز ابن امیر محمد بن سعود نے ۱۷۷۳ء میں ریاض کو فتح کرلیا۔ مگر ابن دوّاس کو گرفتار نہ کرسکا۔ کیونکہ وُہ ہزیمت اٹھا کر صحرا میں بھاگ گیا تھا۔ اندازہ کیا گیا ہے۔ کہ اس بتّیس۳۲ سالہ جنگ میں ۰۰ ۷ موحّدین مارے گئے۔ اور ۰۰ ۳ ۲ نام نہاد مشرکین گویا ۰۰۰ ۴ عرب ناحق ضائع ہوئے۔

الحصا کا امیر جو سلیمان سابق امیر کا جانشین تھا۔ بڑے کرّوفر سے سعودی طاقت پر حملہ آور ہوا۔ وُہ اپنے ساتھ شُتری توپیں لایا۔ جو کہ درعیہ کے محاصرہ میں استعمال کی گئیں۔ اس کے ساتھ ایک قسم کی گاڑی بھی تھی جس میں تیس۳۰ سپاہی بیٹھ کر بیک وقت شہر کی فصیل پر حملہ آور ہو سکتے تھے نجد کے بعض قبائل بھی اسکے ساتھ ہو گئے تھے لیکن الحصا کے امیر کو باوجود ساز و سامان شکست ہوئی۔ اور وہ مغموم و محزون اپنے علاقے کو واپس ہؤا۔ پھر اس نے اور زیادہ توپ خانہ دے کر اپنے بیٹے سعدون کو یمامہ پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا۔ لیکن وُہ بھی شکست کھا کر ناکام پھرا اور توپ خانہ مخالف کی نذر کر تا گیا۔ اس طرح پر اس نے ایک حملہ بریدہ پر بھی کیا جس میں پھر اُسے شکست ہوئی لیکن ابن سعود کو بھی ایک نقصان ان لڑائیوں سے یہ ہوتا رہا۔ کہ وہ قبائل جو بنوک شمشیر موحّد کئے گئے تھے دشمن کی آمد آمد سن کر ابن سعود اور شیخ دونوں سے باغی ہو جاتے تھے۔ اور حملہ آور سے نپٹتے ہی باغیوں کی سرکوبی کیلئے حکومت کو مصروف ہونا پڑتا تھا۔ آئے دن کی بغاوتوں سے سعودی طاقت ضائع ہو رہی تھی۔

محمد ابن سعود کا انتقال ۱۷۶۵ء میں ہؤا۔ اور اس کا بیٹا عبدالعزیز جانشین ہؤا۔ باپ کے

وقت میں یہ بڑا مستعد مجاہد تھا خود امیر ہونے پر سال میں چھ چھ مرتبہ غزوات کرتا رہا۔ لیکن اس کا بیٹا سعود باپ سے بھی زیادہ گرمجوش ثابت ہوا۔ اس نے اپنے والد کی اجازت کے بغیر نجف اشرف اور کربلی معلّی پر حملے کئے۔ اور وہاں کے مزارات مقدسہ کو تہہ وبالا کر دیا۔ لوٹ وغارت کا تو کچھ حساب ہی نہ تھا۔ ان مقامات پر اہل نجد کی طرف سے بید بداعتدالیاں اور گستاخیاں سرزد ہوئیں ۱۸۰۳ء بمطابق ۱۲۱۸ھ ہجری میں ایک شیعہ درعیہ میں آیا۔ اور جب کہ سلطان عبدالعزیز مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اس کو قتل کر دیا۔

سعود پندرہ برس پیشتر اپنے والد کا جانشین قرار پا چکا تھا چنانچہ محمد ابن عبدالوہاب کی مدد اور عوام کے دوبارہ انتخاب سے سعود امام نجد قرار پایا۔ شیخ محمّد عبدالوہاب ابتک زندہ تھے۔ اور سعود بن عبدالعزیز کے کارنامے اور اپنے معتقدات کی اشاعت کو روزافزوں ترقی پر دیکھ رہے تھے۔ ابن سعود نے عرب کے دور و دراز صوبوں پر ترکتازیاں کیں۔ اور اپنی سلطنت کو وسیع کیا۔ وہ یمن اور عسیر سے لیکر عمان۔ الحصا اور شمّار تک پہنچا۔ آخر کار ۱۸۰۱ء میں وہ بحیثیت فاتح مکہ مکرمہ میں داخل ہو گیا لیکن شیخ محمد بن عبدالوہاب اس واقعہ سے دس برس پیشتر یعنی ۱۷۹۱ء بمطابق ۱۲۰۶ھ ہجری میں فوت ہو گئے تھے۔

شیخ محمد بن سعود کی پہلی ملاقات کے بعد وفات تک پورے پچاس برس کا عرصہ درعیہ میں ہی رہے اس عرصہ میں درعیہ نہ صرف نجد بلکہ پورے عرب میں سب سے بڑا شہر ہو گیا۔ شیخ اپنی زندگی کے آخیر تک یکساں ہمت و جوش کے ساتھ اپنے خیالات کی اشاعت کرتے رہے۔ شیخ الاسلام کی حیثیت سے اصلاح و تنظیم کا کام کرتے رہے۔ اور مذہبی تعلیم و تدریس بھی جاری رکھی۔ گرد و نواح کے شہروں قریوں اور قبائل میں اپنے فارغ التحصیل طُلبا کو تبلیغ کی غرض سے بھیجا کرتے تھے۔

شیخ۔ امام احمد بن حنبلؒ کی فقہ کے قائل تھے۔ اور امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کے خیالات کے سخت مدّاح تھے۔ امام احمدؒ اسلام کا اصل الاصول قرآن کو جانتے تھے۔ یہاں تک ان کا دیگر آئمہ رحمتہ اللہ علیہم سے اتفاق رائے تھا۔ وہ بھی قرآن کو ہی اصل اسلام سمجھتے تھے لیکن قرآن کی تفسیر اور تصریح اور استناد مسائل کے بارے میں اجتہاد سے اختلاف کرتے تھے۔

قرآن کے بعد درجہ احادیث و سنّت رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا ہے۔ امام احمدؒ بن حنبل

نے صرف اُن احادیث کو صحیح اور معتبر تسلیم کیا ہے۔ جو کہ صحاح ستّہ کی ہر ایک کتاب میں مرقوم ہیں۔ اسی بنا پر انہوں نے اپنی کتاب موطا امام احمد حنبلؒ مرتب کی تھی۔ امام ابن تیمیہ بھی حنبلی تھے شیخ محمد بن عبدالوہاب نے بھی امام احمد حنبلؒ کا راستہ اختیار کیا۔ محمد بن عبدالوہاب بھی اپنے آپ کو حنبلی کہلاتے تھے۔ آج کل کے بہت سے روشن خیال وہابی اپنے آپ کو حنبلی ہی کہلانا مناسب خیال کرتے ہیں۔

اس کتاب کا مقصد وہابی اور دیگر مذاہب کا موازنہ کرنا نہیں ہے۔ اسلئے شیخ محمد بن عبدالوہاب کے عقائد کی مفصل و مشرح کیفیت بیان نہیں کی گئی۔ نہ ہی ان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے حالات زندگی سمجھنے کیلئے محمد بن عبدالوہاب کے سوانح حیات اور تحریکِ وہابیت کا مختصر ذکر ناگزیر ہے۔ اسلئے اختصار کے ساتھ شیخ کے حالاتِ زندگی قلمبند کر دئے گئے ہیں۔ جہانتک ممکن ہوسکا۔ تحریر میں مورخانہ دیانت کو قائم رکھا گیا ہے۔

بابِ ہفتم

خاندان سعود کی سیاسی زندگی پر ایک اجمالی نظر

پچھلے باب میں اس نظریہ کی ایک عملی مثال کا ذکر آچکا ہے۔ کہ عرب میں کوئی سلطنت مذہبی بنیادوں کے بغیر مدت تک قائم نہیں رہ سکتی۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ سلطنت کے قیام کے لئے کم از کم تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ مذہبی جوش۔ سیاسی تدبر اور اقتصادی فلاح۔ اس باب میں بیان ہوگا۔ کہ خاندان سعود کے دورِ اول کے زوال کا سبب نہ تو عصبیت مذہبی کا فقدان تھا۔ اور نہ ہی حکمرانوں کی نالائقی۔ بلکہ تباہی و بربادی کا بڑا سبب یہ تھا۔ کہ سعودی فرمانروا اقتصادی مشکلات کا حل تلاش نہ کر سکے تھے۔

گذشتہ باب میں بیان ہوچکا ہے۔ کہ ابتدائی ایام میں عربوں نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوتِ اصلاح و اتباعِ سنّت کو بہ نظر استحسان نہ دیکھا۔ لیکن تحریک وہابیت کے سب سے بڑے دشمن

بلاشک وشبہ ترک تھے۔ عام طور پر معلوم ہے۔ کہ اس زمانے میں ترکوں کا سیاسی اقتدار پورے عرب پر قائم تھا۔ اور حرمین الشریفین کے خادم بھی اس وقت ترک ہی تھے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ترکوں نے دعوت وہابیت کے مقاصد اور اہمیت کو سمجھنے کی زحمت گوارا ہی نہ کی تھی۔ ورنہ ظاہر ہے۔ کہ اس قدر شدید اختلافات پیدا نہ ہوتے جو بعد میں واقع ہوئے۔ ترک اس قدر گہرے جمود و سکون میں گھرے ہوئے تھے۔ کہ اصلاح و ترقی کی ہر دعوت اُن کے لئے سوہان روح ہو جاتی تھی۔ وہ بالعموم تن آسانی اور آرام کوشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور شریعت اسلامیہ کی پوری متابعت نہیں کرتے تھے۔ بہرکیف انہیں شیخ محمدؒ بن عبدالوہاب کی ذات اور دعوت سے سخت خصومت پیدا ہو گئی تھی۔ اور انہوں نے شیخ کو بدنام کرنا شروع کر دیا تھا۔ کہ وہ ایک نیا مذہب قائم کرنا چاہتے ہیں۔ شیخ کے متابعین کو سب سے اوّل ترکوں نے وہابی کے نام سے مشہور کیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ گو اس کا گمراہ کن مفہوم زائل ہو چکا لیکن اب تک ان لوگوں کا نام یہی ہے۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ ترکوں نے وہابی نام غلط طور پر تجویز کیا تھا۔ شیخ کسی نئے مذہب کی تبلیغ واشاعت نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی استعداد کے مطابق قرآن و سنّت سے مطالب و مقاصد اخذ کرتے تھے اور لوگوں کو سلف صالحین کی متابعت کی تعلیم دیتے تھے۔ لیکن وہابی کیونکہ اکثر بدوی اور جاہل عرب تھے۔ اس لئے رفتہ رفتہ اس قدر متعصب ہو گئے۔ کہ ترک مسلمان کی جان لینے کو عین ثواب اور خدمت دین جانتے تھے۔ عام مسلمانوں کو مشرک سمجھتے تھے۔ اور اُن کے خلاف جنگ و پیکار کو جہاد کہتے تھے۔

تحریک وہابیت نے تھوڑے ہی عرصہ میں اتنی ترقی کر لی۔ کہ احمد بن سعید شریف مکّہ نے مستند علمائے دین سے وہابیوں کی تعلیم کے متعلق ۱۷۷۰ء میں فتوے طلب کئے۔ استفتا طلب امور یہ تھے:۔

(۱) کیا وہابیوں کی تعلیم بدعت و ضلالت ہے۔

(۲) کیا مقابر و مزارات تعمیر کرنا جائز ہے۔

(۳) کیا اولیاء اللہ عامۃ النّاس کے بارے میں خدائے عزّوجل کے حضور میں وسیلہ ہو سکتے ہیں۔

۱۸۱۵ء میں پھر محمد علی والئے مصر کی دعوت پر علمائے کرام کا ایک عظیم اجتماع ہوا۔ قرار طلب امور وہی تھے۔ جو اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ مشائخ و اکابرین دین نے قرآن اور صحاح ستّہ

کی رُو سے باتفاق رائے یہ فتویٰ دیا۔ کہ وہابی مذہب کا کوئی عقیدہ اصل اسلام کے معتقدات کیخلاف نہیں ہے۔ بعض لوگ یہاں تک کہہ گذرے کہ اگر وہابی تعلیم وُہی ہے۔ جو اُنہیں اس اجتماع میں بتائی گئی ہے۔ تو وُہ خود سب سے بڑے وہابی ہیں۔

لیکن ترکوں نے اس فتویٰ کی پرواہ نہ کی۔ اگر وہابی تعلیم عام ہوجاتی تو لاکھوں انسانوں کی سہل جوئی اور عیش طلبی میں فرق آتا۔ ترک بدستور مخالفت پر ڈٹے رہے۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی وفات کے زمانے تک وُہ یہ فیصلہ کر چکے تھے۔ کہ نئی تحریک کو بیخ و بنیاد سے کچل دیا جائے۔

شروع میں محمد ابن سعود نجد کا سب سے بڑا رئیس نہیں تھا۔ لیکن اُس نے نجدیوں میں ایسا مذہبی جوش پیدا کر دیا کہ سعودی سلطنت نے قرب و جوار کے علاقوں کو فتح کر کے تحریکِ وہابیت کو زور دینا شروع کر دیا۔

عبدالعزیز نے جو باپ کی بجائے ۱۷۶۵ء میں جانشین ہُوا۔ نجد کے تمام قبائل کو اپنے زیرنگین کر لیا۔ اس کے بعد وُہ حجاز کی طرف متوجہ ہُوا۔ غالب شریف مکہ نجدیوں کی زیادتیوں کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ۱۷۹۲ء میں حجاز اور نجد کی جنگ شروع ہوئی۔ جس کا اختتام ایک طویل عرصہ کے بعد وہابیوں کی فتح پر ہُوا۔

حجاز کے واقعات سے ترک بھی چوکنے ہو گئے۔ اُنہوں نے ۱۷۹۷ء میں ثنوینی کی قیادت میں ایک عظیم لشکر جمع کیا۔ یہ فوج الحصا پر حملہ آور ہوئی۔ وہابیوں نے بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ ترک پسپا ہو گئے۔ اور چھ برس کیلئے صلح کا معاہدہ ہو گیا۔

لیکن وہابیوں نے عہد شکنی کی۔ اور ابتدائی کامیابی کے نشہ میں بصرہ کے اطراف پر چڑھ دوڑے۔ اور عراق سے جو راستے حجاز کو جاتے تھے مسدود کر دئے۔ حجاز کے لوگوں کی سبیلِ معاش ہمیشہ سے حجاج کی آمدنی پر ہے۔ جب عراق سے حاجیوں کی آمدورفت جاتی رہی۔ تو حجازیوں کو شدید مالی نقصان ہُوا۔ غالب شریف مکہ اپنی اور اسوقت کی ترکی حکومت کی کمزوری سے آگاہ تھے۔ اُنہوں نے بہ امر مجبوری عبدالعزیز بن محمد بن سعود سے ایسا معاہدہ کر لیا جس سے حجاج کی آمدورفت میں فرق نہ آئے۔

لیکن وہابی شجاعت اور فتوحات کے نشہ میں چُور تھے۔ اُنہوں نے اب تک مزاحمت اور شکست کا مُنہ نہ دیکھا تھا۔ قرب و جوار پر یورشیں کرتے اور بڑے بڑے علاقوں کو لُوٹ مار کر تباہ و برباد کرتے

رہے۔ ناظرین کو معلوم ہے۔ کہ فرات کے ساحلی علاقوں میں کئی سو برس سے شیعوں کی کثیر آبادی ہے عراق میں شیعہ عنصر کی کثرت تھی۔ اور اب تک ہے۔ وہابیوں کو سُنّیوں سے تو نفرت ہی تھی۔ لیکن شیعوں کو یہ لوگ بہت ہی بُرا جانتے تھے۔ وہابیوں نے ۱۸۰۱ء میں سعود ابن عبدالعزیز کی قیادت میں کربلا معلّٰی پر حملہ کیا۔ اور حضرت امام حُسین علیہ السلام کے مقدّس مزار کو منہدم کر دیا۔ کربلا معلّٰی کی نہتہ اور امن پسند آبادی کا بیشتر حصہ بلا قصور تہہ تیغ کر دیا۔ کربلائے معلّٰی سے بصرہ تک کا تمام علاقہ خاک سیاہ کر دیا۔ کروڑوں روپیہ کا مال و اسباب لُوٹ لیا۔ فتنۂ تاتار کے بعد عراق میں ایسا ظلم و فساد کبھی نہ ہُوا تھا۔ دُنیا بھر کے مسلمانوں میں ماتم کی صفیں بچھ گئیں۔ لیکن درعیہ نجد کے دارالسلطنت میں فتح و نصرت کے شادیانے بج رہے تھے۔

اب وہابیوں نے شریف غالب سے بھی عہد شکنی کی۔ بندرگاہ حالی پر بلا وجہ قبضہ کر لیا۔ حالی حدودِ حجاز میں شریف مکّہ کی ملکیت تھی۔ احتجاج ناکام ثابت ہُوا۔ وہابی جنگ کے خواہاں تھے۔ ناقابلِ قبول شرطیں پیش کیں۔ جو صرف حقیر اور کمزور دُشمن ہی تسلیم کر سکتا تھا۔

سعود جو اس وقت رسوائے عالم ہو چکا تھا۔ حجاز کی طرف بڑھا اور لگے ہاتھوں طائف پر قابض ہو گیا۔ اور وہاں سے گرد و نواح میں افواج بھیجنے لگا۔ شریف کے پاس کوئی قابلِ ذکر فوج نہ تھی۔ مقابلہ کی تاب نہ لا کر جدّہ چلا گیا۔ اپریل ۱۸۰۳ء میں سعود بلا مزاحمت مکّہ مکرمہ میں داخل ہو گیا۔ وہابی مُدّت سے اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ کہ اصل اصلاح مکّہ سے کیجائیگی۔ اور ہر وُہ چیز جس میں کفر و شرک کا شائبہ پایا جاتا ہو۔ فنا کر دیجائیگی چنانچہ اب مقدّس مزارات توڑ پھوڑ دئے گئے۔ زیارت گاہوں کی بیحُرمتی کی گئی۔ حرم کعبہ کے غلاف پھاڑ دئے گئے۔ وہابیوں کے معتقدات کے مطابق جس قدر شعائر یا رسومات قرآن و سنّت کے خلاف تھیں۔ یکلخت ممنوع قرار دی گئیں۔

مکّہ مکرمہ کی فتح کے بعد وہابی شمال کی طرف بڑھے۔ جدّہ کا محاصرہ کیا گیا۔ شریف غالب نے جانفشانی سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مدینہ منوّرہ میں بھی وہابیوں کا مقابلہ کیا گیا۔

۴ نومبر ۱۸۰۳ء کا واقعہ ہے۔ کہ عبدالعزیز ظہر کی نماز میں امامت کر رہا تھا۔ کہ مقتدیوں میں سے ایک شخص آگے بڑھا۔ اور عبدالعزیز کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ یہ شخص شیعہ تھا۔ دو برس پیشتر اس کے اہل و عیال کربلائے معلّٰی میں تہہ تیغ کئے گئے تھے۔ یہ شخص انتقام کی غرض سے درعیہ آیا۔ اور دو برس تک

وہابی بنا۔ مناسب موقع کی تاک میں لگا رہا۔ موقعہ غنیمت جان کر وار کر دیا۔ عبدالعزیز صدمہ سے جان بر نہ ہو سکا۔ وہابیوں نے قاتل کو زندہ جلا دیا۔ لیکن وہ انتقام لے چکا تھا۔ اور ظلم و فساد کے بانی کو موت کی گہری نیند سُلا چکا تھا۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانانِ عالم وہابیوں کی حرکات کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔

موت کے وقت عبدالعزیز کی عمر ۸۲ برس کی تھی۔ اس کے عہد کی اکثر فتوحات اسکے بیٹے سعود کے ہاتھ پر ہوئی تھیں۔ چنانچہ سعود باپ کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں وہابی فتوحات کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ حجاز کے شمال سے لیکر عمان تک جزیرۃ العرب نجدیوں کی حکومت میں آگیا۔ عرب کا مشرقی ساحل بھی اُن کے قبضہ میں تھا۔ بحرین بھی فتح ہو گیا۔ یمن کے سوا سارا ملک بطیب خاطر یا بہ امر مجبوری وہابی ہو گیا تھا۔

اس وقت جبکہ سارا عرب ترکی حکومت سے علیحدہ ہو چکا۔ عثمانی سلطان کو بھی اپنے فرائض کا خیال پیدا ہوا۔ یورپ بھی عرب کے حالات سے غافل نہ تھا۔ نپولین اس زمانے میں مشرق کی فتوحات کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اُسے وہابی تحریک سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ تحریک اس کیلئے سدِ راہ ہو گی۔ چنانچہ تاریخی مواد سے یہ امر ثابت ہے کہ اس نے تفتیش حالات کی غرض سے بغداد کے فرانسیسی کونسل کو خاص طور پر مقرر کیا تھا۔ سلطان روم ابھی غور و فکر میں ہی تھا کہ نجدیوں نے عراق کے مقدس مقامات پر پھر یورش کی۔ اپریل ۱۹۰۶ء میں نجف اشرف کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن یہ مقدس شہر فتح نہ ہو سکا۔ انتقام کے طور پر نجدیوں نے نواح بغداد کے علاقوں کو تاخت و تاراج کر دیا۔ اُسی سال میں شام پر وہابیوں نے حملہ کیا۔ اور حلب کو فتح کر لیا۔ شامیوں نے دیکر صلح کر لی۔ لیکن اُوپر بیان ہو چکا ہے کہ اس زمانے کے وہابی پیمان شکنی میں طاق تھے۔ معاہدہ کے باوجود بار بار حملے کرتے رہے۔ ۱۸۱۰ء میں وہابی حوران تک جو کہ دمشق سے صرف دو دن کی مسافت پر واقع ہے۔ بڑھ گئے۔ اور وہاں کے بیسیوں گاؤں کو لُوٹ لیا۔ دمشق کے والی نے اُنکے خلاف مہم بھیجی۔ لیکن وُہ وہابیوں کو پسپا نہ کر سکی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ترک اس بلائے مبرم کے سامنے بے دست و پا ہیں۔ پیشتر ازیں ترکی سلطنت نے کبھی ایسی کمزوری کا اظہار نہ کیا تھا۔ ترک مشرق میں بغداد سے اور شمال میں دمشق سے وہابیوں پر حملہ کر چُکے تھے۔ اور بالکل ناکام رہے تھے۔

اب صرف مغرب کی جانب مصر کی راہ سے ترک حملہ آور ہو سکتے تھے۔ ترکی سلطان نے محمد علی پاشا خدیو مصر کے نام فرمان صادر کیا۔ کہ پاشائے موصوف حجاز پر حملہ کرے۔ اور حرمین الشریفین کو فتنہ نجدیہ سے نجات دلائے۔ پاشائے موصوف برائے نام تو ترکی کا باجگذار حکمران تھا۔ لیکن عملاً کامل طور پر آزاد تھا۔ اور اس زمانے میں خود مملوکین مصر کے بارے میں متفکر رہتا تھا چنانچہ اول اول تو تعمیل حکم کرنے میں پس و پیش کرتا رہا۔ لیکن جب مصر کے تمام خرخشے مٹ چکے۔ اور اس کی حیثیت مستحکم ہو چکی تو اُسے بھی بیک کرشمہ دو کار دینی خدمت کے علاوہ فتح حجاز کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے ایک جرار لشکر تیار کیا اور ۱۸۱۱ء میں اپنے بیٹے طوسون پاشا کی قیادت میں حجاز پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا اس فوج میں تقریباً آٹھ سو ترکی رسالے کے جوان اور دو ہزار البانوی تھے۔ طوسون مدینہ منورہ کی طرف بڑھا۔ لیکن اس مقدس شہر کو ۱۸۱۲ء کے آواخر تک فتح نہ کر سکا۔ اس کے بعد تو مکہ مکرمہ اور طائف بھی فتح ہو گئے۔ لیکن سعود اعظم برابر مقابلے پر ڈٹا رہا۔ اس وقت محمد علی پاشا خود فوج کی قیادت کیلئے حجاز میں آگیا۔ طرابہ کے مقام پر جو نجد و حجاز کی سرحد پر واقع ہے۔ اور جو بعد میں عربی تاریخ میں مشہور مقام ہوا سعود اعظم نے محمد علی پاشا کو شکست فاش دی۔ یہ ۱۸۱۳ء کا واقعہ ہے۔ اسکے تقریباً ایک سال بعد ۱۸۱۴ء میں سعود مر گیا۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی وہابی کمزور ہو گئے جیسا کہ پیشتر بیان ہو چکا ہے۔ کہ سعود بڑا فاتح گزرا ہے۔ اس نے قریب قریب سارے عرب کو فتح کر لیا تھا۔ اور قرب و جوار کے علاقوں کو جی کھول کر تاخت و تاراج کیا تھا۔ لیکن اس کی موت کے بعد اس کے جانشین حکومت کو سنبھال نہ سکے۔

محمد علی پاشا نے طرابہ کے مقام پر شکست اُٹھانیکے بعد وہابیوں کے جوش و خروش کو دیکھکر ایک چال چلی۔ زر و مال کے ذریعے سے بدویوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ بدوی حال ہی میں جبراً وہابی کئے گئے تھے۔ یہ لوگ دولت کے لالچ میں ہر وقت بیوفائی کرنے کیلئے تیار رہتے ہیں چنانچہ انعام و اکرام کے لالچ میں جوق در جوق محمد علی پاشا کی افواج میں شامل ہوتے گئے ۱۸۱۴ء میں بوصال کے مقام پر جو طائف کے قریب ہی ایک مختصر سا گاؤں ہے۔ محمد علی پاشا نے وہابیوں کو فاش شکست دی جس میں وہابی طاقت کا خاتمہ ہو گیا۔ عبداللہ سعود اعظم کا جانشین ہوا تھا۔ لیکن وہابی حکومت کو بربادی سے بچا نہ سکا۔ طوسون سیدھے صوبہ قاسم کی طرف بڑھتا گیا۔ اور

وہاں کے صدر مقام راس کو فتح کر لیا۔ وہابیوں کے وفادار قبائل اطاعت سے پھر گئے۔ مجبوراً امیر عبداللہ نے صلح و امن کا پیغام بھیجا۔ اور آخر کار عارضی صلح ہو گئی۔

صحرائی جنگ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر ایک دفعہ لڑائی شروع ہو جائے۔ تو مدت تک بند نہیں ہوتی۔ چنانچہ محمد علی پاشا نے عبداللہ سے صلح تو کر لی۔ لیکن منشاء محض یہ تھا کہ ہمیشہ کے لئے وہابیوں کا قلع قمع کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۱۵ء میں پھر جنگ شروع ہو گئی۔ اب محمد علی پاشا کا دوسرا بیٹا ابراہیم پاشا جو لائق اور مشہور و معروف جرنیل تھا۔ سپہ سالار مقرر ہوا۔ ترکی مصری فوجوں کی یلغار دیکھ کر عرب کے بہت سے قبائل حملہ آوروں سے مل گئے چنانچہ باری باری مطیر علیبہ۔ حرب وغیرہ نے وہابیوں کی اطاعت چھوڑ دی۔ وہابی فوجیں مختلف مقامات پر ہزیمت اٹھا کر پسپا ہوئیں۔ حملہ آوروں نے ایک ایک کر کے وہابی سلطنت کے تمام علاقے چھین لئے یہاں تک کہ ۱۸۱۸ء میں درعیہ دارالسلطنت پر بھی قبضہ کر لیا۔ مجبور ہو کر امیر عبداللہ نے اپنے تئیں فاتحین کے حوالے کیا۔ انہوں نے درعیہ کو تباہ و برباد کر دیا۔ امیر عبداللہ کو اسیر کر کے پہلے قاہرہ بھیجا گیا پھر قسطنطنیہ۔ محمد علی پاشا نے عثمانی سلطان کے حضور میں سفارش کی۔ کہ امیر عبداللہ کی جان بخشی کر دی جائے لیکن ترکوں نے سلطان کے حکم کے مطابق مجمع عام کے روبرو امیر عبداللہ کو مسجد ایا صوفیہ کے چوک میں بڑی ذلت سے تہہ تیغ کیا۔ اس طرح پر وہابی سلطنت کے پہلے دور کا خاتمہ ہوا۔

اس وقت نجد بھی حجاز کی طرح مصر کا ایک باجگزار صوبہ ہو گیا تھا۔ وہابیت کی تحریک خاک سیاہ کر دی گئی تھی۔ لیکن اس میں کچھ شرارے ابھی باقی تھے۔ اور مشتعل ہونے کیلئے مساعد حالات کے منتظر تھے۔ امیر عبداللہ کے مارے جانے کے کئی برس بعد نجد میں مصری حکومت کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکی۔ ریاض میں جو مصری لشکر موجود تھا۔ باغیوں کی تلوار نے اسے ٹھکانے لگایا ۱۸۲۴ء میں امیر عبداللہ کے بیٹے امیر ترکی نے مصریوں کو نجد سے نکال باہر کیا۔ اور خود نجد۔ الحسا اور عمان کا امیر بن گیا۔ لیکن امیر ترکی کی اس حکومت کو وہابی سلطنت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ امیر ترکی مصر کو خراج ادا کیا کرتا تھا۔

وہابیوں کی حقیقی طاقت و سطوت کا پیشتر ہی خاتمہ ہو چکا تھا۔ اب خانہ جنگی بھی شروع ہوئی سعودی خاندان کے افراد آپس میں بغض و عناد کرنے لگے۔ یوں کہنا چاہئے کہ یہ زوال و انحطاط

کی بدترین مثال تھی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود فیصل کے عہد میں جو کہ امیر ترکی کا لڑکا تھا۔ پھر وہابیوں کی حکومت میں جان کی رمق پیدا ہوئی۔

امیر فیصل ترکی کا بیٹا سنہ ۱۸۳۴ء میں الحصا کا نظم و نسق کر رہا تھا۔ کہ مشعری بن عبدالرحمٰن نے جو کہ خاندان سعود کا ہمجد تھا۔ امیر فیصل کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھا کر بغاوت کی۔ اور ترکوں کو ساتھ ملا کر امیر تُرکی کو قتل کر دیا۔ امیر فیصل کو بیحد رنج ہُوا اور ریاض میں واپس آ کر قریباً دو مہینے بعد مشعری کا خاتمہ کر دیا۔ اس کارروائی میں ایک شخص عبداللہ ابن رشید نامی فیصل کا دستِ راست تھا۔ فیصل نے اس کی خدمات سے خوش ہو کر حائل کی صوبہ داری اس کے حوالہ کر دی۔ یہ شخص حائل کے مشہور خاندان رشید کا مورث تھا۔ اس خاندان کی حکومت نے رفتہ رفتہ اتنی ترقی کی کہ انیسویں ۱۹ صدی عیسوی کے آخری حصہ میں عرب بھر میں کوئی حکمران سطوت و اقتدار میں آل رشید سے بڑھکر نہ تھا۔

امیر فیصل کچھ تو سلطنت کے اندرونی معاملات کی اصلاح میں مشغول رہا۔ کچھ اس کی نیت بھی مصری حکومت کے ماتحت رہنے کی نہ تھی۔ اسلئے سالہا سال تک اس نے مصر کو خراج ادا نہ کیا۔ اس وقت کی مصری حکومت میں ابھی طاقت باقی تھی۔ مصریوں نے سنہ ۱۸۳۸ء میں امیر فیصل پر حملہ آور ہو کر اُسے اپنے تئیں حوالے کرنے پر مجبور کیا۔ اور اس کے خاندان کو بغاوت اور سرکشی سے اجتناب کرنے کا سبق سکھانے کیلئے اُنہوں نے فیصل کو قاہرہ پہنچا دیا۔ اس کے بعد مصر کی طرف سے براہ راست نجد کے والی مقرر ہوتے رہے۔ البتہ کبھی کبھی مصلحت کے لحاظ سے خاندانِ سعود کے بعض افراد بھی نجد کے صوبہ دار مقرر کر دئے گئے۔

سنہ ۱۸۴۳ء میں فیصل قاہرہ کے محبس سے بھاگ نکلا۔ اور آتے ہی ریاض کا امیر بن گیا۔ بعد ازاں اس نے اپنی حکومت کو پھر عمان الحصا۔ قاسم اور جبلِ شمار تک وسیع کر لیا۔ حقیقت میں یہ امیر عظیم شخصیت رکھتا تھا۔ اور گو وہابی سلطنت میں پہلی سی آن بان پیدا نہ کر سکا لیکن اپنی وفات تک بڑی کامیابی سے حکمرانی کرتا رہا۔ اس کی موت سنہ ۱۸۶۷ء میں واقع ہوئی۔

فیصل کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ تخت نشین ہُوا۔ یہ شخص کمینہ خصائل رکھتا تھا۔ اور نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے بھائی سعود نے سنہ ۱۸۷۱ء میں اُسے تخت سے اُتار دیا۔ اور

خود امیر بن بیٹھا۔ لیکن خانہ جنگی کے سلسلے میں صوبجات قاسم اور جبل شمّار سے وہابی حکومت اُٹھ گئی۔

معزول شدہ عبداللہ نچلا نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔ وہ سعود سے انتقام لینے کا خواہاں تھا۔ حالانکہ عثمانی ترک آباؤ اجداد کے وقت سے سعودی خاندان کے مخالف تھے لیکن عبداللہ نے انتقام کے مذموم جذبہ کے ماتحت ترکوں سے کمک طلب کی۔ ترکوں نے موقعہ کو غنیمت جانا۔ اور عبداللہ کو اپنی طرف سے نجد کا والی قرار دیکر اس کی مدد کیلئے ایک مہم تیار کی۔ اور صوبہ الحصا کو فتح کر لیا۔

سعود ترکوں سے مقابلہ کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ ۱۸۷۲ء میں اس نے ترکوں سے مفاہمت پیدا کرنے کیلئے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کو بغداد بھیجا۔ ترک سعود کی پیشقدمی سے خوش تو کیا ہوتے۔ اُلٹا عبدالرحمٰن کو دو برس کی قید کر دیا۔

سعود ۱۸۷۷ء میں مر گیا۔ اور معزول شدہ عبداللہ اسکی بجائے اورنگ نشین ہوا۔ عبداللہ آٹھ برس حکومت کرتا رہا۔ لیکن فرمانروائی کی پوری صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ سعود کے دونوں بیٹے محمد اور سعود اس سے حسد رکھتے تھے۔ اور فتنہ و فساد برپا رکھتے تھے۔ آخر کار انہوں نے اسکو تخت سے اُتار کر قید کر دیا۔

اسی زمانے میں محمد ابن رشید کی شخصیت اور کارہائے نمایاں معرضِ وجود میں آئے۔ انکی مختصر کیفیت کسی اور مقام پر بیان ہوگی۔ اس پُرشکوہ بادشاہ نے نجد کو مسخر کر لیا۔ اور عبداللہ کو قید خانے سے نکال کر اس کے بھائی عبدالرحمٰن کے ساتھ حائل بھیجدیا۔ ۱۸۸۶ء میں دونوں کو ریاض واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ دونوں بھائی خاموشی سے اپنے آبائی دارالسلطنت میں مقیم ہو گئے۔ اور یہیں ۱۸۸۹ء میں عبداللہ مر گیا۔ طبعی طور پر عبدالرحمٰن کی توقع یہ تھی کہ عبداللہ کی جگہ ان کو ریاض کا حاکم بنا دیا جائے گا۔ لیکن محمد ابن رشید اس تجویز کے موافق نہ تھا۔ اس نے سلیم ابن سبحان کو ریاض کا حاکم بنا کر بھیجدیا۔ کچھ عرصہ کے بعد محمد بن رشید کو خاندان سعود کی طرف سے بدگمانی پیدا ہوئی۔ اس نے سلیم کو حکم دیا کہ اس خاندان کے تمام افراد کو قتل کرا دے۔ کسی طرح پر عبدالرحمٰن کو اس حکم کی اطلاع مل گئی۔ سلیم تعمیل حکم کی کوشش میں تھا کہ آل سعود نے اس پر حملہ آور ہو کر جان سے مار دیا۔ اور ریاض میں اپنی حکومت جمالی۔ اس وقت ریاض پر تو ان کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن نجد پر ابن رشید کا اقتدار بحال تھا۔ چند ماہ یہ لوگ صوبہ الاریدہ پر جہاں ریاض واقع ہے حکومت کرتے

رہے۔ لیکن جنوری ۱۸۹۱ء میں محمد بن رشید نے بریدہ کے مقام پر سعودی افواج کو شکست فاش دی۔ اور مزید گوشمالی کیلئے ریاض دارالسلطنت کی طرف بڑھا۔

آخرکار عبدالرحمن نے محسوس کیا۔ کہ وُہ ابن رشید سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے وُہ اہل و عیال کو لیکر اندرون عرب سے چلا۔ اور مدت تک صحرانوردی کرنے کے بعد والئے کویت کے ہاں جا کر پناہ گزین ہو گیا۔ اس خاندان کے بعض افراد قید ہو کر حائل پہنچائے گئے۔ عبدالرحمن کی جلاوطنی کے مفصّل حالات علیحدہ باب میں قلمبند کر دئے گئے ہیں۔

مندرجہ بالا واقعات سے ظاہر ہوگا۔ کہ ابن سعود کو کس قسم کی روایات ورثہ میں ملی تھیں۔ اور اس نے کس قسم کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں اندرونِ عرب میں متعدد انقلابات ظہور پذیر ہوئے۔ ایک طرف مذہبی جوش و خروش اور اصلاح و اخلاق کی وجد آفرین کیفیت تھی۔ دوسری طرف جنگ و پیکار۔ لوٹ مار اور قتل و غارت کے مناظر تھے۔ ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کے حوادث و کوائف میں استقلال و استحکام سلطنت کا تو کیا ذکر ذہنی اور اخلاقی توازن بھی کیسے قائم رہ سکتا تھا۔

عرب میں مصریوں کی حکومت

عرب کے دورِ جدید کی تاریخ سمجھنے کیلئے یہ ضروری ہے۔ کہ عرب میں مصریوں کی حکومت کے حالات اختصار سے بیان کر دئے جائیں۔

۹ ستمبر ۱۸۱۸ء کو ابراھیم پاشا درعیہ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہُوا۔ مصری سپاہ نے وہابیوں کے صدر مقام کو بیدردی سے لوٹ کھسوٹ لیا۔ عبداللہ کے اپنے تئیں حوالہ کرنے سے پہلے خاندان سعود کے بہت سے افراد جان بچا کر بھاگ گئے تھے۔ بقیہ افراد سربرآوردہ وہابیوں کی معیت میں قید

ہوکر مصر پہنچے۔ ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں شہر کی فصیل گرا دی گئی۔ اس عرصہ میں مصری سپاہ کے متعدد دستے گرد و نواح کے اضلاع میں بھیج دئے گئے قطیف اور ہفوف کے شہروں پر بھی مصریوں نے قبضہ کر لیا۔ اب انگریزوں کو بھی جو خلیج فارس کے بعض حصوں پر اپنا اثر پھیلا چکے تھے خیال پیدا ہوا اور انہوں نے کیپٹن سیڈلیئر کو ابراہیم پاشا کی خدمت میں بھیجا۔ یہ شخص اگست ۱۸۱۹ء کو درعیہ پہنچا اس وقت تک ابراہیم پاشا درعیہ سے مراجعت کر چکا تھا۔ بالآخر مدینہ منورہ کے نواح میں دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ پاشا بہت اخلاق سے پیش آیا۔ لیکن اس نے خلیج فارس میں انگریزی حقوق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

ابراہیم پاشا نے فتوحات کے بعد ملک کے نظم و نسق میں خاص تبدیلیاں نہ کیں۔ اس نے نجد اور یمن میں ترک سپاہ ضرور متعین کر دیں۔ لیکن عرب کا ہر ایک حصہ مقامی رئیس کے ماتحت چھوڑ دیا گیا۔ البتہ عثمانی سیادت کو تسلیم کروا لیا۔ لیکن حجاز میں منظم حکومت کی طرح ڈالی گئی یمن میں تہامہ کے علاقہ میں ترکی فوج موجود نہ تھی۔ وہاں امام مہدی عبداللہ کو معمولی سے سالانہ خراج کے معاوضہ میں حاکم بنا دیا گیا۔ نجد میں ابراہیم پاشا کی نگاہ انتخاب عیینہ کے قدیم حکمران خاندان کے ایک فرد محمد ابن مشعری ابن معمر پر پڑی۔ اس شخص کو ترکی سپاہ کی مدد سے نجد کا امیر بنا دیا گیا۔ یہ شخص بہت سی خوبیوں کا آدمی تھا۔ اس نے بہت سے خیر خواہوں کی جمعیت اکٹھی کر لی۔ اور درعیہ کے نخلستانوں کو آباد کرنے کی فکر کرنے لگا۔ لیکن گو اسمٰعیل پاشا ترک افواج کے قائد اعظم کی حیثیت سے ملک میں موجود تھا لیکن پھر بھی محمد ابن مشعری مصیبتوں میں گھر گیا اور طرح طرح کے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ الحصا میں مجید ابن عرائعر بن خالد اور مشعری عبداللہ کے بھائی نے درعیہ میں بغاوتیں برپا کیں۔ اوائل ۱۸۲۱ء میں آل سعود میں سے ترکی نے ایک خونریز بغاوت کی جس میں محمد ابن مشعری جان سے مارا گیا۔ مصری حکومت کی طرف سے خالد پاشا اسمٰعیل پاشا کی مدد کیلئے بھیجا گیا۔ لیکن وہ حالات پر قابو نہ پا سکا۔ ترکی درعیہ سے بھاگ کر ریاض پہنچا۔ اور وہاں بھی قدم نہ جمتے دیکھ کر سدیر میں سے ہوتا ہوا البصرہ پہنچا۔ اور روپوشی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ جلد ہی نجد کے حالات نے پلٹا کھایا۔ اور ترکی موقعہ غنیمت سمجھ کر نجد کو واپس لوٹ آیا۔ اور ریاض میں ہی ریاست قائم کر لی۔ اس نے شہر میں ایک محل اور مسجد تعمیر کر کے فصیل بنوائی۔ اتنے میں حسین بے داھر خالد پاشا کی مدد کیلئے پہنچا۔ ابھی تک ریاض کی فصیل مکمل نہ ہوئی تھی۔ ترکی نے محاصرہ میں گھر

جانا پسند نہ کیا۔ اور شہر کو خالی کر کے صحرا میں چلا گیا۔ حسین بسے نے بڑی شدومد سے اسکا تعاقب کیا لیکن
اسکی فوج صحرا میں راستہ بھول گئی۔ اور گرمی اور پیاس کی وجہ سے بالکل تباہ ہو گئی۔ لیکن حسین بسے
چند ہمراہیوں سمیت بچ نکلا۔ اس واقعہ کے بعد محمد علی پاشا والئے مصر نے جنوبی نجد کو زیر نگین رکھنے کا
خیال قطعاً چھوڑ دیا۔ گو اسکی افواج بعض شہروں میں بعد میں بھی قابض رہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی لڑائیاں
لڑتی رہیں۔ لیکن ان کی موجودگی اور بھی منافرت کا باعث ہوئی۔ ترکی پھر ریاض پر قابض ہو گیا۔ عوام
اسکی اطاعت کرنے لگ گئے۔ لیکن قبیلہ مطیر کا شیخ فیصل الدویش اس کے علاقے کو تاخت و تاراج
کرتا رہا۔ مگر قبیلہ العنیزہ بھی فیصل کے برخلاف کارروائیاں کرتا رہتا تھا۔ ۱۸۲۷ء میں ترکی کی حیثیت اس
قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ صوبہ قاسم کو اپنے تسلط میں لے آیا۔ تین برس بعد اس نے قبائل شمار کی مدد سے
الحصا کے قبیلہ بنی خالد کو شکست فاش دیدی۔ اور اس صوبہ کو بھی فتح کر لیا۔ خاندان سعود کا ایک اور فرد
مشعری ابن عبدالرحمن ۱۸۲۵ء میں مصری حکومت کے زندان سے بھاگ آیا تھا۔ ترکی نے اُسے منفوحا
کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔ لیکن یہ شخص اس عہدے پر قانع نہیں تھا۔ اور ہاتھ پاؤں بڑھانا چاہتا تھا۔ ترکی
الحصا میں مصروف کار تھا۔ کہ مشعری نے حجاز کے بعض قبائل کی مدد سے اس کے خلاف بغاوت برپا
کر دی۔ لیکن اسکی مساعی بیکار ثابت ہوئیں۔ اور ترکی نے اسے قید کر لیا۔ اسمٰعیل پاشا ترکی کی سپہ سالار اب
ترکی کی طاقت کو کمزور کرنے کے درپے ہوا۔ ۱۸۳۴ء میں جبکہ نجدی سپاہ کا بیشتر حصہ ترکی کے لڑکے فیصل
کی قیادت میں الحصا میں تھا۔ اسمٰعیل پاشا نے سازش کر کے ترکی کو قتل کرا دیا۔ اور خود حکومت کرنے لگا
جونہی کہ فیصل کو اس حادثہ کا علم ہوا۔ یلغار کرتا ہوا ریاض کو واپس آیا۔ اُسے شہر میں داخل ہونے کیلئے
بہت تکلیف نہ اٹھانی پڑی۔ مشعری جو کہ ترکوں کے بل بوتے پر ریاض کا امیر بن بیٹھا تھا۔ اسکی آمد
سے بے خبر تھا۔ عبداللہ ابن رشید بھی اس وقت فیصل کے ہمرکاب تھا۔ وہ چالیس جوانوں کو ساتھ لیکر
چپکے سے شہر میں داخل ہو گیا۔ اور مشعری کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ فیصل شہر کے باہر انتظار کھینچ رہا
تھا مشعری کے قتل کا حال سن کر شہر میں داخل ہو گیا۔ اور باپ کی جگہ اورنگ نشین ہو گیا۔ اس واقعہ
کے بعد عبداللہ ابن رشید حائل کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔ بعد میں یہ شخص اس مقام کا خود مختار حکمران اور
عرب کا نامور رئیس ہوا۔

اس زمانے میں مصری حکومت کی ترک سپاہ طرح طرح کے مصائب میں مبتلا تھی۔ خلیج فارس

کے عربی ساحل پر دن بدن انگریز اپنے پاؤں جما رہے تھے۔ عرب شیوخ بھی مصری حکومت کا جوا گردن سے اتار چکے تھے۔ حجاز کی مقدس سرزمین کے علاوہ مصریوں کی حکومت کہیں بھی باقاعدہ طور پر قائم نہیں تھی۔ مصری حکومت نے یحیٰی ابن سرور کو مکہ معظمہ کا شریف مقرر کیا تھا۔ اس نے ۱۸۲۷ء میں حرم کعبہ کی حدود کے اندر اپنے ایک حریف کو تہ تیغ کر دیا۔ اور خود بھاگ کھڑا ہوا۔ حرب کے قبیلہ میں پناہ گزین ہو گیا۔ مصری صوبہ دار نے جلاوطن غالب کے لڑکے عبدالمطلب کو بطور شریف نامزد کیا۔ لیکن خدیو محمد علی پاشا والئی مصر نے اس نامزدگی کو پسند نہ کیا۔ اور اسکی بجائے محمد بن عبدالمعین العون کو شریف مکہ بنا دیا۔ یہ شخص ۱۸۵۱ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس کا پوتا شریف حسین بیسویں صدی کے پہلے ربع میں حجاز کا خود مختار بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ لیکن ۱۹۲۵ء میں سلطان ابن سعود سے شکست کھا کر قبرص کو بھاگ گیا۔ یحیٰی ابن سرور اور عبدالمطلب کے ایما پر محمد بن عبدالمعین کے خلاف طائف میں بغاوت برپا ہوئی۔ لیکن شریف نے ترک سپاہ کی مدد سے اس فتنہ کو فرو کر دیا۔ چند سال بعد اسی شریف نے صوبہ عسیر کو فتح کر کے محمد علی پاشا کی وسیع مملکت میں شامل کر دیا۔

فیصل نے اس دوران میں نجد کے دیہات اور قبائل کو مصری حکومت کے خلاف خوب بھڑکایا۔ ہر جگہ فتنہ و فساد کی آگ مشتعل ہو گئی۔ آخر الامر ۱۸۳۶ء میں اسمٰعیل پاشا کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اور نجد سے مصری حکومت کا تسلط اٹھ کھڑا ہوا۔ اس اثنا میں خورشید پاشا عرب کا صوبہ دار مقرر ہو کر آیا۔ اس کے ایما پر ۱۸۳۷ء میں خالد سعود اعظم کا جوان عمر لڑکا ترکی سپاہ کی معیت میں انیزہ پہنچا۔ تاکہ غاصب فیصل کو برطرف کر کے حق دار کی حیثیت سے ریاض کا حکمران بن جائے۔ اس وجہ سے پھر نجد میں طوائف الملوکی شروع ہو گئی۔ قاسم اور شمر کے بہت سے لوگ خالد کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ جونہی کہ خالد ریاض کی طرف بڑھا شہر کے دروازے اس کے استقبال میں کھل گئے۔ فیصل ریاض سے ہٹ کر حوطہ آ گیا۔ مصری سپاہ نے اس کا تعاقب کیا۔ لیکن سخت ہزیمت اٹھائی۔ اس کے بعد فیصل نے ریاض کا محاصرہ کیا لیکن کامیاب نہ ہوا۔ ناکام ہو کر دلیم کو چلا گیا۔ یہاں سے اس نے اپنے بھائی جلیوی کو گرانمایہ تحائف دیکر خورشید پاشا کے پاس بھیجا پاشا اس وقت انیزہ میں ڈیرے ڈالے پڑا تھا۔ اور عبداللہ ابن رشید اور قبیلہ مطیر کے شیخ محمد الدویش

کی اطاعت حاصل کر چکا تھا جلیوی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ اور خورشید پاشا حسب سابق ناظر رہا۔ بلکہ ۱۸۳۸ء کے آخر میں ولہم پر حملہ آور ہوا۔ اور فیصل کو مجبور کر دیا کہ ملک چھوڑ کر مصر کو چلا جائے.. اس وقت اندرون عرب اور نجد کے خالص وہابی علاقے میں خالد کا پورا تسلط تھا۔ اب خورشید پاشا نے الحصا اور قطیف میں ترکی حیثیت قائم کرنیکی کوشش کی بحرین پر حملہ کرنا چاہتا تھا کہ انگریزی حکومت نے ایک یادداشت میں زبردست احتجاج کیا۔ اور انگریزی مداخلت کے خیال سے پاشا اپنے ارادے سے باز رہا۔

ناظرین کو معلوم ہے۔ کہ اندرون عرب کے لوگ آزادی کے بیحد دلدادہ ہیں۔ اور بیرونی مداخلت کسی رنگ میں بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ جب وہابیوں نے دیکھا۔ کہ خالد کی طاقت کا دارومدار ترکی سپاہ پر ہے۔ تو وہ اس سے بدظن ہو گئے۔ اسی زمانے میں عبداللہ ابن ثنونیان محمد ابن سعود بانئے سلطنت کی اولاد میں سے امارت ریاض کا خواہاں ہوا۔ لیکن جب تک نجد میں ترکی سپاہ موجود تھی خالد کے خلاف کارروائی محال تھی۔ اتفاق یہ ہے کہ ۱۸۴۰ء کے موسم گرما میں ترکی سپاہ نجد سے مراجعت کر گئی۔ اور ملک میں امن وامان مفقود ہو گیا۔ ۱۸۴۱ء میں عبداللہ ابن ثنونیان ریاض کا امیر بن گیا۔ اور خالد کو جلاوطن ہونا پڑا۔ فیصل کسی نہ کسی طرح سے مصر سے بھاگ کر گمنامی کی حالت میں دمشق میں تحصیل علم کر رہا تھا۔ اب اُسے مراجعت کیلئے مناسب موقعہ ملا۔ وہ جلیوی اپنے بھائی کو ساتھ لیکر حائل پہنچا۔ عبداللہ ابن رشید اس کا رہین منت تھا۔ وہ اور اس کا بھائی عبید نہایت خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ اور ہر طرح سے امداد کیلئے تیار ہوئے۔ انکے پاس معقول جمعیت موجود تھی۔ وہ فیصل کے ساتھ کر دی گئی۔ وہابی آبادیوں نے فیصل کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ فیصل نے ریاض کا محاصرہ کر لیا۔ ایک ماہ کے محاصرہ کے بعد عبداللہ ابن ثنونیان نے شہر حوالہ کر دیا۔ یہ جون ۱۸۴۳ء کا واقعہ ہے۔ عبداللہ کچھ عرصہ بعد مر گیا۔

اب کی مرتبہ فیصل نے تقریباً پچیس ۲۵ برس شان وشوکت سے حکومت کی۔ ابراہیم پاشا اس وقت شام میں حکمران تھا۔ اور عمدگی سے حکومت کرتا تھا۔ لیکن اس ملک کے معاملات کچھ ایسے تھے۔ کہ وہ اندرون عرب کے حالات کی طرف توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ خدیو محمد علی پاشا ضعیف العمر ہو گیا تھا۔ اور صحرائے عرب پر شدومد سے حکومت کرنیکا آہنی عزم ڈھیلا پڑ چکا تھا

عثمانی سلطنت اپنے معاملات میں ہی منہمک تھی۔ اس لئے ترکی یا مصری مداخلت کا کوئی بڑا مظاہرہ فیصل کے بقیہ عہد میں نہیں ہوا۔ البتہ کبھی کبھی خلافت عثمانیہ کے نام پر شریف مکّہ نجد سے جھڑپ کرلیا کرتا تھا۔

فیصل کی ریاست اس کے آباؤ اجداد کی مملکت کے مقابلہ میں بہت مختصر تھی لیکن اسمیں بڑی خوبی یہ تھی۔ کہ کُل آبادی خالص وہابی معتقدات رکھتی تھی۔ اور یہ مذہبی یک جہتی استحکام ریاست کا باعث تھی چنانچہ فیصل کے دورانِ حکومت میں امن وامان قائم رہا۔ علوم وفنون کا چرچا ہو گیا۔ صنعت وحرفت میں ترقی ہوئی۔

فیصل نے آہستہ آہستہ الحصا اور حعفوف۔ مبارز۔ قطیف جبیل اور عقیر کے ساحلی شہر از سر نو فتح کرلئے۔ بنی خالد اور عجمان نے اُسکی اطاعت قبول کرلی۔ اس کے بعد اُس نے اپنی توجّہ صوبہ قاسم کی طرف مبذول کی۔ یہاں کی ہر ایک بستی کا علیحدہ علیحدہ امیر تھا۔ فیصل نے سب کو مفتوح و مسخّر کرنے کے بعد جُداگانہ صوبجاتی حکومت قائم کردی۔ قاسم والوں نے شریف مکّہ سے فیصل کیخلاف مدد چاہی۔ یہاں محمد ابن عون تقریباً خودمختار ہوچکا تھا۔ ۱۸۴۰ء میں محمد علی پاشا والئے مصر کی طاقت شام میں ختم ہوچکی تھی۔ حجاز نے بھی اطاعت کا جوا اُتار پھینکا تھا۔ محمد ابن عون اپنے لئے وہی طاقت وسطوت پیدا کرنا چاہتا تھا جو اٹھارویں صدی کے آخیر میں مصری حکومت کے بل پر شریف مکّہ رکھتا تھا۔ لیکن مصری حکومت کے کمزور اور غیر مؤثر پڑ جانے سے یمن اور عسیر میں مقامی حکمران پیدا ہو گئے تھے۔ ۱۸۴۵ء میں پھر ترکی حکومت نے اپنا اثر قائم کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۴۹ء میں شریف محمد بن عون کے مشورے سے ترکوں نے فوج بھیجی تاکہ امیر حسین والئے یمن سے حدیدہ اور وادی تہامہ چھین لیجائے۔ توفیق پاشا اس فوج کا جرنیل تھا۔ توفیق پاشا نے امام متوکل والئے صنعا کو بھی معزول کردیا۔ اور اسکی بجائے ایک اور شخص منتخب ہوا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد بغاوت پھوٹ پڑی۔ اور ترک جرنیل بُری طرح زخمی ہوکر حدیدہ پہنچا۔

فیصل کی اصلاحات سے بعض لوگ ناراض تھے اُنہوں نے شریف مکّہ کی طرف رجوع کیا۔ محمد بن عون مناسب موقعہ سے چوکنے والا نہ تھا ۱۸۴۶ء میں وہ خاصی جمعیت لیکر وہابی ریاست پر چڑھ دوڑا۔ فیصل نے مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور شریف مکّہ کی سیادت کو تسلیم کر کے

سنبھالی۔ ۱۸۶۱ء میں بحرین کے امیر سے حکومت انگلشیہ نے معاہدہ کرلیا۔ انگریزوں نے بحرین پر ترکی اور ایرانی سیادت کے دعووں کو شدومد سے مسترد کردینا شروع کیا۔ اس وقت تک کویت نے اس قدر اہمیت حاصل نہیں کی تھی کہ مدبرین کی نگاہ میں خاص وقعت پاتا۔ انگریزوں کی بیشتر توجہ عمان کی طرف مبذول تھی ۱۸۶۲ء میں ثوینی کے بھائی ترکی نے سمار کے مقام پر اوّل الذکر کے خلاف بغاوت کردی۔ ثوینی نے وہابی حکمران سے مدد طلب کی۔ وہابیوں کی امداد سے بغاوت فرو ہوگئی۔ اس واقعہ سے عمان میں وہابیوں کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا لیکن دو برس بعد جب ۱۸۶۴ء میں عزان ابن قیس ابن حامود رستق کے حاکم نے والئ عمان کے خلاف بغاوت کی تو وہابیوں نے باغی حاکم کا ساتھ دیا۔ باغی سور نامی بندرگاہ پر قبضہ کر رہے تھے کہ انگریزی رعایا کا ایک آدمی بلوہ عام میں مارا گیا۔ انگریزی حکومت کو بہانہ ہاتھ آیا۔ رعایا کی جان و مال کی حفاظت کے بہانے سے میدان میں آدھمکی۔ اصل میں منشا یہ تھا کہ عمان میں وہابیوں کا اثر و نفوذ نہ پھیل جائے۔ اور وقت پر روک تھام کردی جائے۔ انگریزوں نے ثوینی والئ عمان کو بہت سا گولہ بارود دیا۔ اپنے زیر اثر عرب شیوخ کو ہدایت کردی کہ وہ اس کو اپنی سپاہ سے مدد دیں۔ اور خود وہابیوں کی بندرگاہ قطیف پر گولہ اندازی کی۔ بندرگاہ میں برلبِ ساحل ایک قلعہ بنا ہوا تھا۔ انگریزوں نے اسے مسمار کردیا۔ ان حالات میں فیصل والئ ریاض نے انگریزوں سے تصفیہ کرلیا۔ کہ والئ عمان مقررہ خراج ہر سال باقاعدہ ریاض کو بھیج دیا کرے۔ اور وہابی عمان کے علاقے پر حملہ آور نہ ہوں۔ اسکے بعد وہابیوں نے عمان پر حملہ نہ کیا۔ اور عمان ایک طرح سے وہابیوں کی ماتحتی سے نکل گیا۔

اسی سال انگریزوں نے ثوینی والئ عمان سے معاہدہ کرکے اس کے علاقے میں ٹیلیگراف لگایا۔ ۱۸۶۶ء میں ثوینی قتل کردیا گیا۔ عام خیال یہ تھا کہ اسکے بیٹے سلیم نے اسے قتل کردیا ہے۔ ترکی اس کا بھائی جب سے اس نے بغاوت کی تھی جیل میں مقید تھا۔ انگریزی ایجنٹ نے ثوینی کے قتل کی خبر سنکر ترکی کو آزاد کردیا لیکن کیونکہ سلیم کے خلاف معتبر شہادت موجود نہ تھی۔ اسلئے وہی باپ کا جانشین قرار پایا۔ ثوینی کے بعد ملک سے امن و امان جاتا رہا۔ ۱۸۶۸ء میں ترکی نے کچھ جمعیت پیدا کرکے سلیم پر حملہ کردیا۔ انگریزی جہازوں نے سلیم کو حملہ آور سے بچا لیا۔ ترکی کو پنشن پر ہندوستان بھیج دیا گیا۔ ایک برس بعد عزان ابن قیس نے رستق میں بغاوت کردی۔ یہ شخص ثوینی کے عہد میں بھی

بغاوت کر چکا تھا بڑھتا بڑھتا مسقط میں داخل ہو گیا۔ اب کی مرتبہ انگریزوں نے سلیم کو مدد نہ دی عزان اسکی بجائے عمان کا حکمران ہو گیا۔ سلیم نے انگریزوں کی سرد مہری کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن شنوائی نہ ہوئی مجبور ہو کر سلیم بندر عباس کو چلا گیا۔

حجاز میں ترکی حکومت نے ۱۸۵۱ء میں محمد ابن عون کی بجائے عبدالمطلب ابن غالب کو شریف مکہ مقرر کر دیا۔ تقریباً پچیس برس پیشتر محمد نے عبدالمطلب کو امارت حجاز سے موقوف کرایا تھا۔ عبدالمطلب کو حکم موصول ہوا تھا۔ کہ اگر ممکن ہو سکے تو محمد کو قسطنطنیہ بھیج دے۔ موخر الذکر کی گرفتاری عمل میں آنی مشکل تھی۔ اس لئے فریب سے کام لیا گیا۔ اس کے دو لڑکے جدے میں گئے ہوئے تھے۔ ان کو دعوت دیگئی۔ کہ ایک ترکی جنگی جہاز کا معائنہ کریں۔ جب وہ تختۂ جہاز پر پہنچ گئے۔ تو اُن کو گرفتار کر لیا گیا۔ محمد نے بیٹوں کی مصیبت دیکھکر اپنے تئیں حکومت کے حوالے کر دیا۔ محمد نے حجاز میں مقبولیت حاصل کی ہوئی تھی۔ مدت تک لوگ اُسے یاد کرتے رہے۔ محمد دار السلطنت قسطنطنیہ میں چند سال مقیم رہا۔ ۱۸۵۶ء میں حجاز میں بڑے زور و شور سے بغاوت ہوئی۔ وجہ یہ تھی۔ کہ حجاز کے باشندے بردہ فروشی کے انسداد سے ناراض تھے۔ عبدالمطلب حالات پر قابو نہ پا سکا۔ عثمانی حکومت نے اُسے امارت سے برطرف کر دیا۔ اور محمد ابن عون کو اسکی بجائے شریف مقرر کر کے قسطنطنیہ سے حجاز کو بھیجا۔ محمد ابن عون نے آتے ہی بغاوت کو فرو کر دیا۔ لیکن خود زیادہ عرصہ تک حکمرانی نہ کرنے پایا تھا۔ کہ ۱۸۵۸ء میں فوت ہو گیا۔ اس کا بیٹا عبداللہ اسکا جانشین قرار پایا۔ اسی سال جدہ میں بلوہ عام ہوا۔ اہالیانِ جدہ بردہ فروشی کے بارے میں یورپ والوں کی مداخلت سے ناراض تھے۔ اس بلوے میں دو یورپین کونسل جان سے مارے گئے عثمانی حکومت نے فی الفور تحقیق و تفتیش حالات اور تنظیم و تشکیل حکومت کیلئے ایک کمیشن بھیجدیا اس کمیشن کی تجاویز کے مطابق شریف مکہ کے اختیارات میں معتدبہ تخفیف کر دیگئی۔ عرب کے جنوب مغربی گوشہ میں گو صنعا میں ۱۸۴۹ء میں توفیق پاشا نے یمنیوں کے ہاتھوں ہزیمت اُٹھائی تھی۔ لیکن پھر بھی کسی نہ کسی طرح ترکی سپاہ وادیٔ تہامہ پر اب تک قابض چلی آئی تھی۔ ترکی سپاہ کو ملک پر تصرف و اقتدار برقرار رکھنے میں بہت سی دقتیں درپیش تھیں۔ بڑی بات یہ تھی کہ حجاز کے راستے سے ترکی فوج کو کمک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جو فوج بھیجی بھی جاتی تھی۔ وہ بُعدِ مسافت اور مصائبِ سفر کی

وجہ سے خوار و خستہ ہو کر منزل مقصود تک پہنچتی تھی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ دقّت رفع ہو گئی ۱۸۶۹ء میں نہر سویز تعمیر ہو گئی۔ اب عثمانی حکومت کیلئے یہ ممکن تھا کہ سمندر کی راہ سے یمن کو فوجیں بھیجدے۔ اس طرح پر ترکی حکومت نے ایک تربیت یافتہ فوج رؤف پاشا کی قیادت میں بھیجدی۔ اس فوج نے یمن اور عسیر کے متعدد مقامات کو مسخر کر لیا۔ بڑے بڑے مضبوط قلعے جواب تک فتح نہ ہوئے تھے۔ سر ہو گئے ۱۸۷۲ء میں مختار پاشا کی ماتحتی میں ترکی فوج صنعا میں داخل ہو گئی۔ ترکی قبضہ و اقتدار کی وجہ سے امام یمن کے اختیارات بہت محدود ہو گئے۔

الغرض جس زمانے میں فیصل والئے ریاض عدم کو سدھارا عرب کی سیاسی تقسیم اس انداز پر ہو چکی تھی۔ جو کہ جنگ عظیم تک جو فیصل کی وفات کے تقریباً پچاس برس بعد وقوع میں آئی۔ بدستور قائم رہا۔ وسط عرب میں خاندان ابن رشید آل سعود کی سیادت سے آزاد ہو کر حائل اور کوہ ہائے شمار کے علاقوں میں خود مختار حکمرانی کر رہا تھا۔ وہابی جنوبی نجد پر حکومت کرتے تھے صوبجات قاسم اور الحصاء پر بھی انکا برائے نام اقتدار باقی تھا۔ حجاز پر ترکوں کا پورا تسلط قائم تھا۔ عثمانی حکومت کا اقتدار یمن پر بھی تھا انگریز جزیرہ پیرم اور عدن پر قابض تھے۔ عدن کے اندرونی علاقہ پر بھی ان کا اثر تھا۔ عرب کے جنوب اور مشرق کے ساحلوں پر انگریزوں کا اثر و رسوخ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس علاقے کے بڑے بڑے رؤسا و شیوخ انگریزوں کے بل بوتے پر حکومت کرتے تھے۔ خلیج فارس کے ایک حصّہ پر ابتک وہابی متصرف تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہابیوں کا اقتدار ساحل پر سے جاتا رہا۔ کویت ابھی تک گمنام و غیر اہم تھا لیکن وہاں ترکوں کی طرف میلان پایا جاتا تھا۔ اس وقت سے لیکر تقریباً تیس برس بعد تک خاص عرب کی تاریخ آل رشید کے کارناموں پر مشتمل رہی کیونکہ اس وقت پورے عرب میں صرف یہی خاندان ایسا تھا جس میں کچھ طاقت اور سطوت موجود تھی۔

عرب کی عظمت اور جبروت مفقود ہو چکی تھی۔

باب نہم

آل رشید کا عروج

عرب کے ماضی قریب کی تاریخ میں آل رشید کے کارنامے اس قدر اہمیت رکھتے ہیں کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے زمانۂ عروج کے مختصر واقعات علیحدہ باب میں درج کر دئے جائیں۔

انیسویں ۱۹ صدی کے شروع میں قبیلہ ہائے شمار کا مشہور ترین قبیلہ عبدہ تھا جسمیں سب سے با اقتدار حصہ ربیعہ نامی تھا۔ اس میں سے خاندان جعفریہ کا اثر و رسوخ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس خاندان میں دو گھرانے ابن علی اور ابن رشید نامی بہت مشہور و معروف تھے جس زمانے کے حالات ہم بیان کر رہے ہیں۔ محمد ابن عبدالمحسن ابن علی اول الذکر خانوادے کا شیخ قبیلہ ہائے شمار میں بہت ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ علی ابن الرشید کے تعلقات اس کے ساتھ نہایت خوشگوار تھے انمیں رقابت کے جذبات کبھی پیدا نہ ہوئے تھے۔ علی ابن الرشید کے دونوں لڑکے عبداللہ اور عبید لائق اور ترقی کے خواہاں تھے۔ ان دونوں نے محمد ابن عبدالمحسن کے لڑکے عیسیٰ کے ساتھ پرورش پائی تھی۔ ہر دو خانوادوں کے تعلقات کو اور مستحکم کرنے کیلئے محمد نے اپنی لڑکی کا عقد عبداللہ کے ساتھ کر دیا تھا۔

محمد کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عیسیٰ اس کا جانشین ہوا۔ اس کے وقت میں حجاج اور تاجروں کی حفاظت کیلئے جو جوان قبیلہ ہائے شمار کی طرف سے حفاظت کیلئے مامور ہوتے تھے عبداللہ اور عبید انکی قیادت کیا کرتے تھے۔ عبداللہ کے اوصاف نے بہت سے لوگ اس کے حامیٔ کار کر دئے۔ چنانچہ عیسیٰ بن محمد اور عبداللہ بن علی کے تعلقات اس بڑھتے ہوئے رسوخ کی وجہ سے کشیدہ ہونے شروع ہوئے ۱۸۲۰ء میں ان میں کھلم کھلا جھگڑا پیدا ہو گئی۔ عبداللہ حائل سے وادی فرات کی طرف بھاگ گیا۔ اس مسافرت میں عبداللہ کی ملاقات ترکی ابن سعود سے ہوئی جو اس زمانے میں مصریوں کی فتوحات سے تنگ آ کر اس علاقہ میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ جب کچھ عرصہ کے بعد ترکی ابن سعود کے حالات نے مساعدت کی اور وہ نجد کو واپس آیا۔ تو

عبداللہ بھی اس کے ہمرکاب تھا۔ اس مصاحبت میں اسکے تعلقات ترکی کے لڑکے فیصل سے بہت بڑھ گئے جب ترکی نے نجد کے ایک حصّہ کو مفتوح کرلیا۔ تو شمّار کے علاقوں نے بھی عبداللہ کے اثر و رسوخ اور قابلیت کیوجہ سے اسکی اطاعت اختیار کرلی۔ ترکی نے حسب سابق عیسیٰ بن محمّد کو برقرار رکھا اور قبیلہ ہائے شمّار کے نظم و نسق میں تبدیلی نہ کی۔ اس وقت عبداللہ بھی بظاہر ان حالات سے مطمئن تھا

۱۸۳۴ء میں عبداللہ فیصل بن ترکی کی قیادت میں الحصا کی فتح میں مصروف تھا۔ کہ ترکی کے قتل کی خبر پہنچی۔ عبداللہ اپنے قبیلہ کے نوجوانوں کو ساتھ لیکر فیصل کی معیت میں یلغار کرتا ہُوا ریاض کی طرف بڑھا اور ترکی کے قاتل اور تخت سلطنت کے غاصب پر پیشتر اس کے کہ وہ اپنی طاقت مستحکم کر سکے۔ حملہ کر دیا۔ محاصرہ کے دوران میں عبداللہ نے خوب دادِ شجاعت دی۔ اور جان پر کھیل کر قلعہ میں گھس گیا۔ اس وقت چالیس ۴۰ آدمی اس کے ہمرکاب تھے۔ اس نے مشعری کو قتل کر دیا۔ فیصل اس فتح کے بعد نجد کا فرمانروا ہُوا۔ نئے امیر نے عبداللہ کو اسکی شائستہ خدمات کے صلے میں حائل کا امیر اور قبیلہ ہائے شمّار کا شیخ مقرّر کر دیا۔ عیسیٰ کا جانشین صالح ابن محسن ابن علی معزول کر دیا گیا۔

اس طرح پر عبداللہ نے ۱۴ برس کے بعد حائل کو مراجعت کی۔ لوگوں نے نہائیت گرمجوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ معاملات سلطنت کی سرانجام دہی میں عبید اپنے بھائی کا دست راست ثابت ہُوا۔ اس زمانے میں عبداللہ وہابی سلطنت کی اطاعت و انقیاد میں مخلص تھا۔ اور خود مختار انہ حکومت کا خیال تک بھی دل میں نہ لاتا تھا۔ چند برسوں کے بعد مصریوں نے امیر فیصل پر حملہ کر دیا۔ اس دوران میں انہوں نے تجویز کی۔ کہ حائل کو مفتوح کر کے عیسیٰ بن علی کو اپنے ماتحت وہاں کا امیر مقرر کر دیں ۱۸۳۷ء میں جب وہابیوں نے حائل پر چڑھائی کی تھی۔ تو عیسیٰ اپنے چچا صالح کو اپنا جانشین مقرّر کر کے حائل سے بھاگ گیا تھا۔ اور مصریوں کے ہاں ابتک پناہ گزین تھا چنانچہ ۱۸۳۷ء میں وہ ترکی سپاہ کو لیکر حائل آگیا۔ عبداللہ مقابلے کی تاب نہ لا سکا۔ اور صحرا کی طرف بھاگ گیا۔ لیکن جونہی کہ ترکی عساکر نے مراجعت کی وہ پھر آ دھمکا۔ اور حائل سے تھوڑے سے فاصلہ پر توفار نامی موضع کو اپنا صدر مقام بنا کر گرد و پیش کے علاقہ پر حکومت کرنے لگا۔ خورشید پاشا نے جو اس زمانے میں حکومت مصر کی طرف سے ممالک عربیہ کا حاکم تھا۔ چاہا کہ عبداللہ کو مصری سلطنت کا مطیع و منقاد کر دے۔ چنانچہ وہ ۱۸۳۸ء میں اپنے صدر مقام مدینہ منوّرہ سے جبل شمّار کیطرف

بڑھا۔ عبداللہ نے مصلحت یہی سمجھی کہ مصریوں کی اطاعت قبول کرے۔ مستجدہ کے مقام پر اسکی خورشید پاشا سے ملاقات ہوئی۔ پاشائے موصوف اسکی شخصیت اور اوصاف کا مداح ہو گیا۔ فریقین میں قرار پایا۔ کہ عبداللہ مصری حکومت کی اطاعت اختیار کرلے۔ اور بدستور حائل کا امیر رہے۔ عیسیٰ بن علی مدینہ کو بھاگ گیا لیکن عبید نے اس کا تعاقب کرکے سلیمی نامی مقام پر قتل کر دیا۔ اس واقعہ سے اس خاندان کی عظمت میں فرق آگیا۔ اور گو آجتک یہ خاندان قائم ہے لیکن اسکے بعد سیاسی اہمیت پھر کبھی حاصل نہیں ہوئی۔

عبداللہ نہایت بیدار مغز حکمران تھا۔ اور وہابی اور مصری حکومتوں سے خوشگوار تعلقات رکھتے ہوئے توسیع مملکت میں برابر مصروف رہا۔ اس دوران میں اس نے ایک مرتبہ ۱۸۴۳ء میں فیصل والئی نجد کو ترکوں کے خلاف مدد بھی دی۔ اس نے شمال میں جوف کے اضلاع فتح کرکے اپنی ریاست میں شامل کر لئے۔ اور مغرب میں حرب وغیرہ قبائل کو زیر نگیں کیا۔ عبید اس کا بھائی بہت شائستہ خدمات سر انجام دیتا رہا۔ ۱۸۴۷ء میں عبداللہ بقضائے الٰہی فوت ہو گیا۔

عبداللہ کا سب سے بڑا بیٹا طلال اس کا جانشین ہوا۔ اسوقت تک ریاست حائل برائے نام نجد کی ماتحتی میں تھی چنانچہ طلال نے تخت نشینی سے پیشتر فیصل سے اجازت حاصل کی۔ جو نہایت خوشی سے بلاتعین شرائط عطا کر دیگئی۔ طلال امن پسند آدمی تھا۔ اور شروع ہی سے اپنی قلمرو میں امن وامان قائم رکھنے کیلئے کوشش کرتا تھا۔ اس نے ان تمام لٹیروں کا جو دن دھاڑے قافلوں کو لوٹ لیا کرتے تھے قلع قمع کر دیا۔ امن کوشی کی اس پالیسی سے حائل کی رعایا آسودہ اور مرفہ الحال ہونے لگی۔ حائل تجارت کا اچھا خاصہ مرکز بن گیا انہی دنوں میں جوف میں فتنہ پیدا ہوا۔ اس علاقے کے باشندوں نے جو خراج عبداللہ امیر حائل نے مقرر کیا تھا۔ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ عدم ادائیگی کی وجہ یہ تھی۔ کہ امیر عبداللہ نے اس علاقے کے نظم ونسق کو بدستور سابق رہنے دیا تھا۔ مقامی رؤسا ہی انتظام کرتے تھے۔ ان میں نفاق پیدا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ قبیلہ رولا کا ایک ایسا شیخ برسر اقتدار آگیا جو خاندان رشید سے مخاصمت رکھتا تھا۔ ۱۸۵۳ء میں حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ آل رشید کو مجبوراً مداخلت کرنی پڑی۔ عبید طلال کے بھائی متعب کو ساتھ لیکر جوف کی طرف آیا۔ اور حالات پر آسانی سے قابو پا لیا۔ لیکن دو برس کے بعد پھر بغاوت پھوٹ پڑی۔ چنانچہ حائل سے مہم بھیجی گئی اب

قرار پایا۔ کہ جوف کی حکومت کیلئے امیر حائل حاکم نامزد کر کے بھیجدے۔ اور مرید کے پرانے قلعے میں رشیدی سپاہ متعین کر دی جائے۔ اس صوبے کے بعض قلعے منہدم کر دئیے گئے۔ اور آل رشید کا تسلط بخوبی بیٹھ گیا۔ گرد و پیش کے قبائل اطاعت کیلئے مجبور کر دئیے گئے۔ طلال ریاض کے وہابی حکمران سے وفادار رہا۔ اور ظاہل السلیم کی جو اس کو وہابی علاقوں کی تاخت و تاراج کی ترغیب دیا کرتا تھا۔ باتوں کو خاطر میں نہ لایا۔ طلال ایک مرتبہ اطاعت کے اظہار و اعلان کے خیال سے ریاض بھی گیا۔ افواہ مشہور ہے۔ کہ وہابیوں کے ہاں کسی نے اس کو زہر دیدیا۔ ریاض سے حائل کو واپس آتا ہُوا طلال بیمار پڑ گیا۔ معالجہ کیلئے بغداد سے ایک مشہور ایرانی طبیب بُلایا گیا۔ مرض مہلک نہ تھا۔ لیکن بالآخر طلال کے جنونی ہو جانے کا احتمال تھا۔ اس مرض کے ہاتھوں تنگ آ کر ۱۱ مارچ ۱۸۶۸ء کو طلال نے خودکشی کر لی۔ کیونکہ خودکشی مسلمانوں کے ہاں نہایت مذموم فعل ہے۔ اس لئے طلال کے بعض حامیوں نے یہاں تک کہہ دیا۔ کہ ایک پستول کا معائنہ کرتے ہوئے اچانک گھوڑا دب گیا تھا۔ اور وُہ اتفاقیہ حادثہ سے انتقال کر گیا۔ بعض مؤرخین نے اس تاویل کو غلط قرار دیا ہے۔ بہرکیف بوقت وفات طلال کی عمر ۴۵ برس کی تھی۔ اور وُہ پُورے اکیس ۲۱ برس کامرانی و شادکامی سے سریر آرائے سلطنت رہا تھا۔ اس کے چھ لڑکے تھے جن میں سب سے بڑا جس کا نام بندر تھا۔ اس وقت سترہ سال کا تھا۔

متعب عبداللہ کا منجھلا بیٹا بزرگ خاندان کی حیثیت سے طلال کا جانشین ہُوا۔ یہ شخص شائستہ اور پسندیدہ عادات رکھتا تھا۔ لیکن بندر اور بدر طلال کے دونوں لڑکے اس کی جانشینی سے سخت ناراض تھے چنانچہ اُنہوں نے جنوری ۱۸۶۹ء کو اُسے گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ متعب ایک تعویذ پہنا کرتا تھا جس کے متعلق عوام میں اعتقاد یہ تھا۔ کہ اس تعویذ کے پہننے والے کو سکہ کی گولی ہلاک نہیں کر سکتی۔ اس اعتقاد سے متاثر ہو کر بندر اور بدر نے چاندی کی گولیاں تیار کروالی تھیں متعب کے بعد بندر تخت نشین ہُوا۔ سال خوردہ عبید ابتک زندہ تھا۔ وہ محمد عبداللہ کے تیسرے فرزند اور اس کے اہل و عیال کو ساتھ لیکر جان کے خوف سے ریاض کی طرف چل دیا۔ لیکن اسی برس کی عمر میں یہ پُرصعوبت سفر اسے راس نہ آیا۔ اور وُہ چند دن بیمار رہ کر ریاض میں انتقال کر گیا۔ یہ شخص نہایت جواں مرد اور صاف باطن تھا۔ اور اپنے بھائی اور اس کی اولاد کی نمایاں

خدمات بجالایا تھا۔ ذاتی غرض و منفعت کا خیال بھی کبھی اس کے دل میں پیدا نہ ہوا۔ کبھی کبھی عمدہ عمدہ شعر بھی کہہ لیا کرتا تھا۔

محمد بن عبداللہ بندر سے منتعب کا انتقام لینے پر تلا ہوا تھا۔ بندر کو بھی یہ احساس تھا۔ کہ اگر محمد آمادہ فساد ہوا تو بہت سے لوگ اس کے حامی کار ہو جائینگے۔ اور وہابیوں کی امداد بھی اُسے مل جائیگی۔ چنانچہ اس خیال سے اس نے محمد سے مصالحت کر لینی چاہی۔ محمد بھی کچھ رضامند سا ہو گیا۔ لیکن وہ چاہتا تھا۔ کہ اولاً بندر کی مصادقت کا امتحان ہو جائے۔ تو وہ حائل کو مراجعت کرے اس لئے اس نے حمود ابن عبیدا وراس کے خاندان کو حائل روانہ کر دیا۔ اور خود بندر سے معاملہ طے کر کے حجاز کی طرف روانہ ہوا۔ محمد کیلئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ اپنے باپ اور بھائی کے عہدوں میں بھی قافلوں کے ہمراہ حفاظت کی غرض سے جایا کرتا تھا۔ اس کام میں اس نے کافی شہرت اور نیک نامی پیدا کر لی تھی۔ اور قافلہ والوں کے محاصل سے رفتہ رفتہ بہت سی دولت بھی جمع کر لی تھی۔

اس قافلے میں جس کے ساتھ محمد گیا تھا۔ ایک ایرانی درویش بھی جو زہد و اتقا میں مشہور عام تھا سفر کر رہا تھا۔ اس درویش کے پاس ایک نہایت عمدہ شمشیر تھی جسکو کسی نے ازراہِ عقیدت پیش کیا تھا۔ ایک رات درویش نے خواب میں دیکھا۔ کہ کوئی اُسے کہہ رہا ہے۔ کہ تیرے ساتھ اس قافلہ میں ایک بادشاہ بھی سفر کر رہا ہے تم یہ شمشیر لیکر اُسے پہنا دو۔ جس کو تم یہ شمشیر عطا کرو گے۔ وہ بادشاہ بن جائیگا۔ اور عمر بھر مظفر و منصور رہیگا۔ جاؤ اور اُسے تلاش کرو۔ درویش حیران تھا۔ کہ کس کو وہ شمشیر عطا کرے۔ بظاہر اس بخشش کا کوئی اہل نظر نہ آتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری تھا کہ کسی نہ کسی کو یہ شمشیر ضروری پہنائی جاوے۔ فقیر اسی شش و پنج میں غلطاں و پریشان رہتا تھا کہ قافلہ نجف اشرف جا پہنچا۔ اس مقام پر محمد نے قافلہ سے رخصت ہونا تھا۔ وہ فقیر سے ہمیشہ ادب اور ملائمت سے پیش آتا رہا تھا۔ چنانچہ جب رخصت کے وقت درویش کو اس نے سلام کیا۔ تو اس نے دعائیں دیں۔ اور خوشنودی کا اظہار کر کے کہا۔ کہ میرے پاس اظہار تشکر کیلئے کچھ نہیں۔ سوائے ایک شمشیر کے جو مکہ مکرمہ کے باشندوں نے مجھے دی تھی۔ مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ البتہ حاجیوں کی حفاظت میں تمہارے کام آسکتی ہے۔ اس لئے میں تمہیں یہ شمشیر شوق سے دیتا ہوں اور مبارکباد

دیتا ہوں۔ کہ پادشاہت تمہارے مقدر میں ہو چکی ہے۔ محمد نے یہ عطیہ شکریہ سے قبول کیا اور اپنی آئندہ کامیابیوں کیلئے نیک شگون سمجھ کر بہت مسرور و محظوظ ہوا۔ اپنے محافظین کو ساتھ لیکر وہ نجف اشرف سے حائل کو واپس ہوا۔ جب منزل مقصود کے نزدیک پہنچا۔ تو بندر فرمانروائے حائل کو اشتیاق ملاقات کا پیغام بھیجا۔ بندر شاہی خاندان کے افراد اور کچھ سپاہ کو ساتھ لیکر پیشوائی کیلئے شہر سے باہر آیا متعب کے قتل کے بعد محمد اور بندر میں ملاقات نہ ہوئی تھی۔ حامود بن عبیدبھی بندر کے ہمرکاب تھا۔ ملاقات کے دوران میں حامود نے محمد کو ہاتھ کے اشارے سے بتلا دیا۔ کہ اس کی جان خطرہ میں ہے۔ محمد کے ساتھ بہت سے لوگ قبیلہ دافر کے تھے۔ ان کی دیرینہ مخاصمت خاندان ابن رشید سے تھی۔ بندر نے محمد کے ہمرائیوں کی موجودگی پر اظہار ناپسندیدگی کیا محمد اس وقت اونٹ پر سوار تھا۔ اور بندر گھوڑے پر۔ محمد نے حائل والوں میں سے ایک سے گھوڑا مانگا۔ اور اس پر سوار ہوتے ہی بندر کے قریب آکر شمشیر کا ایک بھرپور وار کیا۔ اور بندر کے دو ٹکڑے کردئے بدر غلاموں سمیت موقعہ واردات سے بھاگا۔ حامود اور محمد بھی اپنے سپاہیوں کے ساتھ دوڑ کر شہر میں داخل ہو گئے۔ اور شہر کے دروازے بند کر دئے۔ بدر کا صحرا میں تعاقب کیا گیا۔ اور وہ قتل ہوا۔ اس کے بھائی بھی جو ابھی کمسن بچے تھے۔ تہہ تیغ کردئے گئے۔ مقصد یہ تھا۔ کہ آئندہ کیلئے خرخشہ باقی نہ رہے۔ اتفاق سے بندر کے اکلوتے لڑکے مجید کی جان بچ گئی۔

حائل کے باشندوں نے جو اس خونریزی سے ہراساں اور ششدر تھے۔ جان کے خوف سے محمد کی اطاعت قبول کرلی۔ آہستہ آہستہ پوری ریاست پر محمد کا تسلط بیٹھ گیا۔ گردوپیش کے چند علاقے بھی اس کے قبضہ میں آگئے۔ اب اس کی ریاست کے حدود خیبر اور تیمہ سے لیکر وادی فرات تک اور قاسم سے لیکر وادی سرحان اور جوف تک بڑھ گئے۔ اس ریاست کی آبادی کا اندازہ ۲۰۰۰۰ ہزار سے ۴۰۰۰۰ ہزار تک کیا گیا ہے۔ چھ لاکھ روپیہ کے قریب سالانہ محاصل تھے جس میں سے انتظام سلطنت کیلئے تقریباً دو لاکھ روپے صرف کئے جاتے تھے۔ قرین قیاس یہ ہے۔ کہ اس ریاست کی آبادی اور محاصل متذکرہ بالا اعداد سے زیادہ ہونگے لیکن صحیح اعداد و شمار کا ملنا محال ہے۔ لازمی طور پر اندازے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

محمد ابن رشید دسمبر ۱۸۶۹ء میں ریاست حائل کی گدی پر بیٹھا۔ دو برس پیشتر ریاض کا

اس دوران میں بریدہ میں بھی ایک ایسا خاندان برسر اقتدار آ گیا۔ جو عبداللہ اور ریاض کی ماتحتی میں
رہنا نہ چاہتا تھا۔ اس واقعہ سے ظالم کو اور بھی تقویت ہوئی۔ اس علاقے کا وہابی حاکم حسن المہنا بھی
بگڑ بیٹھا۔ صوبہ حرج میں سعود کے لڑکوں کی بغاوت کا اندیشہ بھی پیدا ہو گیا۔ محمد ابن رشید گو عبداللہ
کا دشمن نہ تھا۔ لیکن وہ بھی صوبہ قاسم میں عبداللہ کا پورا تسلط گوارا نہ کر سکتا تھا۔ عبداللہ حالات پر
قابو نہ پا سکا۔ اور مجبور ہو کر محمد ابن رشید سے مفاہمت پر آمادہ ہوا۔ ۱۸۷۹ء میں فریقین میں اس
طرح پر سمجھوتہ ہو گیا۔ کہ عبداللہ امیر ریاض نے صوبہ قاسم میں اپنے حقوق سے دست برداری دے دی
وہابی اس سمجھوتہ سے مطمئن نہ تھے۔ عبداللہ کی کمزوری تو پہلے ہی مشہور تھی۔ اب اور بھی بے رعبی ہوئی
اس نے کھوئے ہوئے وقار کو قائم کرنے کیلئے اپنے بھتیجوں یعنی سعود کے لڑکوں بالخصوص محمد کیخلاف جو
کہ الغزلان کے عرف سے مشہور تھا۔ جنگ شروع کی اس کا منشا یہ تھا۔ کہ اس کی رعیت میں
باغیانہ خیالات پھیلنے نہ پائیں۔ بعد کے حالات ترتیب اور تواتر کے ساتھ معلوم نہیں ہو سکے۔ البتہ
اتنی بات یقینی ہے۔ کہ اس عرصہ میں وہابی علاقوں میں حکمران خاندان کے باہمی نفاق اور کمزوری
کیوجہ سے سخت بے ابتری رہی۔ اور بد عملی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ خاندان کی رہی سہی امیدیں ملیامیٹ
ہو گئیں۔ محمد ابن رشید اس عرصہ میں اپنا رسوخ بڑھاتا اور خاندان سعود کو بے وقار کرتا رہا۔ لیکن اس
عرصہ میں دونوں کی کھلم کھلا جھڑپ نہ ہو سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی۔ کہ محمد ابن رشید کی ہمشیرہ عبداللہ
کے نکاح میں تھی۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ بہنوئی کو بالکل تباہ و برباد کر دے۔ لیکن پھر بھی وہ ریاض
کے تخت کو حاصل کرنے کیلئے خفیہ طور پر بیحد متردد تھا۔

قاسم کے معاہدہ کی وجہ سے وہابیوں میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سدیر کے علاقہ
میں عبداللہ کے خلاف بغاوت برپا ہوئی۔ باغیوں نے محمد ابن رشید سے مدد طلب کی۔ ۱۸۸۱ء
میں مجمع کے لوگوں نے فتنہ بپا کیا۔ اس وقت عبداللہ قریب ہی دھرما کے مقام پر خیمہ زن تھا۔
قبیلہ عتیبہ کے بہت سے جوان اس کے ساتھ تھے۔ عتیبہ والے قبیلہ حرب سے برسر پرخاش تھے قبیلہ
حرب ابن رشید کی رعیت میں شمار ہوتا تھا۔ ان کو زک دینے کی نیت سے عتیبہ کے لوگ عبداللہ
کے ہمرکاب ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے جبل شمار تک ترکتازیاں کرنی شروع کر دی تھیں عبداللہ
کا ارادہ یہاں نہیں مدد کرنیکا تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ انیزہ اور بریدہ کے لوگوں کو بھی ابن رشید کے خلاف

بھڑکائے۔ اور اس طرح پر اپنے حریف کی طاقت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دے۔ سدیر کی بغاوت کا حال سنکر عبد اللہ اس طرف کو جا ہی رہا تھا کہ یک بیک ریاض کو واپس ہو گیا۔ اسے خیال تھا کہ اس کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر اس کے بھتیجے کہیں ریاض پر ہی قبضہ نہ کر لیں۔ اس وقت محمد ابن رشید شہر بریدہ قبائل حرب اور شمار کے بہت سے نوجوانوں کو ساتھ لیکر مجمع کے باغیوں کی مدد کیلئے چل پڑا۔ مجمع پہنچکر ابن رشید نے نہ صرف وہاں کے وہابی حاکم کو برطرف کر کے اپنا آدمی متعین کر دیا۔ بلکہ زلفی پر بھی حملہ آور ہوا۔ اور اس کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔ صریح طور پر یہ سعودی سلطنت میں مداخلت تھی کیونکہ اس گئے گذرے وقت میں بھی زلفی خالص وہابی علاقہ اور ریاست ریاض کے ماتحت سمجھا جاتا تھا۔ عبد اللہ کو مجمع کی بغاوت فرو کرنے کیلئے کافی جمیعت حاصل کرنے میں ایک برس کا عرصہ لگا۔ وہ سپاہ کو لیکر ۱۸۸۳ء میں صوبہ سدیر کی طرف چلا۔ باغیوں نے فوراً ابن رشید سے مدد طلب کی۔ بریدہ کے باشندوں کو بھی کمک کیلئے پیغام بھیجا۔ حمدہ کے مقام پر ابن رشید اور وہابیوں کی مڈھ بھیڑ ہوئی۔ ابن رشید نے وہابیوں کو شکست فاش دیکر برباد کر دیا۔ محمد ابن رشید نے میدان جنگ سے ہی گرد و نواح کے اضلاع کے وہابی حاکموں کو اس کی اطاعت اختیار کرنے کے لئے پیغام بھیجا۔ انہوں نے مجبوراً سر تسلیم خم کیا۔ ابن رشید نے ان کی بجائے اپنے آدمی متعین کر دئے۔ عبد اللہ بھاگ کر ریاض پہنچا۔ اور فاتح سے مصالحت کیلئے گفت و شنید شروع کر دی۔ اس کا بھائی محمد ابن فیصل پیغام لیکر گیا تھا۔ محمد کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ نہ صرف عبد اللہ کیلئے گراں قدر تحائف لایا۔ بلکہ محمد ابن رشید نے تسلیم کر لیا کہ سدیر اور واشم ریاض کی ریاست کا حصہ ہیں۔ محمد بن رشید نے کہا کہ اسکی مداخلت محض بحالئے امن کیلئے تھی۔ لیکن افسوس یہ ہے۔ کہ پھر اس علاقے میں باقاعدہ حکومت قائم نہ ہو سکی۔ کبھی کبھی فتنہ و فساد ہوتا رہا۔ عبد اللہ کی کمزوری سے سعود کے لڑکوں نے بھی فائدہ اٹھانا چاہا۔ چنانچہ انہوں نے قبیلہ عقیب کے لوگوں کو ترغیب دی۔ کہ وہ ابن رشید کے علاقوں پر حملہ کریں۔ حمدہ کی لڑائی کے چند ماہ بعد ورع کے مقام پر فریقین کا مقابلہ ہوا جس میں ابن رشید کو خاطر خواہ فتح نصیب ہوئی۔ اس طرف سے مایوس ہو کر سعود کے لڑکوں نے ریاض کا رخ کیا۔ اور کسی طرح سے شہر میں داخل ہو کر عبد اللہ کو قید کر لیا۔ یہ واقعہ ۱۸۸۴ء کا ہے۔ عبد اللہ نے اس نازک مرحلہ پر ابن رشید سے مدد طلب کی۔ اس نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا چنانچہ کافی سپاہ لیکر ریاض کی طرف بڑھا۔ اور راستہ میں اعلان کرتا آیا۔

کہ اسکی آمد کی غرض جائز وارث کی مدد کرنا ہے۔ وہابی بھی ابن رشید کے ساتھ شامل ہو گئے۔ لیکن دارالسلطنت کے لوگ ابن رشید کے بارے میں ذرا محتاط رہے جب وہ شہر کے قریب پہنچ گیا۔ تو شہر والوں نے ایک وفد عبدالرحمٰن کی سرکردگی میں بھیجا تاکہ دریافت کریں۔ کہ وہ کس غرض سے آیا ہے اس نے جواب دیا۔ کہ اس کی آمد کی غرض محض یہ ہے کہ وہ عبداللہ کو آزاد کرکے تخت پر بٹھائے۔ اور خاندانِ سعود کا تسلط بدستور ممالک محروسہ پر قائم کرے۔ چنانچہ فریقین میں سمجھوتہ ہو گیا۔ سعود کے لڑکے طاقتور حریف کی موجودگی اور باشندگانِ شہر کے دباؤ سے خائف ہو کر خرج کی طرف چلے گئے۔ اب محمد ابن رشید نے بھی رنگ بدلا۔ اور فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوا۔ عبداللہ کو واقعی آزاد کر دیا گیا۔ لیکن اسے عبدالرحمٰن اور اس کے خاندان کے دس اور افراد کی معیت میں حائل بھیج دیا گیا۔ ابن رشید نے اپنی طرف سے سلیم ابن سبحان کو ریاض کا حاکم متعین کیا۔ ابن رشید کا پورا تسلط ریاض اور نواح کے اضلاع پر ہو گیا۔ وہابی ریاست صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئی۔ خاندانِ سعود کی یہ تباہی دوسری مرتبہ ہوئی تھی۔ عبداللہ ثانی کی طاقت کو حائل کی عربی ریاست نے برباد کیا۔ عبداللہ اوّل کو مصریوں نے تباہ کیا تھا۔

۱۸۸۶ء میں خرج کے بعض لوگوں نے سعود کے لڑکوں کے ظلم و ستم کی شکایت سلیم ابن سبحان سے کی سلیم حاکم ریاض کے حضور میں سعودیوں نے گستاخانہ روش اختیار کی جس پر رشیدی حاکم کو خدشہ پیدا ہوا۔ محمد۔ سعد۔ اور عبداللہ سعود کے تینوں لڑکے گرفتار کر لئے گئے۔ سلیم نے انہیں قتل کرا دیا۔ اور ان کے اہل و عیال کو حائل بھیج دیا۔ لوگوں نے اس ظلم و ستم کی فریاد محمد ابن رشید کے پاس اس شدّ و مدّ سے کی کہ اس نے بالآخر سلیم کو معزول کر دیا۔ اور فہد ابن رخیص کو اس کی جگہ نامزد کر دیا۔

کچھ عرصہ کے بعد عبداللہ حائل میں بیمار ہو گیا۔ محمد نے اجازت دیدی۔ کہ اپنے خاندان کو ہمراہ لیکر ریاض چلا جائے۔ اور وہاں کے حاکم کی حیثیت سے اور حائل کی ماتحتی میں معاملات سرانجام دے۔ آخرکار نومبر ۱۸۸۹ء میں عبداللہ فوت ہو گیا۔ اس کے بعد ابن رشید نے عبدالرحمٰن سے ملائمت کا سلوک روا رکھا۔ بلکہ فہد کو ریاض کی حکومت سے واپس بلا کر سلیم کو مقرر کر دیا۔ یہ شخص جبر و استبداد میں بہت بدنام تھا۔ ابن رشید عبدالرحمٰن کو عبداللہ سے زیادہ خطرناک سمجھتا تھا یہی وجہ

ہے۔ کہ اس نے سلیم کو اجازت دیدی تھی۔ کہ جس طرح ہو سکے عبدالرحمن اور خاندان سعود کا خاتمہ کر دیا جائے
اب سلیم ابن صبحان نے خاندان سعود کو عید کے دن ٹھکانے لگانیکی وہ سازش کی۔ جو کہ کسی گذشتہ باب میں بیان ہو چکی ہے۔ اور جس میں نتیجہ کے طور پر سلیم قتل کر دیا گیا۔ اور کچھ عرصہ کیلئے ریاض عبدالرحمن کے ہاتھ آ گیا۔ اس وقت انیزہ کے باشندے اور وہاں کا حاکم ظاہل بھی ابن رشید سے ناراض تھا۔ ظاہل نے عبدالرحمن کے پاس اپنی خدمات پیش کیں۔ لیکن ابن رشید بھی غافل رہنے والا نہ تھا۔ یلغار کرتا ہُوا پہنچا۔ اور سمجھا بُجھا کر ظاہل کو رام کر لیا۔ ابن رشید نے ریاض کا محاصرہ کر لیا۔ عبدالرحمن آخیر تک مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہا۔ ابھی چالیس دن کے قریب گذرے تھے۔ کہ شہر کے باشندے محاصرہ کی سختی سے تنگ آ گئے اور عبدالرحمن کو مجبور کیا۔ کہ وہ محاصرین سے صلح کر لے۔ عبدالرحمن نے اپنے بڑے بھائی محمد اور اپنے کمسن لڑکے عبدالعزیز سلطان حال کو عبداللہ ابن عبداللطیف کے ساتھ جو کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی اولاد میں سے تھے۔ ابن رشید کے ساتھ صلح کی گفت و شنید کیلئے بھیجا۔ فریقین میں قرار پایا۔ کہ عبدالرحمن ریاض اور آرید کے حاکم کی حیثیت سے حکومت کرے۔ لیکن ابن رشید کی اطاعت کرتا رہے۔ اس تصفیہ کے بعد محمد ابن رشید واپس چلا گیا۔ جب وہ صوبہ قاسم میں پہنچا۔ تو ظاہل نے اس کے وعدوں کی ایفا چاہی۔ ابن رشید نے ٹال دینا چاہا۔ ظاہل اڑ بیٹھا۔ اور جنگ کیلئے تیار ہو گیا۔ یہ واقعہ جنوری ۱۸۹۱ء میں پیش آیا۔ ظاہل اور اُسکے ہمراہیوں نے خُوب دادِ شجاعت دی۔ لیکن کیونکہ جنگ و حرب کا زیادہ تجربہ نہ تھا۔ اسلئے ابن رشید کے ہاتھوں شکست فاش کھائی۔ ظاہل اور اس کا لڑکا علی مارا گیا۔ خالد السلیم بھی قتل ہو گیا۔ قاسم کے تقریباً ایک ہزار جوان اس معرکے میں کھیت رہے۔ عبدالرحمن ظاہل کی مدد کیلئے چل پڑا تھا۔ کہ راستہ میں اسکی ہزیمت کی خبر سُنی۔ وہ جلدی سے ریاض واپس آ گیا۔ اور ابن رشید کے انتقام کے خوف سے اہل و عیال سمیت ریاض چھوڑ کر الحسا کی طرف چل دیا۔ اس اجمال کی تفصیل کسی اور باب میں بیان ہو چکی ہے۔

اس کے بعد ابن رشید بلا مزاحمت اندرون عرب پر فرمانروائی کرتا رہا۔ قبیلہ شمّار کے لوگ اس حکمران کے عہد میں رفتہ رفتہ آسودہ حال ہو گئے تھے۔ دیگر صوبجات کے لوگ بھی جسقدر نقصانات گذشتہ جنگوں میں برداشت کر چکے تھے۔ اُنکی تلافی کرنے لگے۔ اندرون ملک میں تجارت کی ترقی ہو گئی۔ ابن رشید ہر معاملے میں تدبر سے کام لیتا تھا۔ اور حتی الامکان جنگ پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ لیکن

اُسکی سلطنت کی سب سے بڑی ضرورت ایک عمدہ بندرگاہ کی تھی کیونکہ اس کے پاس کوئی بندرگاہ نہیں تھی۔ اسلئے وہ اشیاء و اجناس بالخصوص اسلحہ و بارود کی درآمد کے معاملہ میں ہمیشہ اغیار کا دست نگر رہتا تھا اسی لئے اُسے بادلِ ناخواستہ والئے کویت سے خوشگوار تعلقات رکھنے پڑتے تھے۔

اس عرصہ میں کویت کے حالات میں قابل ذکر تبدیلی ہو رہی تھی۔ مبارک نے محمد ابن صباح اور جراح اپنے حقیقی بھائیوں کو قتل کر کے خود ریاست پر قبضہ کر لیا تھا۔ عبدالرحمٰن صحرانوردی کے بعد کویت میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ ذکر آچکا ہے۔ کہ مبارک بیدار مغز حکمران تھا اور عرب رؤسا میں وہی شخص تھا جو مغربی سیاست کو سمجھتا اور اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا مبارک کے سامنے عبدالعزیز ابن عبدالرحمٰن آل سعود (موجودہ سلطان) نے زانوئے ادب تہہ کیا۔ اور سیاست و تدبر کے ابتدائی سبق سیکھے۔ محمد ابن رشید والئے کویت سے پہلے ہی بدظن تھا عبدالرحمٰن اور خاندان سعود کی مستقل سکونت سے اور بھی بدگمان ہو گیا لیکن مبارک انگریزوں سے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا حکومت انگلشیہ ہر آڑے وقت میں اسکی مدد کرتی تھی۔ ابن رشید بھی حالات کی رفتار سے بے خبر نہ تھا۔ اور مبارک والئے کویت کو چھیڑ کر زبردست انگریزی حکومت سے برسرِ پرخاش نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لیکن پھر بھی مبارک والئے کویت اور سعدون پاشا منتفق کے شیخ کے اتحاد سے خائف رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اگر اسکی مملکت کی سرحد پر جنگ چھڑی۔ تو اندرونِ ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھیگی۔ کیونکہ وہابی گو اُسکی حکومت و اطاعت کو بالفعل قبول کر چکے تھے لیکن بقائے سلطنت کے بارے میں مستعد اور گرمجوش نہ تھے۔

ابن رشید کے عہد کے آخر میں چند لوگوں نے اُسے جنگ کرنیکی ترغیب دی لیکن وہ اب جنگ کی مشقت اٹھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ عبدالعزیز ابن متعب کو جو کہ اس کا جانشین ہونیوالا تھا نصیحت کر چکا تھا۔ کہ کویت کے ساتھ جنگ کرنے سے حتی الوسع اجتناب کیا جائے۔

۱۸۹۷ء میں اٹھائیس برس دادِ حکمرانی دینے کے بعد محمد ابن عبداللہ ابن رشید راہئے ملکِ عدم ہوا۔ یہ شخص اپنے زمانے اور اپنے ملک کا سب سے باعظمت انسان تھا۔ جنگ اور تدبر دونوں کی بے نظیر صلاحیتیں رکھتا تھا۔ وہ نہ صرف آل رشید کا سب سے با سطوت بادشاہ تھا۔ بلکہ اس کی مساعی سے خاندان رشید کو قیام و استحکام حاصل ہوا۔ جب تک زندہ رہا کسی عرب رئیس کو سر اٹھانا نصیب نہ ہوا۔ اسکی آنکھیں بند ہوتے ہی خاندان رشید کی عظمت و وقار میں زوال آنا شروع ہو گیا۔

خاندان رشید کے عروج کے واقعات بیان کرنیکے بعد اور زوال کا المناک قصہ شروع کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کو یہ بتا دیا جائے۔ کہ آل رشید نے آل سعود کے برخلاف ترکوں کی اطاعت کیوں اختیار کی۔ اور خود مختارانہ زندگی کو کیوں خیر باد کہی۔ یوں تو عرب ریاستیں ویسے ہی دیرپا اور مستحکم نہیں ہوتیں۔ لیکن آل رشید میں ترکی سلطنت کی ماتحتی کیوجہ سے آزادانہ روح پیدا ہی نہ ہو سکی۔ بلکہ آزادی کے والہانہ جذبے کی بجائے تنعم اور تعیش کے خیالات پیدا ہوتے گئے۔ اس آرام طلبی اور آسان کوشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نامور خاندان کے افراد میں صحرا میں حکومت کرنے کی استعداد مفقود ہو گئی۔ قبائل شمار کی آبادی دیگر عرب قبائل کے مقابلہ میں عراق و شام کے مہذب و متمول علاقوں سے قریب تر واقع ہوئی تھی۔ اور شمار کے لوگ صحرا کی پر صعوبت زندگی کے مقابلہ میں تہذیب شائستگی کی تن آسانی کی زندگی کے شائق ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ حائل کی ریاست اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی دولت عثمانیہ کے مقابلے میں ہیچ تھی۔ ترکوں سے یہ علاقے جبر و تشدد سے کسی طرح سے بھی لئے نہ جا سکتے تھے۔ ترک گئے گذرے وقت میں بھی مرد میدان تھے۔ شماریوں میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار نہ تھا۔ اور نہ ہی قومی سلطنت قائم ہوئی تھی۔ آرام کی صورت صرف یہ تھی کہ آل رشید ترکوں کی اطاعت اختیار کر لے۔ اور عراق و شام کے تمول و آسودگی سے فائدہ اٹھائے جہاں آل رشید کیلئے یہ آسائشیں میسر تھیں۔ وہاں خاندان سعود کیلئے صحرا اور آزادانہ زندگی کے سوا کچھ نہ تھا چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ نجد کے وہابیوں میں آزادی کی خواہش اور محبت دن بدن بڑھتی گئی اور آل رشید کی اولوالعزمی کم ہوتے ہوتے عربیت سے بھی ناآشنا اور بے بہرہ کر گئی۔ قومی خیالات کے فقدان کا لازمی اثر یہ ہوا کہ آل رشید کی طاقت کا تمام تر حصر اور مدار ترکوں پر رہ گیا۔ جبتک ترکوں کا اقتدار جزیرۃ العرب میں قائم رہا۔ آل رشید بھی برائے نام حکمرانی کرتے رہے۔ جونہی ترکوں کا تسلط اٹھا۔ یہ مشہور و معروف خاندان بھی گمنامی اور ذلت کے گڑھے میں جا پڑا۔

باب دہم

سلطان کی ترکوں سے آویزش

جب سلطان خاندان رشید کے اثر و اقتدار کو حدود نجد سے معدوم کر چکا۔ تو اسکی توجہ دو باتوں پر منعطف ہوئی۔ ایک تو اپنی ہمعصر اور ہمچشم عرب ریاستوں سے اپنی حیثیت تسلیم کرانا تھا۔ اور دوسرا مفتوحہ علاقہ جات کا باقاعدہ نظم و نسق کرنا تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سلطان کو انہی ایام میں بدوی قبائل کو بعض مخصوص مقامات پر آباد کرنیکا خیال پیدا ہوا۔ جیسا کہ بیان ہو گا۔ اس پالیسی پر عملدرآمد جنگ عظیم سے پیشتر ہی شروع ہو چکا تھا گو پایۂ تکمیل کو پہنچنے کیلئے بہت مدت درکار تھی کسی اور مقام پر اس پالیسی کے مقاصد و فوائد بالتفصیل بیان ہونگے۔

سلطان کو اتنی بات کا بخوبی احساس تھا کہ اگر اس نے اپنے بزرگوں کے رویہ اور نظم و نسق میں اہم ترمیمات نہ کیں۔ تو جس طرح کہ آباؤ اجداد کے وقت میں نجد کی نو مفتوح وسیع سلطنت برف کے تودے کی طرح دیکھتے دیکھتے بہہ گئی تھی۔ اسی طرح مناسب استحکامات کے بغیر اس کا دوبارہ تباہ ہو جانا چنداں عجب نہیں۔ اپنے متقدمین کے بعض علاقے تو اس وقت تک سلطان نے فتح کر لئے تھے۔ اب انکی محافظت اور مدافعت کے انتظامات بیحد ضروری تھے۔

سلطان کو اس وقت دنیا کی عظیم طاقتوں میں سے صرف سلطنت عثمانیہ اور سلطنت انگلشیہ سے ہی بوجہ ہمسائیگی تعلق تھا۔ گو سلطنت انگریزی کے ماتحت براہ راست عرب کا کوئی علاقہ نہ تھا۔ لیکن اس حکومت کو خلیج فارس اور ساحلی ریاستوں میں اس قدر اثر و نفوذ حاصل تھا۔ کہ سلطان کیلئے اس سے تعلقات پیدا کرنا تقریباً ناگزیر تھا۔ سلطنت عثمانیہ کی سیادت تو برائے نام پورے عرب پر قائم تھی۔

یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ گو سلطان جنگ عظیم کے دوران میں ترکوں سے براہ راست برسرپیکار نہیں ہوا لیکن پھر بھی آبائی مخاصمت کی وجہ سے اپنے علاقہ میں ان کا رسوخ قائم رکھنا نہیں چاہتا

تھا کشیدگی کا مزید باعث یہ ہُوا کہ خاندان آل رشید سے سلطان کی پشتینی عداوت تھی۔ اور ان سے جنگ کا سلسلہ چھڑ چکا تھا لیکن ترک بات بات پر ان کی حمایت کرتے تھے بعض مؤرخین نے یہانتک لکھا ہے کہ سلطان اسی زمانے سے ترکوں کو جزیرۃ العرب سے بیدخل کرنا چاہتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک سلطان کی عظمت وحشمت اس قدر بڑھی ہوئی نہ تھی۔ کہ پورے عرب پر حکمران ہونیکے خواب دیکھنا ابھی تک اسکی دلچسپیاں اور ہنگامہ آرایاں محض مقامی تھیں۔ بیرونِ نجد سے تعلق نہ تھا۔

کویت کی جلاوطنی کے زمانے میں سلطان کو یورپین تدبر اور سیاست کا مشاہدہ ہو چکا تھا اور سلطان خُوب جانتا تھا کہ مغربی اقوام کیساتھ سیاسی گفت وشنید کسقدر قابلیت کا کام ہے سلطان کو اب خواہش پیدا ہوئی کہ ترکوں کی بجائے انگریزوں سے تعلقات و روابط قائم کئے جائیں پیشتر ازیں بیان ہو ہو چکا ہے۔ کہ سلطان ابتک جنگ و جدل میں مذہب کی آڑ نہیں لیتا تھا۔

اسی زمانے میں حائل اور کویت کی جھڑپ ہوئی تھی۔ اور ترکوں نے حائل کو اس خیال سے مدد نہیں کی تھی۔ کہ کویت انگریزوں کے زیر حمایت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ حائل کی مدد کرنے میں انگریزوں سے مُٹھ بھیڑ ہو جائے لیکن حائل اور ریاض کی جنگ میں ترک اپنے وفادار حلیف حائل کی مدد پر آدھمکے۔ مئی ۱۹۰۴ء میں جبکہ سلطان شہر بریدہ کو فتح کر چکا تھا۔ اور انیزہ پر حملے ہو رہے تھے۔ ترکی حکومت نے آٹھ پلٹنیں احمد فیضی پاشا نامی مشہور و معروف جرنیل کی قیادت میں ابن سعود پر چڑھائی کرنیکے لئے روانہ کیں۔ احمد فیضی پاشا حائل کی افواج کو ساتھ لیتا ہُوا بڑے طمطراق سے صُوبہ قاسم کو دباتا ہُوا اندرون نجد کی طرف بڑھا۔ اب سلطان کا مقابلہ بدوی قبائل سے نہ تھا۔ بلکہ ایک منظم و مسلح فوج سے تھا جس کا سپہ سالار بہترین عسکری تجربہ رکھتا تھا۔ اور مختلف میدانوں میں سرخروئی و نیک نامی پیدا کر چکا تھا۔

بقیریہ کے مقام پر ۱۵ جون ۱۹۰۴ء کو جنگ شروع ہوئی۔ ترک سپاہی حسب معمول متین اور بہادر تھے۔ اور ابن سعود کے عرب وحشی مگر جنگجو۔ بڑے معرکے کا مقابلہ ہُوا۔ اگر ابن سعود کو مکمل شکست ہو جاتی تو اس کی بربادی یقینی تھی۔ فریقین کے سینکڑوں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ ابن سعود خود زخمی ہُوا۔ ہاتھ میں گولی لگ گئی تھی۔ اسکی فوج کے ایک ہزار سے زائد آدمی ضائع ہو گئے۔ ترکوں کے نقصانات بھی تقریباً اتنے ہی تھے۔ اٹھارویں صدی میں ۱۷۴۶ء و ۱۷۷۳ء تک کی مسلسل لڑائی میں وہابیوں کے صرف ۱۷۰۰ سو آدمی مارے گئے۔ اور مخالفین کے ۲۳۰۰ سو افراد ضائع ہوئے تھے۔

ترکوں کو فیصلہ کن فتح تو نصیب نہ ہوئی لیکن پھر بھی ابن سعود کو مجبوراً میدان سے ہٹنا پڑا لڑائی کے دوران میں صُوبہ قاسم کے بعض سپاہیوں نے حائل کی فوج کے چند خیمے و خرگاہ لوٹ لئے تھے لیکن جب اُنہیں معلوم ہوا کہ ان کا محبوب حکمران میدان جنگ سے ہٹ گیا ہے۔ تو وہ بھی دلشکستہ و محزون ہو کر بھاگ گئے۔

ترک فاتحین نے بقیہ کی گرمی سے بچنے کیلئے رآس کی طرف مراجعت کی۔ ابن سعود نے موقعہ پا کر ترکوں کی رسد پر ہاتھ صاف کیا۔ اس لوٹ گھسوٹ کو دیکھکر نجدی سپاہیوں میں پھر حوصلہ پیدا ہو گیا۔ اور از سر نو آزمائی کی فکر ہوئی۔ رآس کو دشمنوں کے ہاتھ سے بچانے کیلئے فوراً جا پہنچے۔ ترک بھی اس عرصے میں چوکنے ہو گئے تھے شنانا کے مقام پر ترکوں اور عربوں کا پھر آمنا سامنا ہوا لیکن پچھلی جنگ کا تجربہ اس قدر تلخ تھا کہ فریقین میں سے کسی کو بھی پہل کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ایک دوسرے کے سامنے خیمہ زن تھے لیکن لڑائی شروع نہ ہوئی۔ البتہ ترک کبھی کبھی گولہ برساتے رہے۔ گرمی شدت کی تھی۔ اسی طرح پورے تین مہینے گذر گئے۔ یہ وقت بڑا کٹھن تھا۔ نجدیوں کی حالت ناقابل برداشت تھی۔ یہ لوگ اچانک حملہ کرنے کے عادی تھے جم کر لڑنے کی عادت نہ تھی۔ اب تین مہینے کا حوصلہ فرسا انتظار کرنا پڑا تو بغاوت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ابن سعود خود دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ اور کسی نہ کسی طرح اس مخمصہ کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ نجدیوں میں ہیضہ نمودار ہو گیا۔ اور بہت سی جانیں تلف ہوئیں مجبوراً ابن سعود نے صلح کا پیغام دیا لیکن ابن رشید نے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اُسے نجدیوں کی ناگفتہ بہ حالت معلوم تھی۔ اور جانتا تھا کہ عنقریب ابن سعود کے خلاف بغاوت ہونیوالی ہے۔ اس جنجال کا اس طرح پر فیصلہ ہو جائیگا۔ تو خرخشہ مٹ جائیگا۔ ابن رشید سکھ چین کی نیند سوئیگا۔

آخر کار قدرت کی طرف سے ابن سعود کو مدد پہنچی۔ اور بچاؤ کی صورت پیدا ہو گئی۔ بدوؤں کی عادت ہے کہ سال کے مقررہ اوقات پر اپنے مویشیوں کو چرانے کیلئے نکلتے ہیں۔ وہ وقت اب آ پہنچا تھا ابن رشید کے سپاہیوں نے اپنے وطن کو واپس جانے کی ضد کی ابن رشید کو مجبوراً جنگ سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔ ابن رشید کی دیکھا دیکھی ترک بھی واپس لوٹے۔ یہ جنگ ابن رشید کی حمایت میں تھی۔ جب وہی جنگ سے گریز کرے۔ تو ترکوں کو کیا مصیبت پڑی تھی کہ عرب کے گرما اور صحرا کی صعوبتیں جھیلیں۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ حفاظت لوٹیں نجدیوں کے رسالے نے ان پر حملہ کر دیا لیکن

خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی ترک مقابلہ کیلئے جم گئے۔ یہ دیکھکر ابن سعود نے ترکوں کے قلب پر چند جانثاروں کو لیکر بنفس نفیس حملہ کیا۔ بظاہر یہ کوشش بھی بے معنی نظر آتی تھی لیکن نجدیوں نے اپنے امام کو دیکھا۔ تو ان میں بھی بیحد جرأت و شجاعت پیدا ہوئی۔ ترک عرب کی گرمی سے پہلے ہی نیم جان ہو چکے تھے۔ نجدیوں کے حملوں سے دق ہو کر بھاگے۔ انکی حالت دیکھکر ابن رشید کی فوج میں کھلبلی پڑ گئی اور حواس باختہ اور ہراساں ہو کر بھاگی۔

ابن سعود نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ فتح مکمل تھی۔ نجدیوں نے سب مال و متاع اور نقدی لوٹ لی۔ بہت سا گولہ بارود اور اسلحہ ہاتھ آیا۔ غالباً اتنا مال غنیمت اس سے پیشتر کبھی نہ ملا تھا۔ ترک مفتوحین کی حالت ناگفتہ بہ تھی بعض گرفتار ہوئے۔ اکثر نے بھاگ کر جان بچائی۔ بعض فاقہ و تشنگی کیوجہ سے صحرا میں تڑپ تڑپ کر مر گئے

ترکی حکومت یمن کے معاملات کے متعلق بہت متفکر تھی۔ وہاں امام یحییٰ نے بغاوت کر رکھی تھی مجبور ہو کر عثمانی حکومت نے نجد و حائل کے معاملات کو نظر انداز کر دیا اور اپنے کام سے کام رکھا لیکن اس جنگ سے ابن سعود کا مقصد ترکوں کی بیخکنی نہ تھا۔ وہ خاندان رشید کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ ترکی سپاہ مقابلے سے ہٹ گئی۔ لیکن ابن رشید ابھی تک مطیع و منقاد نہ ہوا تھا۔ گو اسکی طاقت بہت ہی کمزور ہو گئی تھی۔

جنگ کے بعد ابن سعود صوبہ قاسم میں ہی مقیم رہا۔ اور اپنی حکومت کے استحکامات کرتا رہا۔ اس عرصہ میں اُسے معلوم ہوا۔ کہ کویت اور حائل کے درمیان اس کے خلاف کچھ مفاہمت ہوئی ہے۔ ابن سعود کو اس انکشاف سے بیحد رنج ہوا کیونکہ وہ مبارک والئے کویت کا بیحد مداح و معترف تھا۔ اور اس سے معاندانہ رویہ کی توقع نہ رکھتا تھا۔ ابن سعود نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ رشید کی مکمل تباہی میں اب کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھنا چاہئے۔ ابن رشید ابھی فیصلہ کن جنگ نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ابن سعود نے اس کو مجبور کر دیا۔

بریدہ کے قریب روضتہ المہنا کے مقام پر نجد اور حائل کی فوجوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ ابن رشید کے سپاہی نجدیوں کے حملوں کی تاب نہ لا سکے۔ اور بے ترتیب ہو کر بھاگے۔ ابن رشید نے بہت کوشش کی لیکن اُنہیں تھام نہ سکا۔ ابن سعود کے چند آدمی ابن رشید کی مساعی کو دیکھ رہے تھے۔ ایک نے بڑھکر ابن رشید کو گولی سے مار دیا۔ اس طرح پر ابن سعود کے اس بہادر دشمن کا خاتمہ ہوا۔

ابن رشید کی وفات کے بعد عرب کے عام دستور کے مطابق اسکے جانشینوں کی آپس میں خانہ جنگی شروع ہو گئی جس کی وجہ سے اس نامور امارت کی رہی سہی طاقت بھی زائل ہو گئی۔

باب یازدہم

باہمی بدگمانیاں قبیلہ مطیر کی بغاوت اور بربادی

اسوقت ابن سعود کی عمر تقریباً ۴۷ برس کی تھی۔ وُہ مضبوط۔ توانا اور تندرست تھا جسم لاغر لیکن بے انتہا مشقت کا عادی تھا۔ اسکی ہمت و شجاعت کی شہرت سارے عرب میں پھیل چکی تھی۔ وُہ ترکوں کو ہزیمت دے چکا تھا۔ اپنے ہیبتناک دُشمن ابن رشید کو تباہ و برباد کرچکا تھا۔ اور قوت بازو کے زور سے پُورے نجد کو زیرنگیں کرچکا تھا۔

لیکن اسکی سلطنت کو ابھی کلی استحکام حاصل نہ ہُوا تھا۔ اندرُونی اور بیرونی دونوں طرح کے خطرات موجود تھے۔ عرب کے قبائل کو اسکی اطاعت کی عادت پُختہ طور پر نہ پڑی تھی۔ عرب بالطبع مُدت تک کسی کے مطیع و منقاد ہو کر رہنا نہیں جانتے۔ جب تک حکمران میں خاصی طاقت باقی رہتی ہے۔ یہ لوگ ماتحت رہنا گوارا کرتے ہیں۔ لیکن جونہی کہ کوئی معمولی سی شکست ہوئی۔ یہ لوگ بھروسہ کے قابل نہیں رہتے چھوٹی سی بات پر بگڑ بیٹھتے ہیں۔

یہ لوگ ابن سعود کے ساتھ صرف عقیدت کیوجہ سے ہی شامل نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ سمجھتے تھے کہ ابن رشید کی تباہی کے بعد لُوٹ گھسوٹ کی آزادی مل جائیگی۔ لیکن نظم و نسق کے معاملہ میں ابن سعود ابن رشید سے بھی سخت واقعہ ہُوا تھا۔ اُس نے حکم دیدیا۔ کہ کوئی قبیلہ اسکی اجازت کے بغیر حملہ نہ کرنا پائے اور اگر کوئی حکم عدولی کریگا۔ تو سخت سزا دی جائیگی۔ قبائل کو یہ حکم بہت ہی ناگوار گذرا۔

ریاض میں علماء کی جماعت ابن سعود کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔ کہ ابن سعود خوش عقیدہ نوجوان تھا۔ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ اور صدقہ و خیرات بھی کثرت سے دیتا تھا۔ بظواہر شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ نہ قسم سوگند لینے کا عادی تھا۔ نہ ہی حقہ تمباکو پیتا تھا۔ غرضیکہ اس کی زندگی اسلامی اخلاق و احکام کے عین مطابق تھی۔ لیکن پھر بھی علمائے شریعت اس کی بعض عادات پر معترض تھے۔ وُہ خوش و خرم زندگی بسر کرتا تھا۔ ہنستا کھیلتا بھی تھا۔ ان علماء

کے نزدیک بیٹھنا نامناسب تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا۔ کہ ابن سعود نے لمبی مسافتوں میں لوگوں کو گانے کی اجازت بھی دیدی تھی جب اس نے انیزا شہر فتح کیا۔ تو وہاں کے لوگ اعلانیہ تمباکو پیتے تھے۔ اور ابن سعود نے انکو سزا نہ دی تھی۔ اسکی دوستی شیخ مبارک سے تھی۔ اور دُنیا جانتی ہے کہ شیخ مبارک صحیح معنوں میں اسلامی معاشرت کا پابند نہ تھا۔ ابن سعود نے غیر ملکی لوگوں سے تعلقات پیدا کر لئے تھے۔ اور اپنے ملک کی سیاحت کیلئے انکی حوصلہ افزائی بھی کی تھی۔ یہ وہ باتیں تھیں جنکو خشک مزاج وہابی بدگمانی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اور ملکوں میں تو ایسی باتوں پر توجہ ہی نہیں کی جاتی لیکن نجد کے اخلاقی کا معیار اس قدر سخت اور بلند ہے۔ کہ خفیف سے خفیف باتیں بھی فروگذاشت نہیں ہو سکتیں۔

جب ابن سعود کو ان بدگمانیوں کا علم ہوا۔ تو اُس نے اپنے والد ماجد عبدالرحمن سے مشورہ کیا۔ وہابی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اور ان کے ہر ارشاد کی تعمیل کرتے تھے۔ انہوں نے ابن سعود کو حزم و احتیاط سے رہنے کا مشورہ دیا۔ ابن سعود کو پہلو بچا کر گذر اوقات کرنا پڑتا تھا کیونکہ طبعاً وہ گرم مزاج تھا۔ اسلئے وہ علماء کی مداخلت کو دل سے پسند نہیں کرتا تھا لیکن کیونکہ نجد میں ہر وہابی اپنے تئیں ہر شخص کی ضمیر کا بالعموم اور امیر ریاض کی ضمیر کا بالخصوص نگران سمجھتا ہے اس لئے ابن سعود کو مجبوراً درگذر کرنا پڑتا تھا۔

اس وقت بیرون نجد سے بھی خطرات لاحق تھے۔ شیخ مبارک کو ابن سعود کی کامیابیاں بھاتی نہ تھیں۔ شیخ مبارک کی پالیسی مدۃ العمر یہ رہی تھی کہ نجد کے امیروں میں توازن قائم رکھا جائے۔ اور اس ذریعے سے کویت کی مدافعت کیجائے۔

جسوقت ابن سعود کویت میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ تو شیخ مبارک اس کے ساتھ مربیانہ سلوک کرتا تھا۔ اب جبکہ وہ نجد کا طاقتور امیر بن گیا تھا۔ تو بھی شیخ مبارک مربیانہ سلوک کرتا رہا۔ اور اُسے اکثر نصیحتیں کرتا رہتا تھا۔ ابن سعود کو بسا اوقات انکار کرنا پڑتا تھا۔ وہ شیخ کے مربیانہ انداز کو بھی پسند نہ کرتا تھا۔ ابن سعود اور شیخ مبارک کے تعلقات بظاہر تو دوستانہ تھے لیکن شیخ نے اندرونی طور پر اس کے خلاف سازشیں شروع کر دی تھیں۔ ابن سعود نے بھی اپنے بچاؤ کی راہیں اختیار کیں۔ ترکوں سے سمجھوتہ کر لیا۔ اور ترکی حکومت نے اسے مالی امداد دی۔

کویت اور نجد کے درمیان مطیر کا مشہور و معروف قبیلہ آباد تھا۔ یہ لوگ طبعاً خود سر اور سرکش تھے

ابن سعود ان پر حکومت کرنا چاہتا تھا۔ شیخ مبارک نے ان کے سردار فیصل الدویش کو غزوات کے لالچ سے اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ شخص بڑا جنگجو اور جھگڑالو تھا۔ شیخ مبارک نے ابن رشید کو بھی قبیلہ مطیر کی مدد کی ترغیب دلائی۔ بعد ازاں بریدہ کے حاکم کو ابن سعود کے خلاف بغاوت کرنے پر اکسایا۔ شیخ نے خود کوئی مخالفانہ کاروائی نہ کی۔ لیکن ابن سعود کو بخوبی معلوم تھا۔ کہ ہر معاندانہ کاروائی میں شیخ کا ہاتھ ہے۔

جونہی کہ ابن سعود کو معلوم ہوا۔ کہ بریدہ کے حاکم نے بغاوت کا علم کھڑا کیا ہے۔ وہ ریاض سے لشکر لے کر چل پڑا۔ حاکم کی مدد کیلئے قبیلہ شمار کے نوجوان پہنچ چکے تھے۔ اور شہر کے باہر موجود تھے۔ ابن سعود نے فی الفور ان پر حملہ کر دیا۔ لڑائی کے دوران میں ابن سعود گھوڑے سے گر پڑا۔ اسکی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی غروب آفتاب تک لڑائی ہوتی رہی کسی فریق کو بھی فتح نصیب نہ ہوئی۔ تمام رات ابن سعود کے گلے میں سخت درد ہوتا رہا۔ لیکن اس نے حوصلہ نہ ہارا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اگر اس نے کمزوری و عاجزی کا اظہار کر دیا۔ تو اسکی سپاہ شکست کھا جائیگی۔ دوسرے دن صبح سویرے اس نے فوج کی خود قیادت کی۔ اور دوپہر ہوتے تک قبیلہ شمار کو مار بھگایا۔ اس کے بعد مطیر کے قبیلہ پر حملہ کر کے انہیں پسپا کر دیا۔ اور دور تک ان کا تعاقب کر کے ان کی سرکوبی کر دی۔ اس نے فیصلہ کیا۔ کہ مطیر کو ایسا سبق دیا جائے۔ کہ ہمیشہ تک یاد رکھیں۔ یہ لوگ پہلے بھی اسکی اطاعت اختیار کر چکے تھے لیکن موقع پاتے ہی باغی ہو کر دشمنوں سے جا ملتے تھے پہلی دفعہ اس نے تحمل و بردباری سے سلوک کیا تھا۔ اب ارادہ کیا۔ کہ تمام باغیوں کیلئے ایک مثال قائم کر دے۔ چنانچہ اس نے باغی قبائل کے اکثر مردوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ ان کے متعدد دیہات جو کہ کویت کی سرحد تک پھیلے ہوئے تھے۔ لوٹ لئے۔ فیصل الدویش نے بھاگ کر جان بچائی۔ بہت سے سرکردہ آدمی جان سے مارے گئے۔ اس قبیلہ کی تباہی اور بربادی ایسی مکمل طور پر ہوئی۔ کہ ملک بھر کے لوگوں کو عبرت حاصل ہو گئی۔ اور پھر بغاوت کرنے کی جرأت آسانی سے پیدا نہ ہوئی۔

ابن سعود اگر ایک دفعہ تہیہ کر لے تو نہایت سختی اور جبر کا سلوک کرتا ہے۔ پھر رحم کا نام تک نہیں جانتا۔ وہ کہا کرتا ہے کہ میں بدوؤں کے منہ پر تلوار مارتا ہوں۔ صرف یہی دلیل ہے جس کو وہ سمجھ سکتے ہیں متعدد واقعات سے یہ امر ثابت ہو گیا ہے۔ کہ یہ شمشیر خارا شگاف نیام میں نہیں آتی تاوقتیکہ یہ لوگ بخوبی مطیع نہ ہو جائیں۔

اس کے بعد وہ بریدہ کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں کے حاکم کو اس نے خود مقرر کیا تھا۔ اور وہ اب تک

بغاوت پر ڈٹا ہؤا تھا۔ شہر کے دروازے بند تھے۔ اور حاکم کی فوج پہرہ چوکی پر متعین تھی۔ لیکن شہر کے اندر بعض لوگ ابن سعود کے وفادار بھی تھے۔ حاکم اور اسکی سپاہ مغرب کے وقت مسجد میں نماز ادا کر رہی تھی۔ کہ ان لوگوں نے شہر کے دروازے کھولدئے۔ ابن سعود شہر کے اندر داخل ہوگیا۔ حاکم کو سعودی سپاہ نے حراست میں لیلیا۔ اور ابن سعود کے حضور میں پیش کیا۔ وُہ سمجھتا تھا کہ اسے جان سے ماردیا جائیگا۔ لیکن ابن سعود نے اسکی طرف بنظرِ حقارت دیکھکر صرف اتنا کہا۔ کہ اُٹھو اور جلد از جلد حدود نجد سے باہر نکل جا۔

لیکن اس نے تہیّہ کرلیا۔ کہ آئیندہ اس شہر میں بغاوت نہ ہونے پائے۔ شہر کی فصیل نہائت مضبوط تھی۔ یہاں کے لوگ بدطبیعتی اور شورہ پشتی میں مشہور تھے۔ یہ شہر شمالی نجد کی کُنجی تھا۔ اور تجارت کا خاص مرکز۔ باشندے متعدد بار بغاوتیں کرچکے تھے۔ تمام باتوں کو ملحوظ خاطر رکھکر ابن سعود نے اپنے بھائی جلیوی کو یہاں کا حاکم مقرر کردیا۔ جلیوی کی سخت گیری اور انتظام کی دھاک دُور ونزدیک بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ شخص کوتاہ قد لیکن بہت مضبوط ہے۔ زبردست قوت فیصلہ رکھتا ہے۔ مشہور شہسوار ہے۔ نظم ونسق کے معاملات میں بے نظیر قابلیت رکھتا ہے۔ ابن سعود سے بیحد محبت وعقیدت رکھتا ہے۔ وفاشعاری میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔ اس شخص کے دل میں ذاتی رفعت کا کبھی خیال پیدا نہیں ہؤا قانون کے نفاذ میں یدِطولےٰ رکھتا ہے۔ رعیّت کے دل میں اس کا خوف طاری رہتا ہے۔ جب سے یہ حاکم ہؤا ہے بریدہ اور شمالی نجد میں بغاوت یا بدانتظامی نہیں ہوسکی۔

باب دوازدہم

خاندانِ سعود کے بعض افراد کی فتنہ انگیزی اور بغاوتِ عوارف

ابن سعود جب ریاض پہنچا تو طرح طرح کے معاملات پھر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ گذشتہ سال انجمن اتحاد و ترقی نے سن رسیدہ سلطان عبدالحمید کو تختِ سلطنت سے معزول کردیا تھا۔ اس انجمن کے سربرآوردہ ارکان نے معزول شدہ سلطان کی پالیسی کو برقرار رکھا۔ لیکن کیونکہ وُہ جوان اور مستعد تھے۔ اسلئے نفاذِ اصلاحات

کے بارے میں سرعت سے کام لینے لگے۔ اُنہوں نے مرکزی حکومت کو زیادہ منظم بنانے کی سعی کی۔ اور عرب کے صوبجات میں زیادہ سے زیادہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اُنہوں نے دمشق سے مدینہ منورہ تک جو ریل سابق سلطان نے تعمیر کرنی شروع کی تھی مکمل کر دی۔ اور حسین ابن علی نامی ایک شخص کو شریف مکہ اور حاکم حجاز مقرر کر دیا۔ اس ریلوے سے ایک فائدہ تو یہ ہوا۔ کہ حجاج کی آمد و رفت میں بہت سہولیت پیدا ہو گئی۔ دوسرے فوج کی نقل و حرکت میں بہت آسانی ہو گئی۔ اور حجاز میں ترکی حکومت کا اثر و نفوذ بڑھ گیا۔

حسین ابن علی اسوقت کے ترکی حکام کا عام نمونہ تھا۔ اس کی عمر کا بیشتر حصہ قسطنطنیہ میں صرف ہوا تھا۔ اور وہیں اسکی اولاد نے پرورش پائی تھی۔ یہ شخص پہلے بھی عہدہ ہائے عالیہ پر متمکن رہ چکا تھا۔ وہ ایک حد تک ضدی۔ خود سر۔ خود پسند اور وہمی طبیعت کا تھا لیکن ساتھ ہی بیحد خلیق۔ متین اور خوش گفتار تھا۔ اس زمانے میں اُسے ترکی حکومت کا کلی اعتماد حاصل تھا۔

شریف حسین کی تقرری کیساتھ ہی اُس کی ابن سعود سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ نجد اور حجاز کے درمیان ایک سطح مرتفع واقع ہے۔ جہاں قبیلہ عتیبہ کے لوگ اپنے مویشی چرایا کرتے ہیں۔ نجد کے تجارتی قافلے اسی راہ سے گذرتے ہیں۔ یہ جگہ حجاز کیلئے بڑی عسکری اہمیت رکھتی ہے۔

قبیلہ عتیبہ ابن سعود کی اطاعت میں تھا۔ وہ اُن سے خراج بھی وصول کیا کرتا تھا۔ شریف حسین اس واقعہ کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اور اس قبیلہ کو اپنی رعیت سمجھتا تھا۔ ابن سعود مشرق کی طرف سے اس علاقہ پر چڑھ دوڑا۔ اور وہاں کے لوگوں سے بیعت لی۔ حسین نے حجاز سے اپنے بیٹے عبداللہ کو اس قبیلہ پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا۔ اس مہم میں ابن سعود کا بھائی سعد بھی شامل تھا۔ اور تاخت و تاراج کر رہا تھا۔ حسین یمن میں ترکوں کی مدد کیلئے گیا ہوا تھا۔ جونہی کہ وہاں ترکوں کو فتح حاصل ہوئی شریف نے حجاز کو مراجعت کی۔ اور راستے میں سے عتیبہ کو اطاعت پر مجبور کرتا گیا۔ اتفاق سے شریف کی مٹھ بھیڑ سعد سے ہو گئی۔ سعد کے ساتھ مختصر سی جمعیت تھی تھوڑی سی مزاحمت کے بعد سعد گرفتار ہو گیا۔

ابن سعود شریف حسین پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر ہی رہا تھا۔ کہ جنوب کی طرف سے ایک اور خطرہ نمودار ہوا۔ ابن سعود کے چچا سعود کے لڑکے جنہوں نے ایک وقت میں اس کو الحسا میں زک دی تھی جبکہ وہ غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا اور امن و اطمینان کی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ یہ [illegible]

تھے کہ ریاض اور نجد کے حقیقی وارث وہ ہیں۔ انہوں نے قبیلہ عجمان کو اپنی مدد پر کھڑا کر لیا۔ اور انہیں ساتھ لیکر جنوبی نجد کی سمت سے ریاض کی طرف بڑھنے لگے۔ لیلا شہر اور گردونواح کے لوگ باغیوں کیساتھ مل گئے۔

ابن سعود نے واقعات پر غور و خوض کیا۔ اس کے دل میں بیجا غرور نہ تھا۔ نہ ہی وہ شریف حسین کی طرح ضدی اور ہٹیل تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اس بغاوت کو فرو کئے بغیر وہ شریف حسین کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ واقعات کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس نے فوراً شریف حسین سے مصالحت کر لی۔ اور سعد زر بر غمال کے طور پر ایک رقم ادا کر کے حجاز سے واپس آ گیا۔

اسکے بعد اس نے بجلی کی سی سُرعت سے کام لیا۔ ناظرین کو معلوم ہے۔ کہ اس بغاوت کی آگ دارالسلطنت ریاض کے قریب ہی بھڑکی ہوئی تھی۔ ابن سعود کے وقار کو گزند پہنچنے کا سخت احتمال تھا اگر وہ ذرا تساہل کرتا۔ معاملات کو آشتی سے نپٹانے کی کوشش کرتا۔ یا اپنے عزیزوں کے مقابلے میں شکست کھا جاتا تو اسکی طاقت و سطوت کا یقینی خاتمہ تھا۔ وہ فوراً باغیوں پر چڑھ دوڑا۔ وہ مقابلے کیلئے تیار نہ تھے۔ اس کے عزیز اس وقت موضع حریق میں موجود تھے۔ ابن سعود نے گھیرا ڈال کر انہیں گرفتار کر لیا

جونہی کہ سعود کے بیٹے بے دست و پا ہوئے قبیلہ عجمان کے لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ابن سعود کے بعض اور رشتہ دار بھی ان کے ساتھ تھے۔ بعض تو الحصا کو بھاگ گئے اور بعض نے شریف مکہ کے پاس پناہ گزین ہو کر جان بچائی۔ لیلا کے لوگ اپنے شہر میں واپس آ گئے۔ ابن سعود بھی اُن کے تعاقب میں چل پڑا۔

ابن سعود نے ارادہ کر لیا۔ کہ جس طرح مطیر کی تباہی و بربادی سے شمالی نجد کو عبرت حاصل ہوئی ہے۔ اسی طرح ہر لیلا کے باشندوں کی ایسی گوشمالی کر دی جائے کہ گردونواح کے لوگ بھی یاد رکھیں اور آئندہ بغاوت کی جرأت نہ کریں چنانچہ اس نے اس علاقہ میں چاروں طرف سپاہ پھیلا دی قطین اور حوطہ کے دیہات خاک سیاہ کر دئے۔ لیلا کا محاصرہ شروع ہو گیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد یہ شہر فتح ہوا۔ ابن سعود نے انیس آدمیوں کے جو کہ شہر کے سر برآوردہ رئیس تھے۔ تہ تیغ کئے جانے کا حکم صادر کیا۔

شہر کے باہر ایک چبوترہ بنایا گیا۔ ابن سعود نجدی مشائخ کے ساتھ وہاں بیٹھا۔ گارد کے سپاہی اسکے ارد گرد تھے۔ چوبیس ۲۴ گھنٹے پہلے اعلان عام کر دیا گیا تھا۔ کہ شہر کے باشندے اور صحرائی کثیر تعداد میں آئیں۔ اور اپنے عمائد وار اکین کی موت کا نظارہ بچشم خود دیکھیں۔ معیّنہ وقت پر لوگ ہزاروں کی

تعداد میں آموجود ہوئے۔ نجدی سپاہیوں نے اُن کی نشست کا انتظام کیا ہُوا تھا۔ محبوسین ابن سعود کے حکم پر میدان میں لائے گئے۔ حبشی غلام نے جو کہ جلاد کے منصب پر متعین تھا۔ باری باری اٹھارہ[۱۸] آدمیوں کی گردنیں اُڑادیں۔ جب ایک باقی رہ گیا۔ تو ابن سعود نے اُسے معافی دیدی۔

اس کے بعد ابن سعود کھڑا ہو گیا۔ اور بغاوت کے بارے میں ایک دُھواں دھار تقریر کی لوگوں کو اپنی سطوت و ہیبت سے ڈرایا۔ اس کے بعد اس نے لوگوں کو نزدیک بلالیا۔ اور ان سے بملائمت گفتگو کی۔ اس نے کہا۔ کہ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ اپنے لئے ایک امیر کو منتخب کریں اور اگر وہ گروہ امن و امان سے زندگی بسر کرتے رہے۔ اور فتنہ و فساد برپا نہ کیا۔ تو ان کے معاملات میں ہرگز کوئی مداخلت نہ کی جائیگی۔

اٹھارہ کشتگان کی نعشیں تمام دن ریت پر پڑی جلتی رہیں۔ اور ناظرین کے لئے عبرت کا باعث ہوئیں۔ غروب آفتاب کے بعد شعائر اسلامی کے مطابق ان کی تجہیز و تکفین کردیگئی۔

اس واقعہ کی جگہ بجگہ شہرت ہوئی۔ عرب اس سید ھے سادھے انصاف اور طاقت کے مظاہرے سے مرعوب ہو گئے۔ یہ لوگ صرف طاقت کو ہی سمجھ سکتے تھے۔ اب اُنہوں نے دیکھ لیا۔ کہ ابن سعود کی طاقت بے پناہ ہے۔ اور ان کے لئے اطاعت کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔

ابن سعود کے چچا کے لڑکے نجدیوں کی اصطلاح میں عوارف کہلاتے تھے۔ کیونکہ یہی وہ لوگ تھے جنکو ابن رشید نے حائل میں زیر حراست رکھا ہُوا تھا۔ جب ابن سعود نے ان کو دوبارہ رہائی دلوائی۔ تو یہ لوگ عوارف کے نام سے مشہور ہوئے۔ اسی اعتبار سے متذکرہ بالا بغاوت کو واقعہ عوارف کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

باب سیزدہم

نجدی بدویّوں کے بعض خصائل و خصائص

سلطنت سعودیہ کے دوبارہ قیام و استحکام اور سلطان ابن سعود کے محیّر العقول کارناموں کو پوری اہمیت کے ساتھ ذہن نشین کرنے کیلئے ضروری ہے۔ کہ نجدی آبادی کے خصائل و خصائص نگاہ میں رہیں۔

مختلف سیّاحوں نے نجدی بدوؤں کی سیرت کے اندازے مختلف کئے ہیں۔ لیکن اتنی بات بہرصورت قابل تسلیم ہے۔ کہ یہ لوگ بے صبر اور غیر مستقل طبیعت کے ہوتے ہیں آج سے کچھ عرصہ پیشتر ان کی جہالت اور شریعت حقہ اسلامیہ سے ناواقفیت اس قدر بڑھی ہوئی تھی۔ کہ بات بات پر توہم پرستی کا اظہار کرتے تھے۔ اب گو بعض معاملات میں اُنکے خیالات پختہ اور عقائد راسخ ہیں۔ لیکن پھر بھی وفاداری کا جذبہ زیادہ نہیں۔ کوئی امیر اور کوئی سلطنت اُنکی مستقل وفاداری اور اطاعت پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔ جس طرح فتح شکست میں بدل جاتی ہے۔ اسی طرح ان کی فرمانبرداری اور اطاعت کیشی بھی سرکشی اور بغاوت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بہرکیف ان کی ذہنیت ابھی اس قدر ترقی یافتہ نہیں۔ کہ وطن اور عام عالم اسلام کے مفاد کو ملحوظ خاطر رکھ سکیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کا تعلق قبیلہ یا مقامی علاقہ سے ہوتا ہے۔

صرف مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو ان میں عام جوش اور والہانہ انداز پیدا کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ عرب کے بڑے سے بڑے امیر اور مدبّر کیلئے بھی ان کے مذہبی خیالات کو برانگیختہ کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ عرب کی تاریخ سے معلوم ہوگا۔ کہ جزیرۃ العرب میں بالعموم اور اندرون عرب میں بالخصوص انقلابات صرف مذہبی بنیادوں پر ہی ہو سکے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے۔ کہ جب حضور سرور کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے توحید و اخلاق کا سبق دیا۔ تو یہ لوگ اُمڈے ہوئے دریا کی طرح سے اسلام میں داخل ہوئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب اسی نجد میں مسیلمہ کذّاب پیدا ہوا۔ تو یہ لوگ جوق در جوق اسکی جمعیت میں داخل ہو گئے۔ جمود و سکون کی کئی صدیاں گذر جانے کے بعد پھر ایک خاص نوعیت کی مذہبی آواز فضا میں

کے رنگ میں پیدا ہوئی تو یہی لوگ ابوطاہر کی قیادت میں فاتحانہ حیثیت سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے آخری ایام میں محمد بن عبدالوہاب نے اصلاح و تجدد کا بیڑا اٹھایا تو یہ لوگ بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس کے ہمنوا و ہمخیال ہوئے۔ اس وقت اجداد ابن سعود میں سے مکرن ایک نہائت مختصر علاقہ پر حکمران تھا یہاں تک کہ عیینیہ کا شہر جو کہ اس کے دارالخلافہ درعیہ سے صرف بیس میل کے فاصلہ پر تھا۔ اس کے زیر نگین نہیں تھا لیکن جب اس کا پوتا محمد بن سعود بن مکرن شیخ محمد بن عبدالوہاب کا ہمخیال ہو گیا۔ اور مذہب کے جوش و اصلاح کی بنا پر اپنی امارت کی وسعت و رفعت چاہی تو بیس برس کے مختصر عرصہ میں سارا عرب وہابی حکومت کے سامنے سرنگوں ہوا۔

لیکن نجدی مستقل مزاج نہیں ہیں۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت اصلاح و تجدد سے یہ لوگ اپنے گمراہی کے طریقوں سے باز آئے لیکن جونہی کہ ترکوں کی تلوار نے سعودی حکومت کی بیخکنی کی۔ یہ لوگ جن مقامات پر سعودی حکومت کے مطیع و منقاد نہ رہا اپنے مذہبی عقیدوں سے باز آگئے۔ زبان پر تو اللہ کا نام لیتے تھے۔ اور بات بات پر لیتے تھے۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ اندرون عرب کے لوگ کیسی ہی بیہودہ گفتگو کیوں نہ کریں۔ اور کیسا ہی قبیح فعل کیوں نہ کریں۔ اللہ کا نام ضرور لینگے لیکن مذہب حقہ کی اصلی روح سے بالکل ناآشنا تھے۔ اور اسلامی اخلاق سے بے بہرہ عوام نے مذہب کی صحیح ماہیت کو کبھی نہیں سمجھا تھا۔ لیکن یہ اعتراف ضروری ہے۔ کہ جب سے سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے عنانِ حکومت سنبھالی ہے۔ نجد کی عام اخلاقی حالت نسبتاً بہت بہتر ہو گئی ہے۔ ان لوگوں کی عام اخلاقی اصلاح کیلئے نجد کے علمائے شریعت کے ذریعہ سے سرکاری انتظام کیا جاتا ہے۔ اور وعظ و ارشاد کے ذریعہ علمائے دین جہانتک ممکن ہوسکتا ہے۔ ان لوگوں کو شریعت و اخلاق سے باخبر و واقف کرتے ہیں۔

ان لوگوں کے غیر مستقل مزاج ہونے کی وجہ انکی غیر مستقل معاشرت اور بود و باش ہے۔ ان کے اقتصادی ذرائع اس قدر ناکارہ اور درماندہ ہیں۔ کہ یہ لوگ پُرامن حکومت کے زیادہ عرصہ تک متحمل نہیں ہوسکتے۔ اور حکومت کی ہزیمت و شکست کی صورت میں تو بغاوت و بدامنی پیدا کرنے سے کبھی نہیں چوکتے کیونکہ اس طرح پر لوٹ و غارت کے مواقع میسر آجاتے ہیں۔ اس قسم کی صورتِ حالات کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ آج ایک امیر کی قیادت میں شائستہ خدمات سر انجام دیتے ہیں۔ تو کل اسی امیر کو چپکے سے قتل کر بیٹھتے ہیں۔ بسم و زر کے عوض ایک حکومت کا جوا گلے سے اُتار پھینکنا اور دوسری حکومت

کو اختیار کر لینا ان کے نزدیک بڑی بات نہیں ہے۔

حالانکہ ابن سعود کی حکومت مکمل طور پر مستحکم اور منتظم نہیں۔ لیکن پھر بھی سلطان اپنی رعایا کے خصائل سے ناواقف اور غافل نہیں۔ ایسی احتیاطی تدابیر اکثر اوقات اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ کہ جنکی بدولت لوگ بغاوت کی جرأت نہ کرسکیں یہی لوگ سلطان کے خلاف آل رشید کی سرکردگی میں لڑ چکے ہیں۔ انہوں نے ابن صباح کے بہکانے پر بغاوت کی یا سلطان کے اپنے آدمیوں کی حمایت میں اسکی اطاعت کو ترک کر دیا۔ جنوبی نجد کے قبیلے قحطان اور الحصا کے عجمان نے تو کھلم کھلا بغاوت کی۔ اور اس وقت تک باز نہ آئے۔ جبتک ان کو پیس کر ملیا میٹ نہ کر دیا گیا۔ ایسی رعایا سے کونسا حکمران بالکل مطمئن رہ سکتا ہے۔

سلطان نے نجدیوں کی معاشرت اور عدم استقلال کو دیکھکر یہ لائحۂ عمل اختیار کیا۔ کہ سب سے اوّل انکو مطیع کیا جائے۔ پھر ان کو صحیح مذہبی تعلیم دے کر پکے وہابی بنا دیا جائے۔ اور آخر کار ان کو زراعت میں ڈالا جائے۔ زراعت کے متعلق سلطان کے اقدامات کا ذکر کسی اور باب میں آئیگا۔ یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ عرب میں صنعت و حرفت کے فقدان اور اراضیات کے عام طور پر زرخیز نہ ہونے کیوجہ سے رعایا بیحد غریب ہے۔ پیشہ ور لوگوں کا کوئی طبقہ نہیں۔ لوگ مویشی چرا کر یا غزوات سے لوٹ کھسوٹ کر کے گذران اوقات کرتے ہیں۔ شاہی انعامات و اکرامات بیشتر لوگوں کی سبیل معاش ہے۔ اس قسم کے لوگوں سے وفاداری اور نمک حلالی کی زیادہ توقع نہیں ہوسکتی۔ اس لئے ان کو باقاعدہ آباد کرنا اور ان کیلئے مستقل معاشرت پیدا کرنا نہایت ضروری معلوم ہؤا۔ اور بلا شک و شبہ سلطان ابن سعود کی یہ سب سے بڑی اصلاح ہے۔

جہاں اس قسم کے حالات سے بہت سے نقصانات پیدا ہوتے ہیں۔ چند فوائد بھی حاصل ہیں۔ مثلاً نجدی بیحد شجاع اور غیور واقع ہوئے ہیں۔ تہوّر و بسالت کی کوئی نوع ایسی نہیں جس میں یہ لوگ یگانۂ روزگار نہ ہوں۔ ہر وقت جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ اور مذہب کے معاملہ میں کٹ مرنا تو اب نجد میں بچوں کا کھیل ہے۔ لڑائی میں جاتے ہیں۔ تو اور ملکوں کی طرح یہاں لوگ نہ بیمار ہوتے ہیں نہ ہسپتالوں میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو لوگ غزوات میں مارے جاتے ہیں انکی موت پر اظہار افسوس تو کفر اور کفران نعمت سے کم نہیں سمجھتے۔ افسوس کرتے ہیں۔ تو صرف اس بات

کا کہ مرنے والے نے خُدا کی راہ میں پسماندگان سے سبقت کی۔ اور وُہ پیچھے رہ گئے۔ غزوات میں مر جانے والوں کو انتہائی خوش نصیب سمجھتے ہیں۔

یہ لوگ اسلحہ کے بیحد شوقین ہیں۔ تلوار کے ہاتھ خُوب جانتے ہیں۔ بندوق کا بھی بہت شوق رکھتے ہیں بڑے پکے نشانہ باز ہوتے ہیں۔ تلوار اور صرف بندوق کی کسی ایک قسم کو ہی پسند کرتے ہیں۔ جدید ترین اسلحہ کو استعمال کرنا مستحسن نہیں سمجھتے اور اگر سائنس کی نئی ایجادات کی دسترس بھی ہو جائے۔ تو ان سے فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتے۔

کیونکہ مویشی چرانا نجد کا بہترین مشغلہ ہے۔ اس لئے مویشیاں سے بیحد محبت رکھتے ہیں بالخصوص گھوڑے کو تو جان سے عزیز جانتے ہیں۔ اور اس کی پرورش اور تربیت میں بہت شغف رکھتے ہیں۔ گو گھوڑے کی سواری کی باقاعدہ تعلیم کا اور مہذب ممالک کی طرح سے کوئی انتظام نہیں لیکن نجدی بہترین شہسوار ہوتے ہیں عرب میں بالعموم اور نجد میں بالخصوص کوئی شخص ایسا نہیں جو گھوڑے کی سواری نہ جانتا ہو۔ بچے۔ بوڑھے۔ جوان سب سواری کر سکتے ہیں۔ اور کرتے ہیں۔

صحرا کی زندگی کا یہ عجیب خاصہ ہے۔ کہ یہ لوگ مہمان کی بیحد قدر و تعظیم کرتے ہیں۔ اور اپنی حیثیت اور حالات کے مطابق مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ اور نہ ہی مہمان کی غربت و امارت یا رسُوخ و وجاہت کیوجہ سے فرقِ مراتب کرتے ہیں۔ جو کوئی شخص ان کے ہاں پناہ گزین ہو جائے۔ بلا لحاظ حالات برابر ان کے احسان و کرم سے بہرہ یاب ہوتا ہے۔ اور جب تک ان کے ظلِّ حمایت میں رہتا ہے۔ اُسے کوئی گزند نہیں پہنچنے دیتے۔ بلکہ جہانتک ہو سکے اس کی امداد کرتے ہیں۔ محض ناواقف مہمان کو بھی اپنے ہاں ٹھہرانا باعث عزت سمجھتے ہیں۔ اور اس بارے میں ایک دوسرے سے رشک کرتے ہیں۔ عام طور پر معلوم ہے۔ کہ گوشت اور کھجوران کی عام غذا ہے چنانچہ مہمان کیلئے بھی گوشت۔ چاول اور کھجور مہیا کرتے ہیں۔ قہوہ سے تواضع کرتے ہیں۔ اور اکل و شرب کے علاوہ خوش گفتاری سے مہمان کو محظوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

باب چہاردہم

تحریک اخوان

باوجودیکہ سلطان ابن سعود کو باغی قبائل کے خلاف بسا اوقات ترکتازیاں کرنی پڑتی تھیں اور گردونواح کی حکومتوں سے آئے دن جنگ رہتی تھی۔ لیکن پھر بھی سلطان حقیقی اصلاح سے غافل نہ تھا۔ اور فرصت کے چند گراں قدر لمحے غور وفکر میں صرف کرتا تھا۔ اصلاح کی آواز خود سلطان کی زبردست شخصیت تھی۔

عرب میں زمانۂ قدیم سے اصلاح و کامیابی سربرآوردہ شخصیت کی وجہ سے ہی ہو سکی ہے۔ اور اس وجہ سے ہی ایسی اصلاح ہمیشہ ناپائیدار اور عارضی ہوتی ہے۔ سلطان ابن سعود کو اس حقیقت کا بخوبی علم تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا۔ کہ اسکی سلطنت کو بقا صرف نظام سے حاصل ہو سکتی ہے۔ حالانکہ نظام ملکی ذہنیت عرب کے مخالف واقع ہوا ہے۔

سلطان یہ محسوس کرتا تھا۔ کہ بدوی عربوں میں جن میں سلطان نے مذہبی خیالات کے ماتحت اس قدر طاقت پیدا کر دی ہے۔ اگر نظام قائم نہ کیا گیا تو بدامنی اور بغاوت پھیل جاویگی۔ اس بات کو مدنظر رکھکر سلطان نے چاہا کہ بدویوں کے خیالات تبدیل کرنیکے ساتھ ساتھ انکی اقتصادی اور معاشرتی حالت بدل دی جائے۔ لیکن عرب کے طبعی و جغرافیائی حالات کے اعتبار سے یہ طریق کار اگر محال نہیں۔ تو بیحد مشکل ضرور تھا۔

ملک عرب میں بارہا مذہبی جوش وخروش کے مناظر دیکھے گئے ہیں۔ ہر منظر کا نتیجہ ہمیشہ ایک ہوتا رہا ہے۔ اصلاح وتجدد۔ زمانہ جاہلیت میں اصنام پرستی اور اوہام وخرافات کا زور تھا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خدائے عزوجل کی طرف سے مبعوث ہوئے۔ تو توحید اور خدا پرستی کا چرچہ ہو گیا۔ عربی عزم واستقلال نے توہم پرستی سے نجات پاکر ایسی حکمرانی و فرمانروائی کی اور علوم وفنون اور حسیات انسانی کے ہر شعبہ میں وہ ترقیات کیں۔ کہ عقلیں دنگ رہ گئیں۔

مرورِ زمانہ سے عرب میں پھر جمود و سکون پیدا ہوا۔ تو قرامطین کا فرقہ نکلا۔ نویں صدی سے بارھویں صدی عیسوی تک ان کا زور رہا۔ قرامطین اپنے لایعنی عقائد کے ساتھ مساوات کے بیحد قائل تھے۔ اور معاشرت انسانی میں بزورِ شمشیر مساوات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس فرقہ نے یہاں تک بے اعتدالیاں کیں۔ کہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ بالخصوص نجد کے شرقی صوبہ الحصا کے دسویں صدی عیسوی کے انتہا پسند اسلام سے قطعاً منحرف ہو گئے تھے۔ ۹۳۰ عیسوی کے قریب قریب اصلاح کے ان نام نہاد حامیوں نے نہ صرف عراق عرب کو تباہ و برباد کر دیا۔ بلکہ حجاز کو بھی فتح کر لیا۔ اور سنگ اسود کو حرم کعبہ سے اُٹھا کر لے گئے۔ قرامطین آج عرب سے مفقود ہو چکے ہیں۔ مگر ان کا نام تاریخ میں باقی ہے

اٹھارویں صدی عیسوی میں موجودہ تحریکِ وہابیت کا آغاز ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل کسی گذشتہ باب میں آ چکی ہے۔ یہاں پر صرف ان امور کا نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کیا جائیگا جن میں عام مسلمانوں کے معتقدات و عمل سے وہابیوں کا اختلاف ہے۔

سب سے پہلی بات جس پر وہابی بیحد زور دیتے ہیں۔ یہ ہے کہ صرف خدائے واحد کی پرستش کرنی چاہیئے۔ اور کسی نبی اور ولی کو اس کے ساتھ شامل نہیں کرنا چاہیئے۔ دیگر مسلمان حیات النبیؐ کا کامل عقیدہ رکھتے ہیں۔ لیکن وہابیوں کا اعتقاد یہ ہے۔ کہ حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام عام انسانوں کی طرح اس دارِ فانی سے رحلت فرما چکے اور اب اُنہیں اس دُنیا اور اسکے مخصوصوں سے کوئی تعلق نہیں نہ وہ دُنیا کے امورات کے متعلق تصرّف و اقتدار رکھتے ہیں۔ اور نہ ہی اُنکی شفاعت اور وسیلہ کارگر ہے۔ عام مسلمان حضور رسُول مقبُول صلعم پر درُود و سلام نماز کا جزو لاینفک سمجھتے ہیں۔ لیکن قدیم وہابی درُود کو نہ نماز کا ضرُوری جزو سمجھتے تھے۔ نہ ہی کار آمد و فائدہ مند۔

عام مسلمان ختم و درُود میں ایصالِ ثواب کے قائل ہیں۔ اور اولیاء اللہ کے مزارات و تبرکات سے انتساب فیضانِ رُوحانی کے معتقد ہیں۔ لیکن وہابی حضرات صریح اور صاف طور پر ان دونوں باتوں کا اعلانیہ انکار کرتے ہیں۔ ماسوا اللہ کسی نبی یا ولی سے منّت ماننے۔ دُعا کرنے یا اُن پر بھروسہ رکھنے کو شرک قرار دیتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات اس شرک کو کفر سے بڑھ کر سمجھتے ہیں۔ قبور پرستی کو اصنام پرستی سے کمتر نہیں سمجھتے۔

جہاں عام مسلمانوں نے بہت سے رسُومات کو عملاً داخلِ مذہب سمجھ لیا ہے۔ وہاں وہابی

ہر اُس چیز کو جسکی سند قرآن اور سُنّت میں نہیں۔ بدعت قرار دیتے ہیں۔ اور ہر بدعت کو سختی سے ممنوع سمجھتے ہیں۔

عام مسلمان سلسلہ ہائے طریقت۔ فن تصوف اور پیروں فقیروں کو بہت محبت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہابی سرے سے اُن کے قائل ہی نہیں۔ جب خاندانِ عثمان ترکی میں برسرِ اقتدار تھا۔ تو مسلمانوں کا بیشتر حصہ ترکی سلطان کو خلیفۃ المسلمین سمجھتا تھا۔ اور اسکی روحانی حیثیت کا معترف تھا لیکن وہابیوں نے اپنی تحریک کے آغاز سے ہی آل عثمان کی کسی مذہبی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا۔

عام مسلمانوں اور وہابیوں میں جزوی اور غیر اہم اختلافات اور بھی ہیں۔ نجدی وہابی اپنے عقائد مخصوصہ میں اس قدر غلو کرتے ہیں۔ کہ اپنے سوا دیگر مسلمانوں کو مشرک اور یہودی اور عیسائیوں سے بدتر سمجھتے ہیں۔

لیکن یہ تسلیم کر لینا نہایت ضروری ہے۔ کہ گو وہابی حیات النبیؐ کے قائل نہیں۔ اور نہ ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وسیلہ و شفاعت کو مانتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید کے علاوہ ارشادات نبوی کو سب سے زیادہ وقعت دیتے ہیں۔ اور اُسوہ حسنہ رسول پر عمل کرنا نہایت ضروری اور لازمی سمجھتے ہیں۔ وہابی رسُولِ مقبولؐ کا بیحد احترام کرتے ہیں۔ گو حیات النبی کے مسئلہ میں ان کا لب و لہجہ قابل اعتراض ہوتا ہے۔

دقت یہ ہوئی کہ نجدی وہابیوں کے گرد و پیش مسلمان ہی مسلمان آباد تھے۔ غیر مذاہب والوں سے سروکار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ ان دونوں میں خصومت پیدا ہوئی۔ اور تعلقات ایسے کشیدہ ہوئے۔ کہ اب تک مصالحت کی راہ باز نہیں ہوئی۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں تحریکِ وہابیت نے نجدیوں میں بیحد جوش پیدا کیا۔ عام مسلمانوں سے خصومت تو تھی ہی۔ مذہب اور غزوہ کی آڑ میں نجدیوں نے گرد و نواح میں چھاپے مارنے شروع کئے۔ تنگ آکر مصری اور ترکی افواج نے نجد کو ایسا پامال کیا۔ کہ وہابی سلطنت تو ایک طرف وہابی عقائد کا بھی قلع قمع کر دیا۔ لیکن سُلگتی ہوئی آگ کی طرح یہ تحریک اندر ہی اندر کام کرتی رہی۔ آخر کار موجودہ سلطان کے عہد میں نجد میں وہابی جوش پھر نئے سر تو فرسے مشتعل ہو گیا۔

سُلطان کو اپنی رعیت کا حال بخوبی معلوم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مذہبی جوش میں لوگ موت کو کچھ

نہیں سمجھتے۔ اسلئے اگر ایسے لوگوں کے قواء کا استعمال با قاعدہ نظام کے ماتحت کسی نتیجہ کو پیش نظر رکھکر کیا جائے۔ تو تنظیم عسکری کامیابی یقینی ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر اس مذہبی جوش کو یونہی بیکار کھو دیا جائے تو آبائی سلطنت کے بھی ہاتھ سے چلے جانے کا احتمال ہے۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ بدوی قبائل صحیح معنوں میں موجودہ سلطان سے پیشتر کبھی بھی وہابی نہیں ہوئے تھے۔ تحریک کی تبلیغ واشاعت شہری آبادی اور تعلیم یافتہ گروہ تک ہی محدود تھی۔ چنانچہ وہابی سلطنت کے دور اول میں بدوی صرف لوٹ وغارت کے لالچ سے ہی سلطان وقت کا ساتھ دیتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ بعض اوقات انعام واکرام کے لالچ میں ترکی۔ مصری یا خاندان رشید کی افواج سے بھی مل جایا کرتے تھے۔

سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے مستحکم ارادہ کر لیا۔ کہ بدوی قبائل کو وفا شعاری اور مذہب حقّہ کی صحیح تعلیم دی جائے۔ سلطان نے اپنے ذہن میں ایک نیم مذہبی نیم اقتصادی لائحہ عمل مرتب کیا اور ۱۹۱۲ء کے آغاز میں اس پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ یہ لائحہ عمل تحریک اخوان کا بناء و قیام تھا۔

اخوان منتخب بدویوں کی جماعت ہے۔ جن سے سلطان حال کے ساتھ وفاداری کرنے کے متعلق بیعت لی جاتی ہے۔ ان کا فرض ہے۔ کہ جب کسی غزوہ یا کار سرکار میں مصروف نہ ہوں۔ تو ایسی زمین کاشت کر کے گذران اوقات کریں۔ جو ان کے لئے حکومت نجد منتخب کرے۔ نجد کے مختلف مقامات اور مختلف قبائل سے آدمی منتخب کئے گئے تاکہ سلطان ابن سعود کے وفادار اور قابل وثوق سپاہی بنیں۔ زراعتی نو آبادیاں قائم کریں۔ اور علمائے نجد سے تعلیم مذہب حاصل کر کے فائدہ مند وہابی بن جائیں۔ تاحدِّ امکان زیور اخلاق سے مزیّن ہوں۔ اور آبائی وحشت و بربریّت کو خیرباد کہہ دیں۔

سلطان ابن سعود جانتا تھا۔ کہ بدوی قبائل سے قتل وغارت اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی عادت کو چھڑانا نہائیت ضروری ہے۔ اور اس غرض کیلئے ان کو لازمی طور پر زراعت میں ڈالنا پڑیگا۔ جب تک یہ لوگ خانہ بدوش زندگی نہ چھوڑیں۔ ان کے اخلاق میں معتدبہ اضافہ ہونا معلوم۔ تمدّن اور علم کی ترقی کیلئے بھی ان کا کہیں نہ کہیں مستقل طور پر آباد ہونا ضروری ہے قتل وغارت کیلئے بڑا سبب یہی تھا۔ کہ ان بدوی عربوں کیلئے کوئی مستقل ذریعہ معاش کا نہ تھا۔

چنانچہ جہاں کہیں عمدہ چشمہ دستیاب ہُوا۔ وہاں سلطان ابن سعود نے ایک زراعتی مرکز قائم کر دیا اور اپنی رعیت کے منتخب نوجوانوں کو وہاں آباد کیا۔ اس قسم کی ہر نو آبادی میں مذہبی و ادبی تعلیم کے لئے ایک شیخ جس کو نجدی زبان میں متوی کہتے ہیں متعین کر دیا۔ جو اپنے شاگردوں کو نہ صرف قرآن و سنت کی تعلیم دیتا تھا۔ بلکہ عقائد اور اخلاق اور لکھنا پڑھنا بھی سکھاتا تھا۔ اس طریق پر ایسا گاؤں تیار ہو جاتا تھا۔ جو بیک وقت با امن شہریوں کا مسکن بھی وفادار اور قابل سپاہیوں کی چھاؤنی بھی اور وہابی مذہب کا صحیح مرکز بھی تھا۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس تحریک سے سلطان ابن سعود کا منشا بدویوں کی اصلاح کے علاوہ اندرون عرب کی طبعی حالت کی اصلاح بھی کرنا تھا۔ پانی کی قلت کی وجہ سے نجد کے وسیع رقبہ جات غیر مزروعہ پڑے تھے۔ نجد کے لوگ ایک چشمہ کے سوکھ جانے پر دوسرے کی تلاش میں سرگردان پھرتے رہتے تھے۔ معاش کی مستقل صورت نہ ہونے کی وجہ سے قتل و غارت اور نام نہاد غزوہ لازمی چیز تھی جس کا تدارک سطحی نظر سے ناممکن نظر آتا تھا۔ ایسے حالات میں عرب کی ترقی کا تصور بھی محال تھا۔ سلطان ابن سعود کو اپنی سلطنت کے بقا و استحکام کیلئے ان حالات کے ساتھ زور آزمائی کرنا ضروری تھا۔

اس قسم کی ایک نو آبادی ارطاویہ ہے جس کو دیکھکر سلطان ابن سعود کی فراست اور دقت نظر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۲ء سے پیشتر یہاں صرف ایک صحرائی کنواں تھا جس سے گاہے گاہے صرف قبیلہ مطیر کے لوگ آبنوشی کا کام لیا کرتے تھے۔ آج اسکی آبادی دس ہزار سے زائد ہو گئی ہے۔ سلطان نے نو آبادیاں قائم کرنے کی پالیسی جاری رکھی ہے۔ یہانتک کہ اب اس قسم کی نو آبادیاں تقریباً یکصد ہیں۔ جو کہ صحرائے عرب کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

شروع میں سلطان اخوان سے بدوی قبائل پر حملہ کرا دیا کرتا تھا۔ کیونکہ اخوان کو جدید اسلحہ حکومت کی طرف سے مہیا کیا جاتا تھا۔ اور وہ ایک منظم جماعت تھی۔ اس لئے پسماندہ قبائل پر فتح پا لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ لیکن بجائے اسکے کہ اخوان قتل و غارت اور لوٹ مار کریں۔ سلطان فاتح اور مفتوح میں مصالحت کروا دیتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اخوان بھی بسر خرو رہتے۔ اور مفتوح بھی ہراساں نہ ہوتے بلکہ بدل و جان تحریک اخوان میں شامل ہوتے جاتے۔ اس طرح یہ جماعت دن بدن ترقی پزیر ہوتی رہی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی دور رس پالیسی بے نظیر جرأت

اور بیمثال فراست کا آدمی ہی اختیار کر سکتا ہے۔

اس طرح پر قبائل کی قدیم ہیئت تبدیل ہوگئی۔ اور سلطنت کیلئے ایک باقاعدہ فوج تیار ہوگئی حکومت جماعت اخوان کے افراد سے نہائیت فیاضی اور عالی حوصلگی سے سلوک کرتی رہی چنانچہ انکو جدید ہتھیار دئے گئے۔ مکانات تعمیر کرنے اور کنوئیں کھودنے کیلئے سامان فراہم کیا گیا۔ اور زراعت کے کاروبار کیلئے ہر طرح کی امداد ہوئی۔ ان تمام انتظامات کا نہائیت خوشگوار نتیجہ یہ ہوا کہ اس مخصوص جماعت کے افراد نے اپنے اپنے قبیلوں کا خیال چھوڑ دیا۔ اور اخوان کے سلسلہ وحدت و یگانگت میں منسلک ہو گئے۔

سلطان کی آئیندہ زمانہ میں درخشندہ کامیابیوں کا تمامتر انحصار اس کی اپنی الوالعزم شخصیت کے علاوہ اس جماعت اخوان پر رہا۔

علم دوست سیاحوں کا جنہوں نے اندرون نجد میں جا کر جماعت اخوان کے عادات و خصائل کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ اتفاق رائے ہے کہ اخوان مذہب کے معتقدات اور عمل کے بارے میں بڑے مستعد اور گرمجوش ہوتے ہیں جس قسم کے معتقدات کی انکو تعلیم دیجاتی ہے۔ اُن پر ایمان راسخ رکھتے ہیں۔ اور اعمال اور شعائر مذہبی کی بڑی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ موت کو خاطر میں نہیں لاتے اور غزوات میں شہید ہوجانے والے ساتھیوں کی خوش بختی پر رشک کرتے ہیں۔ لیکن عام مسلمانوں کو نفرت اور تعصب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خودسر اور سرکش بھی ہیں۔ گاہے گاہے حکومت کیخلاف فشاءغزوات بھی کر بیٹھتے ہیں سنہ ۱۹۲۲ء میں جوف کے اخوان نے شرق یردن کے خلاف غزوہ کیا۔ حکومت نجد سے اجازت طلب نہیں کی گئی تھی۔ سلطان نے باز پرس کی۔ تو اخوان نے حیلے بہانے کئے۔ لیکن پذیرائی نہ ہوئی۔ اور اس جماعت کے چند معتبروں کو دار السلطنت میں کچھ عرصہ کے لئے قید رہنا پڑا۔

شائد یہ خیال پیدا ہو۔ کہ اخوان کو اعلےٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نجد کے عام اہل الرائے علم و فن کی موشگافی اور دُور بینی کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھتے۔ قرآن اور احادیث کی سادی اور معمولی تعلیم کو کافی سمجھتے ہیں۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ یہی وہ مختصر تعلیم ہے جو اخوان کو دی جاتی ہے۔

ذیل میں چند نوآبادیوں کی فہرست دی جاتی ہے لیکن کیونکہ نجد میں باقاعدہ مردم شماری کا کوئی قانون نہیں ہے اس لئے جس قدر افراد ہر ایک نوآبادی جنگ و جہاد کیلئے سہولیت سے فراہم کر سکتی ہے بیان کئے جاتے ہیں۔ ان میں وہ جنگجو شامل ہیں جن کو حکومت نجد ہر وقت طلب کر سکتی ہے۔ بوقت ضرورت ہزاروں دیگر آدمی میدان جنگ میں لائے جا سکتے ہیں:-

نمبر شمار	نام نوآبادی	تعداد افواج	نمبر شمار	نام نوآبادی	تعداد افواج
	قبیلہ مطیر		۱۶	الادھنا	۲۰۰۰ دو ہزار
۱	ارطاویہ	۲۰۰۰ دو ہزار	۱۷	الساوہ	۳۰۰ تین سو
۲	امئید	۱۰۰۰ ایک ہزار	۱۸	ساجر	۸۰۰ آٹھ سو
۳	فریسان	۱۰۰۰ ایک ہزار	۱۹	عرجہ	۲۰۰۰ دو ہزار
۴	مولاہی	سات سو	۲۰	عسیلہ	۳۰۰ تین سو
۵	اللمار	۷۰۰ سات سو	۲۱	نفعی	۱۵۰۰ ایک ہزار پانچسو
۶	الاصلاح	۱۰۰ ایک سو	۲۲	عروہ	۱۰۰۰ ایک ہزار
۷	الارطاری	۶۰۰ چھ سو	۲۳	السنام	۱۰۰۰ ایک ہزار
۸	مسکہ	۸۰۰ آٹھ سو	۲۴	الروضہ	۷۰۰ سات سو
۹	درعیہ	۸۰۰ آٹھ سو		قبیلہ حرب	
۱۰	الشعیب	۴۰۰ چار سو	۲۵	دقنہ	۲۵۰۰ دو ہزار پانچسو
۱۱	قریہ شمالی	۱۵۰۰ ایک ہزار پانچسو	۲۶	الشعیبیہ	۱۰۰۰ ایک ہزار
۱۲	قریہ جنوبی	۱۰۰۰ ایک ہزار	۲۷	البہیمیہ	۱۰۰۰ ایک ہزار
۱۳	سدیر	۷۰۰ سات سو	۲۸	القرین	۷۰۰ سات سو
۱۴	نکیر	۱۰۰۰ ایک ہزار	۲۹	الصادقہ	۶۰۰ چھ سو
	قبیلہ عتیبہ کا حصہ موسوم بہ برقعہ		۳۰	حلیفہ	۳۰۰ تین سو
۱۵	غطغط	۲۰۰۰ دو ہزار	۳۱	سقیظل	۷۰۰ سات سو

نمبر شمار	نام نوآبادی	تعداد افواج
۳۲	البروة	ایک ہزار (۱۰۰۰)
۳۳	قباح	دو ہزار (۲۰۰۰)
	قبیلہ شمار	
۳۴	الجفر	دو ہزار (۲۰۰۰)
۳۵	روضۃ العیوفی	ایک ہزار (۱۰۰۰)
	قبیلہ حطیم	
۳۶	بنوان	ایک ہزار پانچسو (۱۵۰۰)
	قبیلہ الدواسیر	
۳۷	مشیرقیہ	ایک ہزار پانچسو (۱۵۰۰)
۳۸	الوسیطیہ	آٹھ سو (۸۰۰)
	قبیلہ عجمان	
۳۹	السرار	دو ہزار (۲۰۰۰)
۴۰	علیط	ایک ہزار (۱۰۰۰)
۴۱	الصحاف	آٹھ سو (۸۰۰)
۴۲	العجیر	سات سو (۷۰۰)
۴۳	عریرہ	ایک ہزار تین سو (۱۳۰۰)
	قبیلہ قحطان	
۴۴	الحیاثم	ایک ہزار آٹھ سو (۱۸۰۰)
۴۵	الجفیر	تین سو (۳۰۰)
۴۶	الحساط	آٹھ سو (۸۰۰)
۴۷	الریحان شمالی	دو ہزار (۲۰۰۰)
۴۸	الریحان جنوبی	دو ہزار (۲۰۰۰)
	قبیلہ خزرج	
۴۹	الدھلبیہ	آٹھ سو (۸۰۰)
۵۰	البدع	آٹھ سو (۸۰۰)
۵۱	المنیصف	چھ سو (۶۰۰)
۵۲	الاقوار	پانچسو (۵۰۰)
۵۳	تیبسم	چار سو (۴۰۰)
۵۴	الرویدہ	چار سو (۴۰۰)
	قبیلہ الاعظم	
۵۵	ثاج	ایک ہزار پانچسو (۱۵۰۰)
۵۶	الحاس	ایک ہزار (۱۰۰۰)
۵۷	الحائث	ایک ہزار (۱۰۰۰)
۵۸	العتیق	سات سو (۷۰۰)
	قبیلہ بنو مرہ	
۵۹	بناق	ایک ہزار (۱۰۰۰)
۶۰	عبیرق	ایک ہزار پانچسو (۱۵۰۰)
	قبیلہ بنو ہجر	
۶۱	عین الدار	ایک ہزار (۱۰۰۰)

تقریباً ۱۶۰۰۰ سپاہی الویہ میں ہیں جو کہ ہر وقت جہاد کیلئے جان بکف رہتے ہیں علاوہ ازیں قبیلہ العتوہل اور سباعی اور دیگر قبائل کی بھی بہت سی نوآبادیاں ہیں جنکا فرداً فرداً ذکر تحصیل حاصل ہے۔

باب پانزدہم

سلطان کا صوبہ الحصا پر قبضہ

ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ موجودہ سلطان کو ترکوں کے ساتھ کب سے کدورت پیدا ہوئی۔ بہرکیف اتنی بات صاف ظاہر ہے۔ کہ نجد اور آل سعود کی گذشتہ تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہوئے سلطان کی عثمانی حکومت کے ساتھ مصالحت بیحد دشوار تھی عملاً اس خصومت کا اظہار جنگ عظیم سے پیشتر ہی ہو گیا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ جنگ عظیم کے دوران میں بھی سلطان کا رویہ عثمانی ترکوں کے متعلق قابل اعتراض نہ تھا۔ حالانکہ ترکوں کے سب سے بڑے عرب حلیف یعنی خاندان رشید سے سلطان ابن سعود کی سخت عداوت تھی۔ یہ خیال بڑی حد تک درست ہے۔ کیونکہ باوجودیکہ اتحادی طاقتوں نے عرب کی آزادی کا ڈھونگ رچایا ہوا تھا۔ اور مغربی سیاست سے ناآشنا اور عاقبت ناشناس عرب عثمانی حکومت سے باغی ہو کر ترکوں سے برسر پیکار ہو گئے تھے لیکن سلطان نے جنگ عظیم کے پورے دوران میں ترکوں سے چپقلش نہیں کی۔

بہرکیف یہ حقیقت ہے۔ کہ پہلی سعودی حکومت کے کارناموں کی یاد اس قدر تلخ تھی۔ کہ ترک جنگ عظیم سے پیشتر بھی سلطان عبدالعزیز بن سعود اور اسکی حکومت کے متعلق مصالحانہ اور مخلصانہ رویہ نہیں رکھتے تھے جنگ عظیم سے تقریباً دو سال پیشتر ترکوں نے اپنے اس وقت کے وفادار حلیفوں یعنی شریف حسین کو حجاز میں قبیلہ عجمان کو شرقی نجد میں اور خاندان رشید کو حائل میں سلطان کے برخلاف اُکسایا۔ اس پالیسی کا مقصد یہ نہیں تھا۔ کہ ترک اندرون عرب پر سیاسی اقتدار قائم کریں۔ کیونکہ یہ تجویز وہ مدت سے ترک کر چکے تھے۔ بلکہ منشا محض یہ تھا۔ کہ آپس کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے کوئی عرب امیر اس قدر طاقتور نہ ہو سکے کہ عرب میں ترکوں کے نام نہاد اقتدار کو صدمہ پہنچے۔ کیونکہ وہ سلطان پر براہ راست حملہ کرنا نہ چاہتے تھے اس لئے انہوں نے ٹیڑھی ترچھی چالیں شروع کیں۔

حفاظت خود اختیاری کے طور پر سلطان کیلئے لازم ہوا۔ کہ وہ یا تو حجاز پر حملہ آور ہو یا حائل پر قابض

ہو جائے۔ اور شرقی ساحل عرب پر اپنی رعایا کیلئے بحری تجارت کا راستہ پیدا کرے۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء کے موسم بہار میں سلطان طویق کے مقام پر جنوبی نجد کے قبیلہ مرہ کو اپنے اقتدار کے تسلیم کرانے کیلئے مجبور کرنے کے لئے خیمہ زن تھا۔ کہ یکایک اس نے مشرق کی طرف کوچ کر دیا۔

صوبہ الحصا کو مدحت پاشا نے سلطان کے آباؤ اجداد سے ۱۸۷۱ء میں فتح کیا تھا۔ اور ترک اس عرصہ میں اس صوبہ پر متواتر قابض و متصرف رہے تھے۔ گو آخری چند سالوں سے ترکی حکومت قدرے کمزور ہو گئی تھی۔ اور بعض بدوی قبائل باغی ہو رہے تھے۔

سلطان نے نہایت سرعت کے ساتھ اس علاقہ پر یلغار کی۔ سلطان کی عادت ہے۔ کہ اچانک اور یکلخت حملہ کیا کرتا ہے پیشتر اس کے کہ دشمن کو حملہ کی خبر بھی ملسکے اُس نے حفوف الحصا کے صدر مقام کے قریب ڈیرے ڈال دئے۔ اس یلغار میں سلطان کے ساتھ کل چھ سو آدمیوں کی جمعیت تھی ان میں سے کچھ آدمی تیز گامی کیوجہ سے سلطان کا ساتھ نہ دیسکے بعض بیمار پڑ گئے لیکن جس قدر آدمی بھی ساتھ تھے سب کے سب نبرد آزما اور آزمودہ کار تھے۔

حفوف کے چند آدمی پیشتر سے ہی سلطان کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ اور اُنکی وساطت سے سلطان کو معلوم ہو چکا تھا کہ ترک افسروں نے شہر کی مدافعت کیلئے کیا کارروائیاں کی ہوئی ہیں۔ شہر میں اسوقت دو رجمنٹیں موجود تھیں۔ ترک سپاہ کو کامل اطمینان حاصل تھا۔ اور گمان تک بھی نہ تھا کہ کوئی بدوی ان پر حملہ آور ہونے کی جرأت کریگا۔

سلطان نے جس طریق پر ریاض فتح کیا تھا۔ وہی آزمودہ یہاں استعمال کیا یعنی خوب اندھیرا ہونے تک انتظار کرتا رہا۔ کھجور کے چند درخت کاٹ لئے گئے۔ اور انکی سیڑھیاں بناکر فصیل پر پھلانگنے کا انتظام ہو گیا شب کی تاریکی میں سلطان کی الوالعزم جماعت شہر کی طرف بڑھی۔ اسوقت تک ترکوں کو کچھ علم نہ تھا۔ قلعہ کے قریب سلطان نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اور مختلف سمتوں سے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ترک سنتری چپکے سے خاموش کر دیا گیا۔ ترک سپاہی غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ کہ نجدی سپاہ فصیل پر سے چڑھ کر شہر میں داخل ہو گئی۔

اعلان عام ہو گیا۔ کہ شہر پر سلطان ابن سعود کی حکومت ہے۔

ترک افسران اور سپاہ کا بیشتر حصہ اور ترک خاندان جامع مسجد میں پناہ گزین ہوئے سلطان نے

مسجد کے ارد گرد بارود بچھوا دیا اور پناہ گزینوں کو اطلاع کر دی۔ کہ اگر انہوں نے جلد از جلد اپنے آپکو سلطان
کے حوالہ نہ کیا۔ تو بارود کو آگ دیدی جائیگی۔ اور مکینوں سمیت مسجد خاک سیاہ ہو جائیگی۔ مجبوراً ترک منصرف
نے کوئی چارہ کار نہ دیکھکر مسجد خالی کروا دی۔ اور حسب معاہدہ متعلقین اور لواحقین کو ساتھ لیکر اپنے
وطن کی راہ لی۔ ترک اس عرب امیر کی جرأت و جسارت پر ششدر رہ گئے۔ جس نے ایک گولی چلائے بغیر
شہر پر قبضہ کر لیا۔ عقیر اور قطیف کی بندرگاہوں نے بھی سلطان کی اطاعت اختیار کی۔ اور کچھ عرصہ میں
سارے صوبہ پر حکومت نجد کا تسلط بیٹھ گیا۔

یہ علاقہ آل سعود کے انحطاط کے وقت ترکوں نے چھین لیا تھا۔ اب پھر ۴۳ برس کے بعد اسی
خاندان کے قبضہ میں آگیا۔ اور نجد کی حدود بحیرہ ہند تک وسیع ہو گئیں۔ اس فتح کے ساتھ سلطان کو
انگریزی حکومت کے ساتھ تعلقات وابستہ کرنے کا موقع میسر آیا۔ اور گو سلطان کے تعلقات حکومت
انگلشیہ کے ساتھ ہمیشہ یکساں نہیں رہے۔ لیکن پھر بھی نجد کو کثیر فائدہ پہنچا ہے۔ اور ابن السعود کی اکثر
کامیابیوں میں مدد و معاونت ملی ہے۔

اس وقت تک ملک عرب میں ترکوں کا رعب و وقار قائم تھا۔ اور بادیہ عرب اپنی جہالت اور
شجاعت کے باوجود ترکوں کی طاقت سے خائف رہتے تھے۔ جب ترکوں کی منظم فوج کو اپنی بارکوں میں
آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہوئے ایسی ہزیمت نصیب ہوئی۔ تو عربوں میں طبعی طور پر یہ
خیال پیدا ہوا۔ کہ ابن سعود واقعی عظیم شخصیت ہے۔ کہ ترکوں کو ایسی زبردست شکست دیدی۔ عرب کے
ہر قبیلہ اور ہر خیمہ میں اس فتح کے چرچے ہوئے اور سلطان کی عظمت و شہرت میں اضافہ ہوا۔

اہل الرائے کا اس بارے میں اختلاف ہے۔ کہ اگر جنگ عظیم وقوع پذیر نہ ہوتی۔ تو اس فتح کا اندرون
عرب کی سیاست پر کیا اثر پڑتا۔ اور سلطان کی فتوحات کا سلسلہ کہاں تک پہنچتا۔ بعض لوگ خیال کرتے
ہیں کہ جنگ عظیم کے دوران میں کیونکہ اتحادی طاقتوں نے شریف حسین کو بلا استحقاق بہت زیادہ
تقویت دے دی تھی۔ اور مقابلتاً سلطان کو بے دست و پا کر رکھا تھا۔ اور اس کی مصروفیتوں کو زر و مال
کے لالچ اور عسکری دباؤ سے معطل کیا ہوا تھا۔ اس لئے اگر جنگ عظیم واقع نہ ہوتی۔ تو سلطان تمام
عرب کو اس عرصہ میں ہی فتح کر لیتا۔

اسی زمانے میں ہندوستان کی حکومت کو سلطان کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوا

اور اسی خیال سے کپتان شیکسپئیر جو کہ اس زمانے میں کویت میں انگریزی ریذیڈنٹ تھا۔ اس سال کے موسم سرما میں ریاض گیا۔ اور حکومت نجد کا نظم و نسق ملاحظہ کیا۔ کپتان موصوف کا یہ دورہ بہت دور رس نتائج کا موجب ہوا۔ کپتان سلطان کا بیحد مداح تھا۔ سلطان بھی اُسے چاہتا تھا۔ کپتان نے جو رپورٹیں اپنی حکومت کو نجد کے متعلق بھیجیں۔ انہیں دیکھکر انگریزی حکومت کو سلطان کی شخصیت کا حال معلوم ہوا۔ اور اس نے محسوس کیا۔ کہ عرب کی سیاسی فضا میں ایک عظیم طاقت رونما ہو رہی ہے۔

اب تک سلطان سپاہی تھا۔ یا حکمران۔ اب تدبر و سیاست برتنے کا موقع میسر آیا۔ مغربی اقوام کے ساتھ مشرقیوں کے تعلقات اور اختلاط وہ کویت کی جلا وطنی کے زمانے میں دیکھ چکا تھا سلطان نے محسوس کیا۔ کہ انگریزی حکومت سے تعلقات پیدا کرنا ناگزیر ہے۔ چنانچہ رابطہ و اتحاد پیدا ہو گیا۔ عملی صورت وہ متعدد معاہدات تھے۔ جو دونوں حکومتوں کے درمیان وقتاً فوقتاً ہوئے۔ اور اپنے اپنے وقت کے حالات کے اقتضا کے مطابق ہوئے

الحصا پر سلطان کے قبضہ کے بعد ضروری تھا۔ کہ ترک اس صوبہ میں اپنی حیثیت کو متعین کریں۔ سلطان کو بھی اپنے قبضہ کی نوعیت کو تشخیص کرانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ آواخر ۱۹۱۳ء میں ترکوں اور سلطان میں ایک معاہدہ ہوا۔ جسکی رو سے حکومت قسطنطنیہ نے سلطان کو نجد اور الحصا کا اپنی طرف سے والی نامزد کیا۔ اور صاحب الدولہ کا خطاب عطا کیا۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ گو سلطان نجد و الحصا پر آزادانہ طور پر حکمرانی کرتا تھا۔ اور کسی کی مداخلت گوارا نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس وقت تک اس نے ترکوں کے حقوق شہنشاہیت کا انکار بھی نہ کیا تھا۔

باب شانزدہم

وہابی اور جنگ عظیم

جب اکتوبر ۱۹۱۴ء میں ترکوں نے جنگ عظیم میں شمولیت کی تو سلطان ترکی نے بحیثیت خلیفۃ المسلمین جہاد کا فتویٰ دیا۔ اور اپنے روحانی اقتدار سے کام لیکر عام مسلمانوں کو اتحادی طاقتوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کا حکم دیا۔ وہابی اپنے شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خیالات کے مطابق شروع سے ہی ترکی سلطان کی مذہبی اور روحانی حیثیت تسلیم نہ کرتے تھے لیکن پھر بھی انہوں نے جنگ عظیم کے پیچیدہ اور مخصوص حالات سے فائدہ اٹھانا نہ چاہا۔ اور ترکوں کی کمزوری اور مصیبت سے کوئی مفاد حاصل نہ کیا

حکومت انگلشیہ نے جزیرۃ العرب میں اپنے حامی تلاش کرنے کی بیحد کوشش کی اور بالآخر اسمیں کامیابی بھی بہت ہوئی۔ صرف دو علاقے ایسے تھے جہاں سے انگریزی حکومت کو براہ راست کوئی مدد نہیں ملی ایک تو یمن جہاں امام یمن ترکوں کے ساتھ دس سالہ معاہدہ امن پر جو اس نے ۱۹۱۱ء میں کیا تھا آخیر دم تک ثابت قدم رہا۔ دوسرا امارت حائل جہاں آل رشید جو ہمیشہ سے ترکوں کی سیادت کے معترف تھی ترکی حکومت کے حلیف و وفادار رہے۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں شیخ مبارک والئے کویت نے انگریزوں کو بصرہ فتح کرنے کیلئے اس شرط پر امداد دی۔ کہ آئندہ اسکی ریاست کو ترکی کی سیادت سے آزاد سمجھا جائے۔ اور اسکو انگریزی حمایت میں لیا جائے۔ اسی طرح اپریل ۱۹۱۵ء میں حکومت انگلشیہ کا ادریسی والئے عسیر سے معاہدہ ہو گیا۔ ادریسی عرصہ سے ترکوں سے معاندانہ رویہ رکھتا تھا۔ جولائی ۱۹۱۵ء میں شریف حسین والئے حجاز سے انگریزوں کا معاہدہ ہوا۔ اور شریف کے ساتھ زمانہ مابعد میں تعلقات اس قدر وسیع ہوئے۔ کہ عوام کی نگاہ میں شریف حسین سب سے بڑا عرب حکمران قرار پایا۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۱۵ء کو سلطان ابن سعود سے معاہدہ ہوا جسکی تصدیق باضابطہ طور پر ۱۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو ہوئی۔ الغرض جنگ عظیم میں عرب کے تمام رئیس نہ تو حکومت انگریزی کے طرفدار اور بہی خواہ تھے۔ اور نہ ہی ترکوں کے وفادار۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جنگ عظیم میں غیر حکومت کے بل بوتے پر اپنی اپنی کاوشوں اور عداوتوں اور ذاتی رفعت و عظمت کو

المحفوظ خاطر رکھتے تھے۔ جنگ عظیم کے دوران میں پہلی جنگ جو عرب میں ہوئی۔ جراب اور ارطاویہ کے قریب زلفی نامی مقام پر ابن سعود اور ابن رشید کے درمیان ہوئی نتیجہ فیصلہ کن نہیں تھا۔ اس قسم کی غیر یقینی لڑائیاں جنگ عظیم سے پیشتر بھی ہوتی رہی تھیں۔ اس جنگ میں اگر ابن رشید فتح پاتا۔ تو ترکوں کو کوئی عملی فائدہ نہ ہوتا۔ اسی طرح پر اگر ابن سعود کامیاب رہتا۔ تو انگریزوں کو کوئی خاص فائدہ نہ تھا۔ یہ صحیح ہے۔ کہ ابن رشید یہ لڑائی ترکوں کی ترغیب سے لڑ رہا تھا۔ اور اس طرح پر انگریز ابن سعود کو اپنا حامی کار سمجھتے تھے۔ میجر جنرل سر پرسی کاکس نے جو میسوپٹیمیا میں افواج انگریزی کا قائد اعظم تھا۔ انہیں ایام میں ایک انگریز افسر کیپٹن ڈبلیو۔ ایچ۔ آئی شکسپئیر کو مصالحانہ گفت وشنید کیلئے ریاض بھیجا ہوا تھا۔ اس افسر کی آمد کی غرض یہ تھی۔ کہ وہ وہابیوں کو ترغیب دلا کر ابن رشید پر حملہ کرائے تاکہ میسوپٹیمیا کے مغرب میں جو انگریزی فوج موجود تھیں۔ اُن کو نقصان کا احتمال نہ رہے۔

اس جنگ میں ابن سعود کا رسالہ ابن رشید سے مضبوط تھا۔ لیکن پیدل سپاہ نے ابن رشید کے ہاتھ سے ہزیمت اُٹھائی۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ابن سعود کے حلیف قبیلہ عجمان کے آدمیوں نے عین وقت پر دھوکہ دیا۔ اور ابن سعود کے خیمہ و خرگاہ کو لوٹ لیا۔ اس جنگ میں کیپٹن شکسپیئر بھی موجود تھا۔ کیپٹن موصوف نے انگریزی فوجی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ ایک گولی سے کیپٹن زخمی ہوا۔ ادھر جنگ کی بھاگ دوڑ میں ابن رشید کے کسی آدمی نے اس کو جان سے مار دیا۔ ابن سعود نے چاہا تھا۔ کہ انگریز افسر فوج کے ساتھ نہ جائے لیکن کیپٹن نے اپنے فرض کو چھوڑنا نہ چاہا۔ اس کو احکام ملے تھے۔ کہ وہ سعودی فوج کے ساتھ رہے۔ اور جنگ کو بہ نظر خود ملاحظہ کرے۔ ابن سعود نے زیادہ اصرار اس خیال سے نہ کیا کہ وہ انگریزوں کو اپنی طاقت دکھانا چاہتا تھا۔ جہاں اس جنگ سے عوام بددل ہوئے۔ وہاں ابن سعود بھی بہت دل گرفتہ ہوا اسے زندگی بھر میں ایک سنہری موقع ملا تھا۔ جو اس طرح پر ضائع ہوا۔ چنانچہ جہاں تک ابن سعود کا تعلق ہے عرب میں جنگ عظیم کا خاتمہ ہی سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ اس شکست کو ابن سعود کی کمزوری پر محمول کیا گیا۔ اور انگریزوں کی نگاہ میں اس کی بہت زیادہ وقعت نہ رہی۔ ابن سعود کی اس وقت کی حیثیت کا تعین دسمبر ۱۹۱۵ء کے معاہدہ میں کیا گیا۔ جو کہ عقیر کے مقام پر سر پرسی کاکس اور ابن سعود میں ہوا۔ اس معاہدہ کے پہلے ضمن میں انگریزی حکومت نے تسلیم کیا۔ کہ نجد۔ الحسا۔ قطیف اور جبیل اور ان کے متعلقات بطور استحقاق ابن سعود اور اسکے جانشینوں کی ملکیت ہیں۔ اور ان علاقہ جات میں اس کے حقوق ملکیت

کامل ہیں۔ دوسرے ضمن میں قرار پایا۔ کہ اگر کوئی غیر حکومت ابن سعود کی ریاست پر حملہ آور ہو۔ تو انگریزی حکومت اسکی امداد حملہ آور کے خلاف کریگی تیسرے ضمن میں ابن سعود نے اقرار کیا۔ کہ وہ انگریزوں کے سوا کسی طاقت سے تعلقات قائم نہ کریگا۔ اور کوئی علاقہ اجارہ کے طور پر یا کسی اور ذریعے سے کسی بیرونی طاقت کے حق میں منتقل نہیں کریگا۔ یہ قرار پایا۔ کہ جہاں ابن سعود کے اپنے مفاد کے خلاف نہ ہو۔ وہ انگریزی حکومت کے مشورہ پر عمل کریگا۔ پانچویں مد یہ تھی کہ حجاز کے مقامات مقدسہ کیلئے جس قدر راستے اس کے علاقوں میں ہونگے وہ ان کو کھلا اور محفوظ رکھیگا۔ چھٹی مد تھی۔ کہ ابن سعود کویت بحرین اور شیوخ قطار اور ساحل عمان پر کبھی حملہ نہیں کریگا۔ نہ کبھی زیادتی کریگا۔ اور جن امیروں کے تعلقات انگریزوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان کا احترام ملحوظ خاطر رکھیگا۔ آخری ضمن میں قرار پایا۔ کہ حالات کے اقتضا سے یہ معاہدہ کیا گیا ہے حالات بدل جانے پر مفصل اور جدید معاہدہ کیا جائیگا۔ گو اس معاہدہ میں انگریزوں نے ابن سعود کی اس وقت کی حیثیت کو صحیح طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ اور ابن سعود کی قدر و وقعت میں کوئی کمی واقعہ نہیں ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی جنگ کے اختتام تک ابن سعود نے انگریزوں کی حمایت میں ہاتھ نہیں اُٹھایا جسکی بڑی وجہ یہ تھی کہ مختلف اسباب کے باعث شریف حسین کا اثر و رسوخ انگریزوں میں بہت زیادہ تھا۔ اور شریف حسین سے ابن سعود کی سخت عداوت تھی۔ انگریز اس زمانے میں شریف حسین کی سیادت عملاً کل عرب پر تسلیم کرتے تھے۔ اور ابن سعود کو یہ بیحد ناگوار گذرتا تھا۔ اس زمانہ میں انگریز شریف حسین کو ۲ لاکھ پونڈ ماہوار کی بطور وظیفہ امداد دیتے تھے۔ مقابلے میں ابن سعود کو صرف پانچہزار پونڈ ماہوار ملتے تھے۔ ان رقومات کے اختلاف سے ہی ثابت ہوگا۔ کہ اس وقت انگریز شریف حسین کو ابن سعود کے مقابلہ میں کیا وقعت دیتے تھے۔ ابن سعود کو وظیفہ مارچ ۱۹۲۴ء تک برابر ملتا رہا۔ اتنی بات بہرصورت تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ کہ گو ابن سعود نے ترکوں کے خلاف جنگ عظیم میں لڑائی نہیں کی۔ اور نہ ہی انگریزوں کو براہ راست امداد دی۔ لیکن اسکی خاموشی بھی انگریزوں کو بہت مفید ثابت ہوئی۔ کیونکہ اگر وہ شریف حسین سے اس زمانے میں برسرپیکار ہو جاتا۔ تو جو جو نقصانات اس غدار شریف کے ہاتھوں ترکوں کو پہنچے۔ اُن کی روک تھام بڑی حد تک ہو جاتی۔

نومبر ۱۹۱۵ء میں شیخ مبارک والئے کویت ابن سعود کے گہرے دوست کا انتقال ہو گیا۔ اسکا جانشین جابر ہوا۔ جو ابن رشید کے خلاف ابن سعود کی معیت میں جنگ کر چکا تھا۔ جابر بھی ۱۹۱۶ء میں مر گیا۔ اس کا

بھائی سلیم جو اسکی بجائے کویت میں تخت نشین ہؤا انگریزوں کا خیر خواہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی اپنے باپ اور بھائی کی طرح سے ابن سعود کا بھی خواہ تھا۔ شیخ سلیم نے وہابی حکومت کو کمزور کرنے کیلئے الحصا کے قبیلہ عجمان کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ ۱۹۱۶ء کا پورا برس ابن سعود کو اس قبیلے کو مطیع و منقاد کرنے میں صرف کرنا پڑا۔ اسی قبیلہ کی ایک مہم میں ابن سعود کا شجاع اور وفادار بھائی سعد جو کہ ہمیشہ سے ابن سعود کا مددگار رہا تھا۔ مارا گیا۔ ابن سعود کو اپنے رشتہ داروں سے بیحد محبت ہے چنانچہ اُسے اس جوانمرگ بھائی کی وفات کا بیحد قلق ہؤا۔

اس زمانے میں عبداللطیف پاشا مندل ابن سعود کا ایجنٹ بصرہ میں متعین تھا۔ اور اسکو بیرونی دنیا کے حالات و اخبار سے مطلع کرتا رہتا تھا کیپٹن شیکسپیئر کے بعد آر۔ ای۔ اے ہملٹن کویت میں انگریزی ریذیڈنٹ مقرر ہوکر آیا۔ اس نے بھی ابن سعود کے ساتھ خوشگوار تعلقات پیدا کرلئے یہ شخص ابن سعود کی شخصیت حزم و احتیاط اور اخلاص و مصادقت کا معترف تھا۔ عجیب اتفاق ہے۔ کہ اوائل سے لیکر آج کے دن تک کوئی یورپین یا امریکن ایسا نہیں جس نے کہ ابن سعود سے ملاقات کی ہو۔ اور اسکی بینظیر خوبیوں کا بیحد مداح نہ ہوگیا ہو۔

سرپرسی کاکس اور کرنل ہملٹن کی دعوت پر ابن سعود عساکر انگریزی کے معائنہ کیلئے نومبر ۱۹۱۶ء میں بصرہ کی چھاؤنی میں آیا۔ انگریز آفیسر اور عرب آبادی اس کے ساتھ کمال حُسن اخلاق سے پیش آئی۔ اسکے اعزاز میں توپیں سر ہوئیں۔ گارڈ آف آنر ہوئے۔ اور ضیافتیں کی گئیں۔ انگریز افسران پر اسکی بینظیر شخصیت نے جو تاثرات چھوڑے ان کا مفصل تذکرہ سر آرنلڈ ولسن نے اپنی کتاب ۱۹۱۷-۱۹۱۴ میں کیا ہے۔

اس ورود میں ایک واقعہ ایسا ہؤا جس کا اثر ابن سعود کے دل پر بہت ہؤا۔ ابن سعود نے خواہش ظاہر کی۔ کہ وہ گرجے میں انگریزوں کی نماز اتوار دیکھنا چاہتا ہے۔ اتفاق سے پادری موجود نہیں تھا اسکی بجائے فرائض امامت نائب امیر البحر ڈی سینٹ اے ریک نے سرانجام دیئے۔ ابن سعود بھی اپنی جماعت میں قائد اعظم ہونے کے علاوہ امامت کے فرائض ادا کرتا ہے۔ اسلئے اس پر انگریزوں کے نظام اور سکون کا بہت گہرا اثر ہؤا۔ اور اس نے اپنے تاثرات کا پُر زور الفاظ میں ذکر بھی کیا اس ملاقات میں ابن سعود نے شریف حسین کے متعلق انگریزوں کی جانبداری کے خلاف اظہار بیزاری بھی کیا۔ وہ

حیران تھا۔ کہ عراق عرب کے انگریز افسران اُسکی امداد کرتے ہیں۔ حالانکہ انگریزی حکومت بات بات پر شریف حُسین کو فوقیت دیتی ہے چنانچہ ان انگریز افسران کی عرضداشت پر جو عراق میں متعیّن تھے۔ رولینڈ سٹورز کو قاہرہ سے جون ۱۹۱۷ء میں بصرہ بھیجا گیا جہاں اس نے ابن سعود اور شریف حُسین کے متعلق انگریزی پالیسی کی بابت گفت و شنید کی۔ اُس کا ارادہ ابن سعود سے ذاتی طور پر ملاقات کر کے اس کو مطمئن کرنے کا تھا۔ مگر گرمی کی شدت کیوجہ سے بیمار ہوگیا۔ اور نجد میں نہ جا سکا۔

سرپرسی کاکس بخوبی جانتا تھا۔ کہ صحرا کی جنگ کا اثر جنگِ عمومی پر نہیں پڑ سکتا۔ لیکن اس کا منشا تھا۔ کہ کسی نہ کسی طرح ترکوں کو شکست دیکر جزیرۃ العرب سے خارج کر دیا جائے۔ اس غرض کے لئے ضروری تھا۔ کہ عربوں کی ہمدردی حاصل کی جائے۔ اور ان سے تعلقات اور بھی مضبوط کئے جائیں چنانچہ اُس نے آواخر ۱۹۱۷ء میں ایک وفد ریاض کو بھیجا۔ تاکہ ابن سعود کے ساتھ تعلقات زیادہ مستحکم اور خوشگوار ہو جائیں۔ ایسا ہی ایک وفد ابن سعود کے پاس مصر کے انگریز حکّام نے براہ جدّہ ارسال کیا تھا۔ لیکن شریف حسین نے اپنے ملک میں سے گذرنے نہ دیا۔

ابن سعود اور شریف حُسین کے درمیان حسد و بغض اور ایک دوسرے پر تفوق کے خیالات موجزن تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی مخالفت کا کھلم کھلا اظہار کرتے تھے۔ اور ہر وقت لڑنے کیلئے بپھرتے رہتے تھے۔ انگریز چاہتے تھے۔ کہ وہ آپس میں نہ لڑیں تاکہ ان کے مفاد کو نقصان نہ پہنچے اور ترکوں کو عربوں کی خانہ جنگی کا فائدہ حاصل نہ ہو چنانچہ انگریزی حکومت نے اپنا پورا اثر و رسوخ اس بات کیلئے صرف کر دیا۔ کہ یہ دونوں کم از کم جنگِ عظیم کے دوران میں لڑنے نہ پائیں۔

کسی نہ کسی طرح وہ اپنے اس ارادے میں کامیاب بھی ہوئے۔ کہ جنگ کے پورے دوران میں دونوں کی کھلم کھلا لڑائی نہ ہو سکی۔

باب ہفدہم

شریف حسین اور سلطان کے درمیان حسد اور رقابت

اُوپر بیان ہو چکا ہے۔ کہ جنگ عظیم کے دوران میں شریف حسین کی پالیسی صرف متحدہ طاقتوں کے مصالح و منافع پر ہی مبنی نہیں تھی بلکہ وُہ شروع سے ہی ذاتی عظمت و رفعت کا خواہاں تھا۔ اسلئے اپنے ہمعصر اور ہمچشم امیروں کی فلاح و بہبود نہیں چاہتا تھا یہی وجہ تھی کہ جس زمانے میں فیصل بن حسین ترکوں کے خلاف برسرپیکار تھا۔ اسکا بھائی عبداللہ حجاز کے مشرقی علاقوں میں وبرہ اور قاسم تک ترکتازیاں کر رہا تھا۔ شریف حسین ابن سعود کی توہین کرنے کا کوئی موقعہ فرو گذاشت نہ کرتا تھا۔ اس زمانے کے واقعات کی یاد امیر عبداللہ کیلئے اتنی تلخ ہے۔ کہ ۱۹۳۳ء تک اسکی اور سلطان ابن سعود کی باہمی مفاہمت نہ ہو سکی۔ جب فیصل ترکوں کو پیچھے دھکیلتا ہُوا شمال کی طرف بڑھ گیا۔ تو شریف حسین نے عبداللہ اور علی کو مدینہ کی فتح کیلئے ارسال کیا۔ ترکی کا مشہور و معروف جرنیل فخری پاشا شہر کی حفاظت کیلئے متعین تھا۔ عربوں نے اس مقدس شہر کی تسخیر کیلئے ہر چند کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ جنگ عظیم کی صلح کے بعد جنوری ۱۹۱۹ء میں جب قسطنطنیہ سے حوالگی شہر کے متعلق احکام صادر ہوئے تو ترکوں نے مدینہ منوّرہ خالی کر دیا۔ فخری پاشا کا تحفظِ مدینہ ترکوں کی عسکری تاریخ کی درخشندہ یادگار ہے۔

ہر چند امیر عبداللہ نے اسی زمانے میں عبدالعزیز ابن سعود کے خلاف معاندانہ کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ لیکن ابن سعود جانتا تھا۔ کہ فتنہ و فساد کا اصلی باعث شریف حسین ہے۔ ایک طرف انگریز ابن سعود کو شریف پر حملہ کرنے سے روک رہے تھے لیکن دوسری طرف شریف حسین کے بلند آہنگ دعاوی حدِ اعتدال سے تجاوز کر رہے تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ کہ ابن سعود نے حجاز کیخلاف کوئی کارروائی ایسی نہیں کی تھی جس سے شکائیت کی گنجائش پیدا ہو۔ پیشتر ازیں ذکر آچکا ہے۔ کہ جنگ عظیم کے دوران میں ابن سعود تحریک اخوان کی نشوونما کرتا۔ اور نو آبادیاں بسا تا رہا تھا ابن سعود کو اپنے ملک کی فلاح و بہبود کیلئے کوشش کرنے کا کامل استحقاق حاصل تھا۔ لیکن اس کا

ایک ضمنی نتیجہ یہ بھی تھا۔ کہ مشرقی حجاز میں لوگ رفتہ رفتہ وہابی ہوتے جا رہے تھے۔ مکّہ سے جو راستہ ریاض کو جاتا ہے۔ اس پر طائف سے تین دن کی راہ پر خرما نامی ایک قصبہ واقع ہے۔ جو کہ عام طور پر حجاز کی حدود میں خیال کیا جاتا تھا۔ اس قصبہ کی آبادی نے کرنیل لارنس کے زر و مال سے بہت فائدہ اُٹھایا تھا۔ اور ترکوں کے خلاف شریف کی معاونت کیلئے سپاہیوں کا ایک دستہ بھی بھیج چکے تھے لیکن بعد ازاں خالد ابن لوی کا جو کہ خرما کا رئیس تھا۔ تنازعہ شریف حسین سے ہو گیا چنانچہ خرما کا فوجی دستہ واپس منگوا لیا گیا ۱۹۱۷ء تک اس ذاتی تنازعہ نے طول کھینچا۔ نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ اس قصبہ کی اکثر آبادی وہابی ہو گئی۔ اور خالد ابن لوی نے ان تمام لوگوں کو جو شریف حسین کی اطاعت کرنا چاہتے تھے قصبہ سے نکال دیا۔ اور از خود ابن سعود کی حکومت قبول کر لی۔

ہر چند کہ اس زمانے میں جنگ عظیم زوروں پر تھی لیکن شریف اس اہانت کو برداشت نہ کر سکا۔ چنانچہ جون ۱۹۱۸ء میں اس نے ایک مہم خرما کی سرزنش کیلئے ارسال کی۔

اس زمانے میں جب کہ ترک ہزیمت اُٹھا رہے تھے۔ اور شریف حسین بلند آہنگ دعوے کر رہا تھا نومبر ۱۹۱۷ء میں ایک انگریزی وفد ریاض میں پہنچا۔ مسٹر ایچ سینٹ جان بی فلبی جو اب مسلمان اور وہابی ہو چکے ہیں۔ اس وفد کے امیر تھے۔ اُنہوں نے اس سفر کے حالات تین ضخیم جلدوں میں قلمبند کر دیئے ہیں۔ اس وفد کے پیشِ نظر دو غرضیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ ابن سعود کو شریف حسین پر حملہ کرنے سے روکا جائے اور دوسرے اسکو ابن رشید پر جو کہ ترکوں کا بہی خواہ اور حلیف تھا۔ حملہ کرنے کی ترغیب دی جاوے۔ وفد کا کام آسان نہ تھا عرب کی سیاست میں فراہمی زر کا سوال بہت بڑا ہے۔ بغداد میں انگریز افسران کے پاس جنہوں نے یہ وفد ارسال کیا تھا۔ وافر روپیہ موجود نہ تھا۔ دوسرے شریف حسین کی حرکات سے ابن سعود بہت شاکی تھا۔ اور اسوقت ابن سعود کو حائل کے مقابلے میں کویت اور حجاز کی طرف سے زیادہ خطرات درپیش تھے۔ ابن سعود کو جراب کے مقام پر جو معرکہ پیش آیا تھا۔ اور جسکی مختصر تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ اس سے یہ خیال تھا۔ کہ آخر کار ترکوں کو فتح حاصل ہوگی۔ اور وہ عراق عرب اور شام میں پھر آ دھمکیں گے۔

وفد کی کارگزاریوں کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ آخر کار ابن سعود نے حکومتِ رشید پر حملہ آور ہونے کا پختہ وعدہ کر لیا۔ انگریزوں کے یقین دلانے پر کہ خرما کی نجد کے معاملہ میں وہ شریف حسین اور ابن سعود کے

تنازعہ کا اختتام جنگ پر تسلی بخش فیصلہ کر دینگے۔ ابن سعود نے اس تنازع کو نظر انداز کر دیا۔ اور قاسم کی طرف ستمبر ۱۹۱۰ء میں رخ کیا۔ اس وقت ابن رشید حجاز میں مدائن صالح کے میدان میں ترکوں کی معاونت کیلئے موجود تھا۔ کہ اس نے ابن سعود کی یورش کے متعلق سنا۔ شمار کے ملک بین یطب کے مقام پر فریقین کا آمنا سامنا ہوا۔ اب کے ابن سعود کو فتح حاصل ہوئی نہ صرف یہ کہ میدان مار لیا بلکہ بہت سا مال غنیمت بھی ملا۔ اس مال غنیمت کے ملنے سے ابن سعود کو نقصان ہوا۔ کیونکہ اسکی سپاہ تقسیم زر و مال میں مصروف ہوگئی۔ اور ابن رشید کو بچاؤ کا موقعہ ہاتھ آگیا۔ ابن رشید موّدج بقعا کے قلعہ میں جا چھپا۔ اس مقام پر اس کی طاقت اس قدر مستحکم تھی۔ کہ ابن سعود نے تعاقب کرنا مناسب خیال نہ کیا۔

اصل یہ ہے۔ کہ جنگ عظیم کے دوران میں ریاست حائل کی کامل تسخیر ابن سعود کے مقدر میں نہ تھی۔ کیونکہ ایسے واقعات رونما ہوگئے۔ کہ حائل کی طرف سے ابن سعود کی توجہ ہٹ گئی۔ اور حجاز کیطرف مبذول ہوئی۔

اوپر بیان ہو چکا ہے۔ کہ خالد بن لوئی حاکم خرما سے ناراض ہو کر جون ۱۹۱۸ء میں شریف حسین نے ایک مہم ارسال کی تھی۔ یہ مہم بری طرح ناکام ہوئی۔ خرما کے باشندوں نے شریف کی فوج کو شکست فاش دیدی۔ بلکہ بیرونی مدد کے بغیر توپیں اور مشین گنیں تک چھین لیں۔ جب یہ خبر ریاض میں پہنچی تو شہر نے شریف حسین کی ذلت پر خوشی منائی۔

جولائی میں شریف حسین نے پھر ایک مہم ارسال کی۔ اس کا حشر بھی ایسا ہی دردناک ہوا۔ جیسا کہ پہلے ہوا تھا۔ اس شکست پر شریف حسین بہت ہی غضبناک ہوا۔ اور ایک بڑی فوج بھیجنے کا ارادہ کیا۔ اب کے خرما والوں کے ساتھ چند سو بدوی بھی شامل ہوگئے تھے۔ شریف حسین کی کثیر فوج تیسری دفعہ بھی تباہ و برباد ہوگئی۔

شریف حسین اپنی افواج کی شکست و بربادی پر ناراض تھا۔ تو ابن سعود مصر کے انگریز افسران سے شاکی تھا۔ کہ انہوں نے شریف حسین کی روک تھام نہیں کی۔ خرما کے باشندے ابن سعود سے معاونت کے طلبگار ہو رہے تھے۔ لیکن ابن سعود انگریزوں کے لحاظ سے ٹال مٹول کرتا تھا۔ مگر خرما والوں کو تسلی و تشفی دیتا رہتا تھا۔ اور اس دوران میں انگریزوں سے گفت و شنید بھی برابر جاری تھی۔ اس عرصہ میں ابن سعود نے بارہا انگریزی وفد کے سامنے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا لیکن انگریزوں

کے ایمائے کے خلاف کارروائی کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔

مصالحت اور مفاہمت کی راہ پیدا کرنے کے خیال سے اس نے شریف حسین کے نام ایک دوستانہ خط تحریر کیا۔ لیکن شریف نے خط پڑھے بغیر بڑی حقارت سے واپس کردیا۔ اور کہا کہ وہابیوں سے صلح و آشتی ممکن نہیں۔ جب ابن سعود کو یہ حال معلوم ہوا۔ تو اس نے مصمم ارادہ کرلیا۔ کہ انگریز مانیں یا نہ مانیں۔ شریف حسین کو ضرور تباہ و برباد کردیا جائیگا۔ کیونکہ عربی حکومت کے مستحق اس کے خیال کے مطابق صرف وہ لوگ تھے۔ جو ریاض کی حکومت میں شامل تھے۔

آواخر ۱۹۱۷ء میں ابن سعود کی جو گفتگو کرنیل آر۔ ای۔ اے ہملٹن سے ہوئی۔ اس سے اس کے جذبات کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ کرنیل موصوف نے کہا تھا۔ کہ ابن سعود کچھ کام نہیں کرتا لیکن شریف حسین اپنی مساعی سے بادشاہ بن گیا ہے۔ اور دن بدن طاقتور ہو رہا ہے۔

ابن سعود نے جواب دیا۔ "آپ عربوں کو جانتے نہیں ہیں۔ ہم وادیٔ رُما کی طرح ہیں۔ ایک صدی میں دو تین دفعہ خروج کرتے ہیں۔ اور جو کچھ سامنے ہو بہا لیجاتے ہیں۔ عارضی انتظامات ہماری ترقی کو روک نہیں سکتے"۔

جب اختتام جنگ کا وقت آیا۔ تو ابن سعود شریف حسین کی حرکتوں سے خوب مشتعل ہوچکا تھا۔ مغربی فاتحین کی تمامتر توجہات شریف حسین کی طرف مبذول تھیں۔ ابن سعود کسی شمار میں نہیں تھا ابن سعود کو نہ تو ابن رشید پر فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تھی نہ ہی شیخ سلیم والی کویت کا جس نے نجد کی تمام تجارتی گذرگاہوں کو مسدود کر رکھا تھا۔ تدارک ہوسکا تھا۔ ابن سعود کے پاس اس وقت صرف وہی علاقہ جات تھے۔ جو اس نے جنگ عظیم سے پیشتر فتح کئے تھے۔ توسیع سلطنت کی تمام امیدوں پر پانی پھر چکا تھا۔ انگریزوں کے اتحاد سے سوائے حقیر مالی مفاد کے اور کوئی فائدہ نہ پہنچا تھا۔ مقابلہ میں شریف حسین کے عزت و جاہ میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ صلح کانفرنس میں بھی آسے اور اسکے لڑکوں کو اتحادی طاقتوں نے شامل کرلیا تھا۔ غرض یہ ہے کہ اسوقت کی عرب سیاست واقعات و حقائق کا صحیح آئینہ نہ تھی۔ عارضی اور غیر مستقل قوانین دوروں پر تھے۔

ان انگریز افسروں کیساتھ جو بغداد میں متعین تھے۔ اور جنکے ساتھ ابن سعود معاملات کرچکا تھا۔ اسکے تعلقات مخلصانہ تھے لیکن ان افسران کی آواز اسوقت کی انگریزی سیاست میں مؤثر اور وقیع نہ تھی۔

باب شانزدہم

عرب میں حکومت انگلشیہ کی پالیسی

اسمیں کچھ شک نہیں۔ کہ جنگ عظیم کے آخری ایّام ابن سعود کیلئے بیحد پریشان کُن تھے۔ ستمبر کے مہینے میں کوشش وسعی کے باوجود وہ ابن رشید کا قلع قمع نہ کرسکا تھا اکتوبر کے مہینے میں ریاض میں اطلاع موصول ہوئی۔ کہ برٹش حکومت نے ریاض کے انگریزی وفد کو واپس بُلا لیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہُوا۔ کہ اب انگریزی حکومت کا شریف حسین کے ایما پر منشا یہ ہے۔ کہ ابن سعود کو ابن رشید پر حملہ آور ہونے سے باز رکھا جائے۔ اور یہ کہ ایک ہزار رائفلیں اور گولہ بارُود جو کہ برٹش حکومت کی طرف سے ابن سعود کو مدد کے طور پر تحفہ کہکر دیا گیا تھا اور واقعہ میں عبداللہ النفیسی کویت میں سعودی ایجنٹ کی تحویل میں موجود تھا۔ واپس لے لیا جائیگا۔ سب سے بڑی خبر یہ تھی کہ سر ریجینالڈ جو کہ مصر میں انگریزی ہائی کمشنر تھا۔ نجد و حجاز کی سرحدّات کیمتعلق تحقیقاتی کمیشن بھیجے جانیکے سخت مخالف ہے۔ حالانکہ انگریزی وفد اور بغداد کے انگریز افسران ابن سعود کو اس بارے میں کلّی اطمینان دلا چکے تھے۔

ان تمام باتوں سے ابن سعود کے صبر کا پیالہ لبریز ہو گیا۔ مسٹر جان فلبی سے جنہوں نے اسوقت کے وہاں کے جذبات واحساسات کی مفصّل کیفیّت قلمبند کی ہے ابن سعود نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح پر کیا۔ "شریف حسین نے انگریزی حکومت کو مغالطہ میں ڈال رکھا ہے یہی وُہ عیّار شخص ہے جسکے لئے انگریزوں کی توجّہات وقف ہیں۔ صرف اسکے مشوروں پر عملدرآمد ہوتا ہے۔ ان واقعات کے بعد انگریزوں پر کون اعتماد کریگا۔ اگر تمہاری حکومت نے اپنی پالیسی میں ترمیم نہ کی تو میں دکھا دونگا۔ کہ میں خود کیا کچھ کر سکتا ہوں شریف حسین کے مکر وحیلے کے باعث میری تحقیر واہانت ہوئی ہے۔ اگر تمہاری حکومت اسکو خوش کرنے کیلئے مجھ سے بدسلوکی کرتی رہی۔ تو میں ضرور بالضرور اس پر حملہ کروں گا۔"

ہر چند کہ باامر مجبوری ابن سعود اس زمانے میں انگریزوں سے مالی مدد لیتا تھا۔ اور بعض اوقات ان کے مشوروں پر عملدرآمد بھی کرتا تھا۔ لیکن اپنے مفاد کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا تھا۔ اور نہ ہی

جرأت و صاف گوئی کو کھو بیٹھا تھا۔ کاسہ لیسانِ ہندوستان کی طرح ہر حال میں صبر و شکر کے تلخ گھونٹ پینے کا عادی کبھی نہ ہُوا تھا۔ چنانچہ متذکرہ بالا تقریر محض بیکار نہ تھی۔ جو کچھ کہا تھا۔ وہی کرنیکا ارادہ تھا

اس بارے میں انگریزوں کو خود بڑا مغالطہ ہُوا تھا۔ بعض انگریز اور اکثر عربوں نے ایسے محیر العقول کارنامے کئے تھے۔ کہ برٹش حکومت کی نگاہ اُنکی صلاحیت اور استعداد کے مقابلہ میں کسی اور پر جمتی نہ تھی۔ مابعد کی تاریخ نے یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔ کہ اس صدی کا بہترین عرب بلا شک و شبہ ابن سعود ہے لیکن جس زمانے کے واقعات ہم قلمبند کر رہے ہیں۔ اسکی شخصیت ابھی اتنی نمایاں نہ ہوئی تھی۔ کہ انگریز خاص طور پر درخورِ اعتنا سمجھتے۔ اس وقت حکومت انگلشیہ کا وزیر خارجہ مشہور مدبر لارڈ کرزن تھا لیکن پھر بھی حکومت کو عرب کے صحیح حالات و کوائف کا علم نہ تھا۔ کیونکہ اسکی واقفیت کا واحد ذریعہ مصر کا عرب بیورو تھا جسکو انگریزوں کے حلیف عربوں کے سوا کسی اور سے سروکار نہ تھا

ایک بڑی وجہ ناواقفیت کی یہ تھی۔ کہ اختتام جنگ پر متعدد اہم مسائل درپیش تھے۔ جن کے مقابلے میں مسئلہ عرب کی کچھ قدر و قیمت نہ تھی۔ عراق عرب کے انگریز افسران ابن سعود کیمتعلق پیہم سفارشات کرتے رہے لیکن کرنل لارنس اور دوسرے مشہور انگریزوں کی مخالفت کے باعث اُنکی کچھ شنوائی نہ ہوئی۔

اس زمانے میں ابن سعود عجیب کشمکش میں تھا۔ اُسے معلوم نہ تھا۔ کہ اتحادی طاقتیں اس کی حیثیت کو تسلیم کرینگی یا نہیں اور یہ کہ اس کیلئے کیا سلوک روا رکھیں گی۔

اِدھر شریف حسین بھی مطمئن نہ تھا۔ ۱۹۱۵ء سے جبکہ اس نے انگریزی حکومت سے سازباز کی تھی۔ اسکی خواہش یہ تھی۔ کہ جنگ عظیم کے اختتام پر وہ وسیع عرب سلطنت کا جسکی وسعت اناطولیہ سے بحر الہند تک اور ایران سے بحیرہ رُوم تک ہو شہنشاہ قرار پائے۔ جنگ کے التوا پر اُسنے دیکھا کہ فرانسیسی شام میں متمکن ہو گئے ہیں۔ یہودی فلسطین میں آباد ہو رہے ہیں۔ اور انگریز عراق عرب پر قابض و متصرف ہو گئے ہیں۔ شریف حسین خیال کرتا تھا۔ کہ اتحادی طاقتوں نے اس کے ساتھ بدعہدی کی ہے۔ لیکن اُس نے عبداللہ اور فیصل کو اتحادیوں سے معاملات طے کرنے کیلئے بھیجدیا۔ اور خود اندرونِ عرب پر پُورا تصرف کرنے کیلئے ساعی ہُوا۔ سب سے پیشتر خرما کے مقام پر پے در پے تین شکستوں کا انتقام لینا تھا۔ ناظرین کو یاد ہو گا۔ کہ آخری مرتبہ سلطان ابن سعود نے

خرما والوں کو شریف حسین کے مزید حملے کی صورت میں مدد دینے کا حتمی وعدہ کیا تھا۔ ابن سعود کا ارادہ تھا کہ یہ قصبہ وہابیوں کے تصرف میں رہے۔ شریف حسین اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا تھا۔ فروری اور مارچ ۱۹۱۹ء میں نجدی اور حجازی طاقتوں کا نبرد آزما ہو جانا ناگزیر تھا۔

ان حالات کو دیکھکر انگریزوں نے ۱۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو اپنے محکمہ جات کی مجلس مشاورت قائم کی تجویز یہ ہوئی۔ کہ شریف حسین کو مدد دی جائے۔ رائے عامہ یہ تھی۔ کہ جنگ کی صورت میں شریف حسین بہترین اور جدید ترین اسلحہ کی بدولت ابن سعود پر بآسانی فتح پا لیگا۔ لارڈ کرزن نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا۔ کہ انگریزی پالیسی وہی ہے۔ جو شریف حسین کی وضع کردہ ہے۔ چنانچہ قرار پایا۔ کہ خرما حدود حجاز میں شامل ہے۔ اور ابن سعود کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ذکر شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ صرف مسٹر جان فلبی کی جو کہ اس کانفرنس میں موجود تھا۔ رائے یہ تھی۔ کہ اس معرکے میں شریف حسین ابن سعود کے مقابلے میں فتح نہیں پا سکتا۔

مئی ۱۹۱۹ء میں ابن سعود نے شریف حسین پر حملہ آور ہونیکی تیاری شروع کر دی۔ وائٹ ہال میں ایک اور کانفرنس ہوئی۔ اور ابن سعود کے وظیفہ کو پانچ ہزار پونڈ سے گھٹا کر پچیس ۲۵ سو پونڈ کر دیا گیا۔ اس واقعہ کی اطلاع ابن سعود کو نہ ہوئی۔ وہ تیاریوں میں ہمہ تن مصروف تھا۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ اس کا مستقبل اس ایک معرکے پر منحصر ہے۔

ابن سعود کیخلاف شریف نے بھی اپنے بیٹے عبداللہ کی قیادت میں ایک لشکر جرار تیار کیا۔ لشکر کے ساتھ بہت سے بدوی لوٹ کے لالچ سے ہو گئے۔ چار ہزار نوجوان نظامی فوج کے تھے جن کے عراقی اور شامی افسران ترکی حکومت کے تربیت یافتہ تھے۔ اور جنگ عظیم کے تجربات نے انہیں جدید اسلحہ کا استعمال خوب سکھا دیا تھا۔ شریفی فوج کی تیاریاں ماہ اپریل کے آواخر میں مکمل ہو گئیں طائف سے یہ لشکر حشم و وقار کے ساتھ طرابہ کی طرف چلا۔ یہ گاؤں خرما سے چالیس میل کے فاصلے پر جانب جنوب غرب واقع ہے طرابہ پہنچکر امیر عبداللہ کو معلوم ہوا۔ کہ بعض لوگ یہاں بھی دشمن کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ امیر نے ان سب کو تہہ تیغ کر دیا۔ مقتولین کے ورثا بظاہر تو شریف کی اطاعت کا دم بھرتے رہے۔ لیکن خفیہ طور پر یہاں کے استحکامات و انتظامات کا حال خرما والوں کو کہلا بھیجا۔

ابن سعود اس وقت اپنی افواج لئے خرما سے کئی میل دور جانب مشرق موجود تھا۔ کہ طرابہ

والوں کا پیغام خالد ابن لوئی والئے خرما کو پہنچا۔ اس شجاع مرد نے نہ ابن سعود کو اطلاع دی اور نہ ہی باضابطہ اجازت حاصل کرنی ضروری سمجھی۔ اپنے گاؤں کی کار آزمودہ جماعت کو لیکر ۲۴ مئی کی رات کوطرابہ پر چڑھ دوڑا۔ اور رات کے اندھیرے میں جبکہ شریفی افواج آرام واطمینان کی میٹھی نیند سورہی تھیں۔ ان کو تہہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ وہ قتل و خون ہوا کہ الامان الامان وہابیوں کی یہی شجاعت و بسالت تھی جس نے ایک صدی پیشتر عالم اسلامی کو متحیر و مبہوت کر دیا تھا۔ بہت سے شریفی ابھی بستر پر ہی تھے۔ کہ قتل کر دئے گئے۔ بعض اٹھ کر سنبھلنے نہ پائے تھے۔ کہ تہہ تیغ ہوئے۔ پانچ ہزار شریفی افواج میں سے صرف یک صد آدمی اس خونچکاں سرگذشت کو بیان کرنے کیلئے زندہ رہے۔ امیر عبداللہ جان بچا کر بھاگ گیا۔ اسکی زبان سے شریف حسین کو فوج کی مکمل تباہی و بربادی کا حال معلوم ہوا۔ اگلے دن ۲۵ مئی کو ابن سعود اپنے عساکر کو لیکر بنفس نفیس طرابہ پہنچا۔ اور مقتولین کے انبار بچشم خود ملاحظہ کئے۔ کشتگان کی اتنی تعداد شائد اس نے بھی نہ دیکھی تھی۔ بے نظیر شجاعت کے باوجود ابن سعود نرم دل واقعہ ہوا ہے۔ اس قدر کشت و خون پر بیحد متاسف ہوا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے حسرت بھری آہ لیکر کہنے لگا۔

"اللہ نے یہ بار شاقہ مجھ پر ڈالا ہے۔ مشرکین کو راہ راست پر لانے کی ذمہ واری میرے مقدر میں کر دیگئی ہے۔ کاش میں ایک معمولی سپاہی ہوتا۔"

ابن سعود نے یہ الفاظ کمال خلوص قلبی سے کہے تھے۔ سننے والے عام اس سے کہ موافق تھے۔ یا مخالف بیحد متاثر ہوئے۔ یہ الفاظ انہیں ہمیشہ یاد رہیں گے۔ اور نسل بعد نسل روائت کئے جائیں گے۔

جب یہ خبر مشہور ہوئی۔ تو دنیا دنگ رہ گئی۔ کہ ابن سعود نے نہیں۔ بلکہ اس کے ادنی ماتحت نے شہنشاہ عرب یعنی شریف حسین کی بہترین فوج کو تباہ کر دیا ہے۔ اندیشہ تھا کہ پہلے وہابی خروج کی طرح سے یہ لوگ پھر مقامات مقدسہ پر قبضہ کر لیں گے۔ اس وجہ سے اضطراب اور خوف کی لہر اٹھی۔ اور تمام عالم اسلام میں پھیل گئی حج کا موسم قریب تھا۔ بیرونی ممالک سے ہزارہا حاجی حج کیلئے آئے ہوئے تھے۔ اور اس وقت جدہ میں مقیم تھے۔ یہ لوگ بیحد پریشان ہوئے اور اپنے اپنے ملک کے قونصل کو مدد کے پیہم مطالبات سے تنگ کرنے لگے۔ اتنے جہاز موجود نہیں تھے۔ کہ

حاجیوں کو بیک وقت اُنکے ملکوں میں پہنچا سکیں۔

لیکن ابن سعود کا ارادہ ابھی اور آگے بڑھنے کا نہیں تھا۔ وُہ سمجھتا تھا۔ کہ اسکی برتری اور تفوق کے اظہار کیلئے طرابہ کا واقعہ ہی کافی ہے۔ برٹش حکومت کو یقین ہو جائیگا۔ کہ عرب کی سیاست سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ چنانچہ ابن سعود مشرق کی طرف کو ہٹ آیا۔ حقیقت میں ابن سعود کا یہ فعل انتہائی دانشمندی اور بہترین تدبّر و تفکر کی دلیل تھا۔ اگر ابن سعود اسوقت پیش قدمی کرتا۔ تو مختلف طاقتیں مزاحم ہوتیں۔ اور انگریزوں کیلئے تو شریف حسین کی مدد ناگزیر تھی۔ گو شریف حسین اور انگریزوں کا ابھی تک باقاعدہ معاہدہ نہیں ہُوا تھا۔ جبتک مقامات مقدّسہ محفوظ و مصئون تھے کسی کو دخل اندازی کی ضرورت نہ تھی۔

انگریز شریف حُسین سے خوش تو پہلے بھی نہ تھے۔ کیونکہ اُسکی وسیع خواہشات کو پورا کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ لیکن اس معرکہ کا اثر انگریزی پالیسی پر بہت گہرا ہُوا۔ اب اُنہیں معلوم ہُوا۔ کہ ابن سعود کی شخصیت نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہے۔ شریف حسین کیلئے انگریزی امداد ابھی تک بالکل مفقود تو نہیں ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی انگریزوں کی نگاہ میں ابن سعود کی عزّت و وقعت بہت بڑھ گئی اس طرح پر ابن سعود کو شریف حسین کی تذلیل و تحقیر کا موقعہ ہاتھ آگیا۔

بابِ نوزدہم

اندرونِ عرب کی مکمّل فتح

پیشتر ازیں بیان ہوچکا ہے۔ کہ خرما کے غیر منظّم دیہاتیوں نے شریف حُسین کی آلاتِ جدیدسے مسلّح اور منظّم افواج کو پے در پے تین دفعہ شکست فاش دی۔ فتح اور مال غنیمت کے لحاظ سے تو یہ کوئی بڑا واقعہ نہ تھا۔ لیکن نتائج کے اعتبار سے دُور رس فوائد کا حامل تھا۔ اس واقعہ سے وہابیوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ ابن سعود شریف حُسین کی پشت پر انگریزوں کی کمک دیکھکر بہت جلتا تھا۔ لیکن پھر بھی اتنی بات اچھی طرح سے جانتا تھا۔ کہ برٹش گورنمنٹ کی مدد اس کیلئے ناقابلِ قیاس منفعت کا باعث

ہو سکتی ہے۔ وہ انگریزوں کی دوستی اور حوصلہ افزائی کا اسقدر خواہاں تھا۔ کہ ۱۹۱۹ء کے آواخر میں اس نے اپنے دوسرے بیٹے فیصل کو جنگ عظیم کی فتح پر مبارکباد دینے کیلئے لندن بھیجا۔ اسوقت شہزادہ فیصل کی عمر صرف چودہ ۱۴ برس کی تھی۔ اس آمد سے اتنا فائدہ ضرور ہؤا۔ کہ سلطنت متحدہ میں عوام کو ابن سعود اور اسکی سلطنت کے وجود کا علم ہو گیا۔ اور انہیں معلوم ہؤا۔ کہ جزیرۃ العرب میں شریف حسین ہی واحد فرمانروا نہیں ہے۔ احمد ابن ثنونیان اور مسٹر سینٹ جان فلبی شہزادے کی معیت میں تھے۔ بیان کیا گیا کہ اس وفد کے پیشِ نظر کوئی خاص سیاسی مقاصد نہ تھے۔

اس زمانے میں شریف حسین انگریزوں کی طرف سے دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ اسکی اُمیدیں خاک میں مل چکی تھیں۔ اور اس کے بلند آہنگ دعوے مسترد کر دیئے گئے تھے۔ ۱۹۱۶ء کے سکائس پکٹ نامی معاہدے کا انکشاف ہو چکا تھا۔ اور یہ حقیقت بخوبی معلوم ہو گئی تھی۔ کہ عراق اور شام کے حصے بخرے انگریز اور فرانسیسی باہمی سمجھوتے سے کر چکے ہیں۔ یہودیوں کیلئے ۱۹۱۷ء کے بلفور ڈیکریلیشن کے مطابق فلسطین میں وطن تیار ہو رہا تھا۔ امیر فیصل بھی باپ کی اطاعت کو ناگوار سمجھتا تھا۔

بہرکیف شریف حسین طرح طرح کے مصائب میں گھرا ہؤا تھا۔ اور انگریزوں کی بدعہدی اور عہد شکنی سے بہت نالاں تھا۔ لیکن پھر بھی انگریزوں کی اُن تجاویز سے جو ۱۹۲۱ء میں ٹی۔ ای لارنس کی وساطت سے جدّہ میں پیش کی گئیں متفق نہ تھا اور کوئی ایسا معاہدہ کرنا نہ چاہتا تھا۔ جو کہ اسکی منشائے شہنشاہیت کے خلاف ہو۔

بیرونِ عرب کے حالات سے مایوس ہو کر اس نے چاہا کہ کم از کم اندرونِ عرب میں اپنی حیثیت کو مستحکم کرلے۔ وہ اپنا سب سے بڑا رقیب ابن سعود کو سمجھتا تھا۔ اس نے حائل۔ کویت اور عسیر کے امرا کو ترغیب دی۔ کہ ابن سعود سے جنگ کر کے اُسے تباہ و برباد کر دیں۔ اس نے ابن رشید اور عسیر کے والی کو تہدیدی مکتوبات لکھے۔ کہ وہ وہابیوں سے برسرِ پیکار ہوں۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ وہابیوں نے یہ خطوط راستے میں ہی دبوچ لئے۔

خرما کے واقعات سے حجاز کے قبائل ابن سعود سے خائف تھے۔ وہ سمجھتے تھے۔ کہ اخوان کی اس غیر متوقع کامیابی کو دیکھکر ابن سعود نچلا نہیں بیٹھیگا۔ اور حجاز کے کسی نہ کسی حصہ پر ضرور حملہ آور ہوگا۔ ابن سعود بڑے غور و تعمق سے حالات کو دیکھ رہا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے عسیر سے نپٹ

لینا چاہا۔ یہ صوبہ بھی سرزمین بے آئین تھا۔ اسکے ایک حصہ میں یمن کا اثر تھا۔ ایک حصے میں شریف حسین کو رسوخ حاصل تھا جنگ عظیم کے اختتام سے پیشتر اس کے ایک حصہ پر ترکوں کا اقتدار قائم تھا۔ اور اس کا ایک اور حصہ ادریسی خاندان کے ماتحت مطلقاً آزاد تھا۔ ادریسیوں کا صدر مقام صابیہ تھا۔ ناظرین کو شاید معلوم ہو گا۔ کہ جنگ عظیم میں عرب میں سب سے پہلے یہی ادریسی خاندان اتحادیوں کی مدد کیلئے جنگ میں کودا۔ اور اتحادیوں کی فتح کے بعد گرد و نواح کے علاقوں میں ہاتھ پاؤں پھیلاتا رہا۔ ۱۹۲۰ء کے موسم گرما میں ابن سعود نے پانچہزار جوانوں کا ایک جرار لشکر تیار کیا۔ اور اپنے کمسن بیٹے فیصل کو اس کا سپہ سالار مقرر کیا۔ عسیر کا صدر مقام ریاض سے سات سو میل کے فاصلہ پر تینتیس دن کی مسافت پر تھا۔ کمسن شہزادے کو اس دشوار مہم پر بھیجنا انوکھی سی بات تھی۔ لیکن شہزادہ اس صعوبت کی جنگ سے شاد کام و بامراد پھرا۔ اس مہم کے بھیجے جانیکی وجہ یہ تھی۔ کہ جنگ عظیم سے ایک سال پیشتر شریف نے والئے عسیر کی گوشمالی کردی تھی۔ اور والی نے ابن سعود سے مدد طلب کی تھی۔ ابن سعود نے ایسے موقعہ کو غنیمت جان کر کمک بھیجدی تھی۔ اس معاملے کے متعلق مورخین کا اختلاف ہے مسٹر سینٹ جان فلبی لکھتا ہے۔ کہ ابن سعود نے یہ لشکر والی کے کمک طلب کرنے پر بھیجا تھا۔ لیکن امین ریحانی کہتا ہے کہ مدد پہلے ہی جا چکی تھی۔ ایک وہابی دستہ عسیر میں متعین تھا عسیر والوں نے وہابی حکام کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اور ابن سعود نے یہ لشکر باغیوں کی سرزنش کیلئے بھیجا تھا۔ بہر کیف ابن سعود پہلی وہابی سلطنت کے خیال سے اس صوبہ میں اپنے آبائی حقوق سمجھتا تھا۔ اور مکمل فتح کیلئے صرف وقت اور موقع کا منتظر تھا۔

وسائل نقل و حرکت کے فقدان کیوجہ سے صدر مقام سے اتنے دور علاقے پر حملہ کرنا آسان نہ تھا لیکن سلطنت کی توسیع کیلئے اسوقت صرف یہی ایسا صوبہ تھا جسکی آویزش کی وجہ سے بین الاقوامی پیچیدگیوں کے پیدا ہونے کا احتمال نہ تھا۔ عسیر کے ایک حصہ تہامہ کی آب و ہوا اخوان کے راس نہ آئی۔ اور وہاں سے انکو پسپا ہونا پڑا۔ لیکن ملک کے کثیر حصے کو وہابیوں نے بزور شمشیر فتح کر لیا۔ فیصل اس علاقے میں براہ راست نجدی حکومت قائم کر کے ریاض لوٹا۔ جہاں اس کا استقبال بحیثیت فاتح کیا گیا۔

اس واقعہ سے شریف حسین کو سخت رنج ہوا۔ حجاز کے شمالی علاقوں پر اتحادی قبضہ جما چکے

تھے جنوب میں اب اس کا سخت ترین دشمن آدھمکا یمن کیساتھ جو تعلقات حجاز کے تھے۔ اُنکی راہ میں روڑا اٹک گیا۔ وہابیوں نے حجاز اور یمن کے راستوں کو مسدود کردیا چنانچہ اسی زمانے میں حجاج کا ایک قافلہ جو یمن سے مکہ مکرمہ کو آرہا تھا۔ راستہ میں روک لیا گیا شریف حسین نے سوچا۔ کہ ابن رشید کو ابن سعود کے مقابلہ میں کھڑا کردیا جائے۔ ناظرین کو معلوم ہے کہ جنگ عظیم میں خاندان رشید ترکوں کا وفادار رہا تھا اور شریف ترکوں سے بغاوت کرچکا تھا۔ لیکن پھر بھی شریف حسین کی نفرت ابن سعود کے ساتھ اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ وہ ابن رشید کو اس کے مقابلے میں بارہا مدد دے چکا تھا۔ چنانچہ شریف نے ابن رشید کو بہت ساز و مال اور اسلحہ دیا۔ کہ وہ وہابی حکومت پر حملہ کرے۔ ابن رشید گو اپنی حیثیت کو قائم رکھے جاتا تھا۔ لیکن ترکوں کی تباہی کیوجہ سے یکہ و تنہا رہ گیا تھا شریف حسین کی دوستی کے لالچ سے ہنسی خوشی حملہ کے لئے تیار ہو گیا۔

۱۹۲۰ء کے اواخر میں سعود بن رشید والئے حائل کو کسی نے جان سے مار دیا۔ یہ فرمانروا حوصلہ مند ذی وقار اور ایک پایۂ کا مدبر تھا۔ اُس نے حال ہی میں جوف کا ضلع نوری شعلان والئے رولا سے چھین لیا تھا۔ کسی نہ کسی طرح وہ اپنی آبائی ریاست کو ترکوں کی تباہی کے باوجود بچاتا رہا۔ اسکے بعد عبداللہ بن متعب اس کا بھتیجا تخت نشین ہُوا۔ اور ایک برس تک حکمرانی کرتا رہا۔ یہ شخص کمزور طبیعت تھا اور حائل کی رعایا میں جو بد دلی اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ اسکو کم نہ کرسکا تھا۔ اس حالت کو دیکھکر ابن سعود نے خیال کیا۔ کہ حائل کو فتح کرنے کا مناسب وقت آپہنچا ہے۔ اخوان غزوے کیلئے پہلے ہی مصر تھے صرف احکام صادر کرنے کی دیر تھی۔

۱۹۲۱ء کے موسم بہار میں ابن سعود نے حائل پر حملہ کرنے کی تجویز مکمل کرلی۔ قرار پایا کہ حملہ تین طرف سے ہو۔ افواج کا بیشتر حصہ اس کے بھائی محمد کی قیادت میں ریاض سے شمال کی جانب بھیج دیا گیا۔ مشرق کی جانب فیصل الدویش اخوان کی ایک جماعت کو لیکر گیا۔ اور شمال اور شمال مغرب کی جانب نوری شعلان ترکتازیاں کرنے لگا۔ سلطان نے قاسم کو اپنا صدر مقام بنالیا۔ محمد اپنے بھائی اور سعود اپنے بیٹے کو دو لشکر دیکر حکم دیا۔ کہ حائل کا محاصرہ کریں۔ عبداللہ ابن متعب مستقل طبیعت کا انسان نہ تھا حیران تھا۔ کہ اس سخت مہم میں کس کس کا مقابلہ کرے۔ چاروں طرف دشمن پھیل چکے تھے عبداللہ بہادر بھی نہ تھا۔ فلسفیانہ طبیعت رکھتا تھا۔ مجبوراً اس نے اپنے آپ کو ابن سعود کے رحم پر چھوڑ دیا۔

ابن سعود نے اسکو قیدی کی حیثیت میں ریاض بھیجدیا عبداللہ آجتک ریاض میں مقیم ہے۔ اور اپنی قسمت پر قانع اور حالات سے مطمئن ہے۔

عبداللہ ابن متعب کے بعد بھی حائل نے آسانی سے سلطان ابن سعود کی اطاعت قبول نہ کی۔ رشید خاندان کا ایک فرد محمد بن طلال حائل کا فرمانروا بن بیٹھا۔ یہ شخص شجاع اور مستقل مزاج تھا۔ اس نے مقابلہ کی تیاریاں بڑے شد و مد سے کیں۔ اور وہابیوں سے جنگ کرنے کیلئے فوج لیکر حائل سے باہر نکلا۔

لیکن صورتِ حالات نوجوان محمد ابن طلال کے اختیار سے باہر ہو چکی تھی۔ شمال میں نوری شعلان نے ضلع جوف پر قبضہ کر لیا تھا۔ ادھر فیصل الدویش قبائل شمار کے سر پر بلائے مبرم کی طرح سے موجود تھا۔ آخر کار فیصل الدویش اور محمد میں جنگ ہوئی۔ وہابیوں نے اپنے جوش اور مذہبی عصبیت کیوجہ سے فتح پائی۔ لیکن پھر بھی محمد کے لشکر کا قلع قمع نہ کر سکے۔ رشیدی افواج جتھا میلہ ور طیبا سبے کے قلعوں میں بند ہو کر بیٹھ گئیں۔ ابن سعود کو جب حالات کا علم ہوا۔ تو وہ توپخانہ لیکر فیصل کی مدد کیلئے پہنچا محمد ابن طلال توپخانہ کی تاب نہ لا سکا اور پسپا ہو کر حائل کو بھاگا۔ حائل میں بھی محافظت کا سامان موجود نہ تھا۔ شہر کی فصیل بوسیدہ ہو چکی تھی۔ اور قلعہ بھی اطمینان بخش حالت میں نہ تھا۔ ابن سعود نے محمد کا تعاقب کیا اور حائل کا محاصرہ کر لیا۔ جب تک ممکن ہو سکا محمد مقابلہ پر ڈٹا رہا۔ لیکن آٹھ ہفتوں کے محاصرے کے بعد اس نے صلح کا پیغام بھیجا اور اپنے تئیں ابن سعود کے حوالہ کر دیا۔ عبداللہ ابن متعب کی طرح محمد ابن طلال بھی ابن سعود کے ہاں ریاض میں آج کے دن تک پناہ گزین ہے۔ امین ریحانی نے اپنی ایک کتاب میں اس خاندان کے موجودہ حالات اور ریاض کی معاشرت کے متعلق مفصل کیفیت بیان کی ہے

اس طرح پر اس عظیم الشان اور پرشکوہ عربی ریاست کا خاتمہ ہو گیا۔ ناظرین کو معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ اس ریاست کا انتظام اور اقتدار چند زبردست اور عظیم شخصیتوں پر منحصر تھا۔ جنہیں خصوصیت کے ساتھ محمد ابن رشید قابل ذکر ہے۔ جو کہ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۹۷ء تک تزک و شان سے حکومت کر کے لاولد مر گیا ریاست کی تباہی کے بعد قبائل شمار کی عظمت خاک میں مل گئی۔ کثیر حصہ ابن سعود کی حکومت میں آ گیا۔ لیکن ایک جماعت جسے وہابی حکومت ناگوار تھی۔ عراق میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اتنی بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ابن سعود نے نو مفتوح شہر حائل کے باشندوں کے ساتھ نہایت رحمدلی اور فراخ حوصلگی سے سلوک کیا۔ پال ہیریسن صاحب جو امریکہ کے باشندے ہیں اور عرب کے حالات سے بخوبی واقف ہیں لکھتے ہیں۔ کہ ابن سعود نے حائل میں کمال دانشمندی اور رقیق القلبی کا ثبوت دیا۔ شہر کے فتح کرنے

سے اس کا اتنا اقتدار قائم نہیں ہوا جتنا کہ شہر کے باشندوں سے حُسنِ سلوک اور رحم کے نصیب ہوا۔ اخوان کو جو قتل و غارت کے عادی ہیں۔ سختی سے لُوٹ مار سے روک دیا گیا۔ حائل کے وُہ باشندے جو وہابی نہیں تھے اور ابن سعود کے آباؤ اجداد کی سختی کے فسانے سُن کر خوفزدہ اور ہراساں ہو رہے تھے۔ ابن سعود کے امن و امان اور انصاف پروری کو دیکھ کر متحیر رہ گئے۔ حائل کی شیعہ آبادی کو حکم دیا گیا۔ کہ وُہ سلطان کے حضور میں حاضر ہوں۔ یہ مصیبت زدہ لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ یا تو قتل کئے جائینگے یا جلا وطن۔ لیکن سلطان نے ان کو امن و امان اور انصاف کا بنفسِ نفیس یقین دلایا۔ اس واقعہ سے ثابت ہو گیا کہ وہابیوں میں اب وُہ قساوتِ قلبی باقی نہیں جس سے ان نام نہاد مشرکین کو اتنا خوف لاحق رہتا تھا۔ اور یہ کہ وُہ لوگ جو وہابی نہیں ہیں۔ ابن سعود کے ماتحت امن و اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ وہابیوں کے قدیم عقیدے کے مطابق مشرکین کا قتل اب فریضہ مذہبی نہیں سمجھا جاتا۔

ابن سعود کے فاتحانہ کارناموں میں بہت سی درخشندہ مثالیں ایسی ہیں۔ کہ غیر مذاہب کے لوگوں سے رحم و انصاف کا سلوک کیا گیا۔ لیکن دیانت کا اقتضا یہ ہے۔ کہ یہ بھی بیان کر دیا جائے۔ کہ مفتوحین سے نیک سلوک صرف اسی صُورت میں ہُوا جبکہ ابن سعود خود موقعہ پر موجود تھا۔ اس کی غیر حاضری میں اخوان نے اپنے طور پر بلا اجازتِ سلطان بارہا ظلم اور زیادتیاں کی ہیں جن کا ذکر موقع بموقع کر دیا گیا ہے اس حقیقت سے جہاں سلطان کی رعایا پروری اور رحمدلی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہاں اخوان کی طبیعت و فطرت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے۔ سلطان ان اکھڑ صحرائیوں کی روک تھام کرتا رہتا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ذکر کر دیا جائے۔ کہ جزیرۃ العرب میں ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء میں شدید قحط پڑا تھا خشک سالی کی وجہ سے خورد و نوش کا سامان بہت ہی دقّت سے دستیاب ہوتا تھا۔ فاقے کی وجہ سے ہزارہا غربا و مساکین کی جانیں تلف ہو گئیں تھیں۔ ہزارہا مویشی پیاس کی وجہ سے مر گئے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی تھی۔ کہ ایک زمانے میں نقل و حرکت کے وسائل اور سواری کی کمی کی وجہ سے حائل کے محاصرے کو قائم رکھنا بھی محال ہو گیا تھا۔ سعودی افواج کے سینکڑوں آدمی خوراک کی قلت کی وجہ سے مر گئے تھے۔ اس قسم کے حالات میں حائل کا امن و امان اور لوٹ مار سے اجتناب بے نظیر ایثار اور بے مثال قربانی کی دلیل ہے۔

ریاض اور حائل کے تعلقات کو اور بھی مستحکم کرنے کے لئے ابن سعود اور اس کے ولی عہد سعود نے خاندان رشید میں شادیاں کیں۔ اس بات کا اثر بہت خوشگوار ہوا۔ اور اہالیان حائل کے دل سے مغائرت جاتی رہی۔

حائل کی فتح سے ابن سعود کا تسلط عرب کے تمام اندرونی علاقوں پر ہوگیا۔ اور خاندان سعود کے ایک دیرینہ دشمن کا خاتمہ ہمیشہ کیلئے ہوگیا لیکن حائل کی پوری آبادی مطیع نہ ہوسکی۔ ایک معقول تعداد نے عراق کی طرف ہجرت کی۔ اور کوشش کے باوجود آجتک واپس نہیں آئی۔ یہ لوگ وہابیوں سے بارہا جنگ کر چکے تھے۔ اور ریاست حائل کا تمام تر دارومدار انہیں پر تھا۔

اس طرح پر وہابی سلطنت کی حدود عراق عرب تک وسیع ہوگئیں۔ اس اتصال کیوجہ سے سرحد بندی کے متعلق طرح طرح کے معاملات پیش آئے۔ دس برس تک نجد اور عراق میں تنازعہ قائم رہا۔ بارہا ان دونوں ریاستوں میں جنگ چھڑ جانے کا احتمال پیدا ہوا۔ ابن سعود کی حیثیت کو نقصان پہنچنے کا ایک سبب پیدا ہوگیا۔ اور اس کی سلطنت کا ایک کمزور پہلو نمایاں ہوگیا۔ عراق کے اتصال سے جو جو پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ اُن کا ذکر علیحدہ باب میں کیا جائیگا۔ ظاہر ہے کہ حائل کی فتح سے عرب ریاستوں کا قدیم توازن قائم نہ رہا تھا۔ ابن سعود کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔

باب ہشتم

خاندان آلِ رشید کا زوال و انحطاط

جب عبدالعزیز ابن سعود جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ تو خاندان رشید اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا بلکہ اپنے منتہائے اوج پر پہنچکر تنزل و انحطاط کے آثار پیدا کر چکا تھا۔ پیشتر اس کے کہ اس خاندان کے زوال کی المناک کہانی بیان کی جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کا شجرہ نسب بیان کر دیا جائے۔ تاکہ ناظرین کیلئے حالات سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جائے۔ (شجرہ نسب اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)
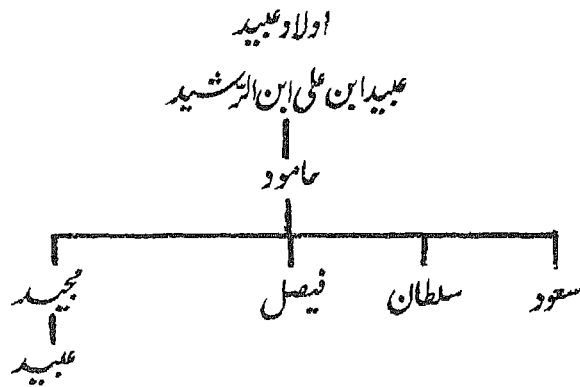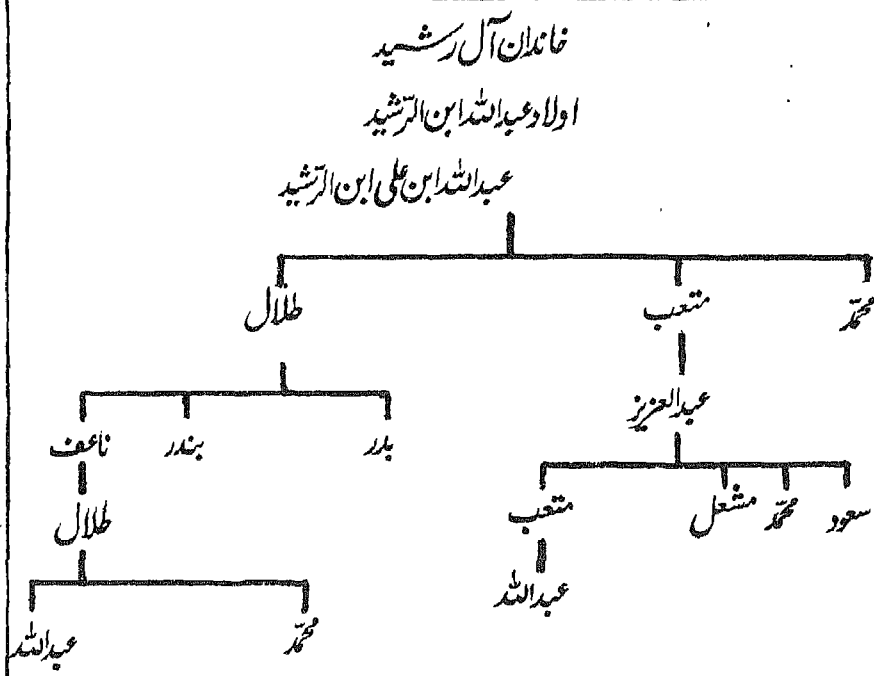
جب وہابی حکومت کو ترکوں اور مصریوں نے تباہ و برباد کر دیا۔ تو ابن رشید کی ریاست حائل برسر ترقی ہوئی۔ اور یہاں تک اوج پایا۔ کہ ایک زمانے میں عرب بھر میں آل رشید سے بڑھکر کوئی امیر باشوکت و سطوت نہ تھا۔ لیکن عبدالعزیز ابن سعود موجودہ سلطان کے شباب کے زمانے کے قریب اس عظیم الشان خاندان کا انحطاط شروع ہو چکا تھا۔ جنگ عظیم کے دوران میں ترکوں اور جرمنوں نے مدد بھی کی اور زمانہ مابعد میں شریف حسین والئے حجاز نے بھی امداد کی۔ لیکن اس خاندان کی اخلاقی حالت اس قدر گر

چکی تھی کہ کوئی طریقہ کارگر نہ ہُوا۔

اس خاندان کے زوال کے وجوہات محض سیاسی نہ تھے۔ بلکہ اور بھی تھے۔ عجیب بات ہے کہ گو عرب کے وسیع صحراؤں میں رہنے والوں کو ایسے امراض نہیں ہوتے لیکن اس خاندان کے مردوں میں مراق وسودا اور عورتوں میں ہسٹیریا عام طور پر موجود تھا۔ شمّر کا آخری فرمانروا محمد بن طلال بیحد مغموم رہتا تھا۔ عبداللہ ابن متعب جس نے محمد ابن طلال کے تین ماہ بعد سلطان ابن سعود کی اطاعت اختیار کی بیحد سادہ لوح اور بیوقوف تھا۔ اسی طرح سے فیصل اس کا چچا ناہنجار اور ناکارہ تھا۔

عبدالعزیز ابن متعب ابن الرشید اپنی وسیع آبائی ریاست پر حکمرانی کرتا تھا جبکہ سلطان ابن سعود اس کا ہمنام ابھی غیر معروف شخصیت تھا۔ اور کویت میں شیخ مبارک کے ہاں پناہ گزین تھا۔ عبدالعزیز ابن متعب محض اتفاقیہ طور پر ایک جنگ میں مارا گیا۔ اسکی فوجیں ظہر کے وقت سے لیکر گہری شام تک بڑی جانفشانی سے لڑتی رہی تھیں کسی کو بھی فتح حاصل نہیں ہوئی تھی۔ عبدالعزیز ابن متعب تمام رات سو نہ سکا۔ صبح منہ اندھیرے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے کیمپ کا ملاحظہ کرتا ہُوا غلط فہمی سے مخالفین کے کیمپ میں جا گھسا۔ اور گولیوں کا نشانہ ہو کر مر گیا۔ اسے بیوقوفی کی موت ہی کہنا چاہئے۔ اس کے باپ کو بندر اور بدر پسران طلال نے جان سے مار دیا تھا۔ ان دونوں لڑکوں کو ان کے چچا محمد نے مروا ڈالا۔ یہ محمد بعد میں بہت بارعب اور لائق امیر ثابت ہُوا۔ اس کو یقین تھا۔ کہ اگر وُہ اپنے بھتیجوں کو قتل نہیں کروائیگا۔ تو وہ اس کو قتل کر دیں گے۔

جیسا کہ شجرہ نسب میں بیان کیا گیا ہے۔ خاندان رشید کی دو شاخیں تھیں۔ آل عبداللہ برسر اقتدار تھے۔ اور آل عبید اپنے ہمجد بھائیوں کی حمایت میں عزت وآرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ عبدالعزیز ابن متعب نے چار لڑکے چھوڑے۔ جن کے نام متعب، مشعل، محمد اور سعود تھے۔ عبدالعزیز کے مرنے پر فیصل سلطان اور سعود پسران حامود آل عبید نے متوفی امیر کے گھرانے کو تباہ کر کے خود حکومت واقتدار حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ کیونکہ عبدالعزیز کے لڑکے ابھی کمسن اور ناتجربہ کار تھے۔ اسلئے اُن کو دھوکہ دیدینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ حامود کے بیٹے نے ان کمسن بچوں کو شکار کی دعوت دی۔ محافظین تو کافی تعداد میں ان امیرزادوں کیساتھ گئے لیکن انکا بیشتر حصہ حامود آل عبید کے تنخواہ یافتہ غیر جانبداروں کا تھا۔ جونہی کہ یہ جمعیت شہر سے باہر گئی۔ سعود، فیصل اور سلطان نے فرداً فرداً تینوں بچوں میں سے ایک ایک کو

گولی کا نشانہ بنا دیا۔ غضب ہے کہ باپ کا خاتمہ ایک مہلک غلطی پر ہو۔ اور اس کے تینوں بیٹوں کا ظلم اور سفاکی پر۔
اسکے بعد آل عبداللہ کی حکومت ختم ہوگئی اور ان کی جگہ آل حامود برسرِ اقتدار ہوئے۔ سلطان ابن حامود اپنے اجداد کی گدی پر بیٹھا۔ لیکن وُہ زیادہ عرصہ تک امارت سنبھال نہ سکا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کا بھائی سعود اس کی بجائے حائل کا امیر ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ سلطان نے سات ماہ کی نام نہاد حکومت کی تھی۔ کہ سعود نے اسے گلا گھونٹ کر مار دیا۔ اسی عرصہ میں عبدالعزیز ابن متعب کا چوتھا بیٹا سعود اپنے ماموں ابن سبحان کی ساتھ مدینہ طیبہ میں مقیم تھا۔ جب اُنہیں سلطان کی موت کا علم ہُوا۔ تو اُنہیں خیال پیدا ہُوا۔ کہ اب آل عبید میں خانہ جنگی شروع ہو گئی ہے۔ سعود کے واپس آنے کیلئے موزوں موقع ہے۔ سعود ابن حامود سریر آرائے سلطنت تھا۔ ابن سبحان کو کچھ جمعیت جمع کرنے کی فکر تھی۔ چنانچہ اسی سخت ویز میں پورے ایک برس کا عرصہ گذر گیا۔ آخر کار اُنہوں نے اچانک حملہ کر کے سعود کو ٹھکانے لگایا اور محل پر قبضہ کر لیا۔ جب سلطان امیر تھا۔ تو اُس نے اپنے بھائی فیصل کو جوف کا والی بنا کر بھیجا تھا۔ حائل میں یہ خانہ جنگیاں ہوتی رہیں۔ اور جوف میں فیصل اپنے استحقاق پر امیر بن گیا۔ وُہ اپنی حالت پر قانع اور مطمئن بیٹھا تھا۔ کہ اس کو سعود ابن حامود کے حشر کا علم ہُوا۔ وُہ اپنے مستقبل سے ڈر گیا۔ اور جان کے خوف سے جوف سے بھاگا۔ اور صحرا میں ادھر اُدھر دشت نوردی کرتا رہا۔ آخر ش فیصل ریاض پہنچا۔ اور سلطان ابن سعود کی ظلِ حمایت میں آرام و امن کی زندگی بسر کرنے لگا۔

سعود ابن عبدالعزیز ابن متعب آل عبداللہ آل رشید تقریباً دس برس حکومت کرتا رہا۔ اس کے عہد میں سلطنت کا قیام اسکی بیوی فاطمہ بنت سبحان کی فہم و فراست اور معاملہ فہمی پر مبنی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سعود کمزور طبیعت کا انسان تھا۔ اور غلاموں اور ملازموں کے زیر اثر رہتا تھا۔ اس زمانے میں ہی حائل پر بیرونی حملے شروع ہو چکے تھے۔ یہ حملہ آور سلطان ابن سعود کے اخوان تھے۔ سعود مدت تک سلطان ابن سعود سے برسرِ پیکار رہا۔ اور فاطمہ بنت سبحان امارت کو تھامتی رہی۔ سعود کبھی فتح پاتا اور کبھی شکست کھاتا۔ لیکن ان جنگوں میں اسکی موت واقع نہ ہوئی۔ مگر اچھا انجام اس کے مقدر میں بھی نہیں تھا۔ اس کے خاندان میں چوری سے چھپکر مار ڈالنے کا رواج تو ہو ہی چکا تھا۔ اس کے اپنے خاندان میں سے ایک شخص عبداللہ بن طلال تھا۔ جو امیر سعود سے بغض و عداوت رکھتا تھا۔ ایک دن امیر سعود کا دل تفریح کو چاہا۔ چند آدمیوں کو ساتھ لیکر نشانہ بازی کیلئے چلا۔ ان ساتھیوں میں عبداللہ بن طلال بھی تھا۔ ملازمین آگے سُلگا نے اور

چائے وغیرہ کا بندوبست کرنے لگ گئے۔ عبداللہ بن طلال اور امیر سعود نشانہ بازی کی مشق کرنے لگے۔ صرف ایک ملازم پاس کھڑا تھا۔ کہ عبداللہ کی نیت میں فتور آگیا۔ ملازم کی آنکھ بچا کر اس نے امیر کے سر میں گولی مار دی۔ امیر لڑکھڑا کر گرا۔ دوسری گولی عبداللہ نے اور داغ دی۔ امیر سرد ہوکر رہ گیا۔ ملازم حیران و ششدر کھڑا تھا۔ آقا کو بچا نہ سکا۔ فاصلے پر سے ایک اور غلام اس واقعہ کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو بلایا۔ ان کے ساتھ عبداللہ ابن متعب ابن عبدالعزیز امیر سعود کا بھتیجہ بھی تھا۔ عبداللہ ابن طلال اس لڑکے کو قتل کئے بغیر تخت پر نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اس لئے اُسے بھی مارنا چاہا۔ لیکن غلاموں نے بڑی جانفشانی سے بچے کی جان بچائی۔ اس کشمکش میں ایک غلام جان سے مارا گیا۔ اور کئی ایک زخمی ہوئے۔ ابن طلال بڑا نشانہ باز تھا۔ لیکن جونہی کہ وہ عبداللہ ابن متعب کے مارنے کو بندوق اُٹھاتا تا ایک غلام بیچ میں آکر سدِ راہ ہو جاتا کیونکہ غلاموں کی تعداد کافی تھی۔ اسلئے آخرکار جیت اُنہی کی ہوئی۔ اور عبداللہ ابن طلال گرفتار ہوکر مارا گیا۔ عبداللہ ابن متعب کی جان غلاموں کی بینظیر وفاداری اور نمکحلالی سے بچی۔

چنانچہ عبداللہ ابن متعب حائل کا امیر بنایا گیا۔ لیکن اب امارت حائل کیلئے اخوان کا مقابلہ مشکل تھا۔ خاندان آل رشید میں تفرقہ پڑا ہوا تھا۔ قبیلہ شمّار میں سے بھی کچھ لوگ ابن سعود اور وہابیت کے ہمخیال ہو چکے تھے۔ فاطمہ بنت سُبحان کی مساعی بھی امارت میں نظام قائم نہ کرسکیں تھیں۔ ابن سعود کے اخوان شدہ شدہ حائل کے جنوبی علاقوں پر قبضہ کر چکے تھے۔ عبداللہ ابن متعب میں مدافعت کی سکت نہ تھی۔ اس لئے آخرکار اس نے اپنے آپ کو سلطان کے رحم پر چھوڑ دیا۔ اور آج کے دن تک سلطان کے ہاں ریاض میں معزز مہمان کے طور پر قیام پذیر ہے۔ سرکاری وظیفہ ملتا ہے۔ سلطان کے ساتھ محل میں رہائش ہے خورد و نوش کا انتظام نہایت معقول ہے۔ شہر میں چلنے پھرنے کی عام اجازت ہے۔ وہ اپنی حالت پر ہر نوع قانع ہے جب عبداللہ ابن متعب اپنے آپ کو سلطان ابن سعود کے حوالہ کر چکا۔ تو عبداللہ ابن طلال کا ایک اور بھائی محمد ابن طلال سلطان کے خلاف کھڑا ہو گیا۔ اور حائل کو بچانا چاہا۔ تین ماہ تک بڑی شدومد سے مقابلہ کرتا رہا۔ وہ بڑی شجاعت سے لڑا۔ لیکن آخرکار مجبور ہوکر اُس نے بھی اپنے آپ کو سلطان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

تفہیم مطالب کیلئے اس خاندان کے فرمانرواؤں کا مختصر تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

۱۔ عبداللہ ابن علی ابن الرشید۔ بانیٔ خاندان۔ بڑا لائق فائق امیر تھا۔ طبعی موت مرا۔

۲۔ طلال اس کا بیٹا۔ مراق کا مریض تھا۔ خودکشی کر کے مرا۔ اکثر غمگین رہتا تھا۔

۳۔ متعب طلال کے بھائی کو اس کے بھتیجوں بندر اور بدر نے مار دیا۔

۴۔ بندر۔ اس کو محمد اس کے چچا نے مار دیا۔ محمد نے بدر اور اس کے چاروں بیٹوں کو بھی قتل کر دیا۔

۵۔ محمد اعظم۔ اس خاندان میں سب سے سربرآوردہ امیر تھا۔ بڑی شان و سطوت سے حکومت کرتا تھا۔ لائق فائق تھا۔ اور بڑی خوبیوں کا انسان تھا۔ لا ولد تھا۔ طبعی موت مرا۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۹۷ء تک حکومت کرتا رہا۔

۶۔ عبدالعزیز ابن متعب ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۶ء تک حکمران رہا۔ بڑا شجاع و غیور تھا۔ دشمن کی فوج میں غلطی سے چلا گیا۔ اور گولیوں کا نشانہ بنا۔ رعایا اس سے خوف کھاتی تھی۔ اور محبت بھی کرتی تھی۔

۷۔ سلطان ابن حامود جس نے عبدالعزیز کے تینوں بیٹوں کو قتل کیا۔ سات مہینے حکمرانی کر کے اپنے بھائی سعود کے ہاتھ سے گلا گھونٹ کر مارا گیا۔

۸۔ سعود ابن حامود۔ صرف چودہ مہینے حکمران رہا۔ سعود ابن عبدالعزیز نے اس کو مار دیا۔

۹۔ سعود ابن عبدالعزیز دس برس حکومت کرتا رہا۔ اپنی بیوی اور غلاموں کے زیر اثر تھا۔ ترکوں کا وفادار تھا۔ عبداللہ ابن طلال نے اس کو مار دیا۔

۱۰۔ عبداللہ ابن متعب ابن عبدالعزیز۔ حائل کے محاصرے میں اس نے اپنے آپ کو سلطان ابن سعود کے حوالے کر دیا۔

۱۱۔ محمد بن طلال۔ تین مہینے حائل کا امیر رہا۔ اور سلطان ابن سعود کی فوجوں کا بڑی شجاعت و بسالت سے مقابلہ کرتا رہا۔ آخر محاصرہ سے مجبور ہو کر ۲ نومبر ۱۹۲۱ء کو اس نے حائل سلطان ابن سعود کے حوالہ کر کے اپنے آپ کو سلطان کے رحم پر چھوڑ دیا۔

باب بست و یکم

سرحد بندی

ناظرین کو معلوم ہے۔ کہ کویت کی سکونت میں ابن سعود نے شیخ مبارک کی سیاسی زندگی کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ اور سیاست و تمدن کے ابتدائی اسباق اسی نامور مدبر کی شاگردی میں حاصل کئے تھے۔ اب وہ وقت آیا۔ کہ ابن سعود کو مغربی مدبرین سے ذہنی جنگ کرنی پڑی۔ حائل کی فتح سے پیشتر اسکی سرحدیں محض کویت جبل شمار اور حجاز سے ملحق تھیں۔ نہ عراق سے اتصال تھا۔ نہ ہی شام کے اُس حصّے سے جہاں ۱۹۲۱ء کے بعد شرق اردن کی امارت قائم کیگئی۔ حائل کی فتح سے پیشتر ہی کویت کے ساتھ ابن سعود کی سرحد کے متعلق جھڑپ ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں عراق سے بھی مُتعدد بھیڑ ہونے کا احتمال پیدا ہو گیا تھا۔ نجد کے اخوان ان ہر دو ریاستوں پر دھاوا بول چکے تھے۔

اس واقعہ کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے۔ کہ ناظرین کو اس وقت کی یاد دلائی جائے جبکہ ابن سعود ۱۹۱۳ء میں الحصا سے ترکوں کو نکال رہا تھا۔ اس وقت ترک اور انگریز کویت کے بارے میں سمجھوتہ کر رہے تھے اس تصفیہ کے مطابق کویت کی نیم آزاد ولایت نقشہ پر ستر میل قطر کے گول دائرہ کی صورت میں دکھائی گئی تھی۔ یہ علاقہ براہ راست شیخ کویت کے ماتحت سمجھا گیا۔ اس کے علاوہ شیخ کویت کا اثر جانب جنوب دو سو میل تک تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں جو معاہدہ ابن سعود کا انگریزوں کے ساتھ ہوا۔ اسکی رُو سے اس نے اقرار کیا۔ کہ عرب کی اُن ولائتوں میں جہاں انگریزوں کا سیاسی اثر قائم ہے۔ وہ مداخلت نہیں کریگا۔ کویت بحرین وغیرہ کے علاقے انگریزی حکومت کے ظلّ حمایت میں تھے۔ لیکن ان کی حدود اور سرحدیں متعیّن نہ ہوئی تھیں یہی وجہ تھی۔ کہ ایک عرصہ تک کویت اور نجد کے درمیان آئینی سرحد نہ تھی جب تک ان دو ہمسائیوں کے تعلقات دوستانہ اور مصالحانہ رہے سرحد کا معاملہ معرض بحث میں نہ آیا۔ چالبازی اور مکاری کے باوجود شیخ مبارک ابن سعود کا بہی خواہ تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کا لڑکا جابر بھی خیر خواہ رہا۔ لیکن جب سلیم الصباح کویت کا رئیس ہوا۔ تو اُس نے نہ صرف جنگ عظیم کے دوران میں ترک اور جرمن افواج کو رسد بہم پہنچا کر بہت سا

زر و مال جمع کر لیا۔ بلکہ نجد کی تجارت کو بھی کچل دینا چاہا۔ ابن سعود نے فیصلہ کر لیا۔ کہ ایک ہی معرکہ میں سرحد کا تصفیہ کر لیا جائے۔ وُہ نہ چاہتا تھا۔ کہ سلیم اپنے حلقۂ اثر کو استعمال میں لا کر اسکی رعیت کی تجارت کو تباہ و برباد کر دے۔ واقعہ یہ ہے کہ سلیم کو وہابیوں سے سخت نفرت تھی ۱۹۱۹ء میں جب سرحد کا معاملہ اُٹھا۔ تو سلیم ابن سعود سے بدسلوکی اور کج خُلقی سے پیش آیا۔ ستمبر ۱۹۱۹ء میں وہابیوں نے اپنے سب سے بڑے جنگجو امیر فیصل الدویش کو کویت پر حملہ آور ہونے کیلئے بھیجا۔ کویت والوں کو کسی نہ کسی طرح دشمن کی نقل و حرکت کا علم ہو گیا۔ اور تیاری کا موقعہ مل گیا۔ چنانچہ کویت سے جانب غرب تیس ۳۰ میل کے فاصلہ پر جبرہ نامی مقام پر اُنہوں نے اخوان کا مقابلہ کیا۔ اور اُنہیں شکست فاش دیدی۔ اس واقعہ کی وجہ سے کویت کے اردگرد فصیل تیار کر دی گئی کیونکہ گو کویت والوں نے وہابیوں کو ہزیمت دیدی لیکن اُن کی مراجعت سے اس قدر خائف تھے کہ اُنہوں نے تحفظ کیلئے جلدی جلدی شہر کے گرد مضبوط فصیل تیار کر لی۔ کویت کی یہ عظیم فصیل آج کے دن تک قائم ہے۔ اُونچائی ۱۰ فٹ اور چوڑائی $3\frac{1}{4}$ فٹ ہے۔ مورچے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن اسکی موجودگی کے باوجود کویت کی حفاظت کا حصر انگریزوں کے ہوائی بیڑہ متعینہ خلیج فارس پر ہے۔ جب کبھی کویت کو خطرہ پیدا ہُوا ہے۔ انگریزی ہوائی جہازوں نے مدافعت کی ہے۔

کویت والے فتح پانے کے باوجود وہابیوں سے اس قدر خائف ہوئے۔ کہ شیخ سلیم کو مجبوراً ابن سعود سے مصالحت کرنی پڑی۔ اس نے ایک مفصل معاہدہ کی پخت و پز کیلئے شیخ احمد الجابر اپنے بھتیجے کو ریاض بھیجا یہ ابھی ریاض میں ہی مقیم تھا۔ کہ ۲۷ فروری ۱۹۲۱ء کو شیخ سلیم مر گیا۔ اس اثنا میں شیخ احمد کے دوستانہ تعلقات ابن سعود کے ساتھ مستحکم ہو چکے تھے۔ جب وُہ ریاض سے واپس آیا۔ تو کویت کے اکابرین نے اُسے کویت کا امیر منتخب کیا۔ اُس وقت سے کویت کے تعلقات نجد سے مخالفانہ نہیں ہیں۔ سیاسی حلقوں میں خیال کیا جاتا ہے۔ کہ ان دونوں ریاستوں میں بظاہر چپقلش ہونے کا احتمال نہیں۔

جبرہ کے واقعہ کے بعد وہابیوں نے گرد و نواح کے علاقوں میں وسیع پیمانے پر ترکتازیاں شروع کر دیں۔ اور وسیع علاقے لُوٹ لئے۔ ان کارروائیوں سے ریاض۔ بغداد۔ عمان۔ اور کویت میں کھلبلی پڑ گئی یہ کہنا کہ ان کارروائیوں میں قصور کس فریق کا تھا۔ بہت مشکل ہے۔ سرحدیں باقاعدہ طور پر متعین نہ تھیں کبھی وہابی زیادتی کر بیٹھتے تھے۔ اور کبھی دُوسری ریاستوں کے باشندے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کہ لوٹ مار کا یہ سلسلہ کیونکر شروع ہوتا تھا۔ لیکن انصاف کے اقتضا سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ ہر معرکے میں وہابی جس قدر

تشدد اور سفاکی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ فریق بالمقابل میں اس قدر وحشیت اور بربریت نہیں تھی۔ اخوان نے بیکس چرواہوں اور بے بس صحرائیوں، بچوں اور عورتوں پر وہ وہ ظلم ڈھائے ہیں۔ کہ ان کی تلخ یاد ایک عرصہ تک قائم رہے گی

یہ واقعہ ثابت ہو چکا تھا۔ کہ قبائل محض تفریح کیلئے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اگر زمانہ سابق کی طرح سارا عرب ایک ہی طاقت کے ماتحت ہوتا تو اس قسم کے حالات ایک حد تک قابل برداشت ہوتے لیکن جنگ عظیم کے بعد عرب مختلف طاقتوں میں منقسم ہو گیا بعض چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں اسلئے اب سرحد بندی کا ہو جانا ضروری ہو گیا جب انگریزی حکومت نے ۱۹۲۰ء میں عراق فلسطین اور شرق یرون کی حمایت قبول کی۔ تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب ان ممالک کی حدود متعین کر دی جائیں تاکہ نت نئے تنازعے برپا نہ ہوں۔

پیشتر ازیں ذکر آچکا ہے۔ کہ ریاست حائل کے علاقہ جات جبل شمار وغیرہ ابھی وہابی سلطنت میں شامل نہ ہوئے تھے۔ کہ وہابی قبائل نے اردگرد کے علاقوں کی تاخت و تاراج شروع کر دی۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ ہے۔ کہ سنہ ۱۹۱۹ء میں قبیلہ شمار نے جو حائل اور عراق میں آزادانہ نقل و حرکت رکھتا تھا۔ وہابیوں پر حملہ کر دیا۔ لیکن جس وقت وہابیوں نے انتقام کے طور پر شمار پر حملہ کیا۔ تو سلطنت عراق کا ایک قبیلہ دافر نامی بھی شمار کے ساتھ سکونت پذیر تھا۔ باہمی جنگ میں قبیلہ دافر کو بھی شدید نقصانات اٹھانے پڑے یہ واقعہ دسمبر ۱۹۱۹ء کا ہے۔ اس قسم کے واقعات سے عراق کو بھی نجد کے خلاف شکایت پیدا ہوئی۔ ابن سعود نے جو ہمیشہ سے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کا خواہاں رہا ہے۔ فروری سنہ ۱۹۲۰ء میں ایک وفد بغداد بھیجا۔ اس وفد میں احمد بن ٹھونیاں سرکردہ رکن تھا۔ یہ وہی شخص ہے۔ جو کہ سنہ ۱۹۱۹ء میں شہزادہ فیصل کے ساتھ مشیر قانونی کے طور پر یورپ کو گیا تھا۔ ڈاکٹر عبداللہ الداملوجی بھی وفد میں شامل تھا۔ یہ شخص موصل کا باشندہ عراق کی رعیت اور کچھ عرصہ سے ابن سعود کی ملازمت میں تھا۔ بعد ازاں سنہ ۱۹۲۸ء میں اپنی خدمت سے مستعفی ہو کر عراق کو واپس چلا گیا۔

نجدی وفد کی عراقی مدبروں سے گفت و شنید ہوئی۔ لیکن کوئی نتیجہ خیز فیصلہ نہ ہوا ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء میں خلیج فارس میں عقیر نامی مقام پر ابن سعود اور سر پرسی کاکس کی جو اس زمانے میں عراق میں ہائی کمشنر تھا۔ ملاقات ہوئی۔ فریقین تپاک سے ملے۔ لیکن سرحدی قبائل کے متعلق کوئی اطمینان بخش معاہدہ

نہ ہو سکا۔ سر پرسی کاکس نے انگریزوں کا نقطۂ نگاہ سمجھایا اور ابن سعود نے اپنی رضامندی اور رضا جوئی کا اظہار کر دیا لیکن حتمی فیصلہ نہ کیا۔

عرب میں شخصی حکومت کا رواج ہے۔ حکومت جداگانہ شعبہ جات پر منقسم نہیں ہوتی جسکا نتیجہ یہ ہے۔ کہ فرمانروا کا شخصی اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔

جس طرح پر سرحدی قبائل کی ہلچل عراق کے ہائی کمشنر اور ابن سعود کی ملاقات سے پیدا ہوئی اسی طرح پر حائل کی فتح سے نجد کے تعلقات عراق سے پیدا ہونے ناگزیر تھے بہرکیف شروع میں عراق اور نجد کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔

حائل کے زوال پذیر ہوتے ہی سرحد پر بدامنی کا دَور دورہ شروع ہوا۔ کویت۔ عراق اور نجد کے قبائل کھُل کھیلے۔ اور ایک دوسرے پر اندھا دھند حملے شروع کر دئے۔ ان کاروائیوں میں وہابی کسی سے کم نہیں رہے۔ بلکہ تشدّد اور ظلم میں تو ہمسایہ قبائل سے بھی بڑھ گئے۔

وہابیوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر قبیلہ شمّار نے عراق کی طرف ہجرت کر لی۔ یہ لوگ امارت انیزہ کی راہ سے عراق گئے کچھ لوگ تو راستے میں ہی رہ گئے لیکن کثیر تعداد نے رماری کے مقام پر دریائے فرات کو عبور کیا۔ اور شمّار جربہ کے ساتھ شامل ہو کر شمال مغربی عراق میں سکونت اختیار کر لی۔ امارت انیزہ ایک طاقتور قبیلہ ہے جس کا امیر اس وقت فہد بن ھدہل تھا۔ یہ بھی بغداد کی حکومت کے ماتحت تھا۔ اب قبیلہ شمّار سلطنت عراق کی رعیت ہو گیا اور ٹیکس ادا کرنے کا مستوجب ہوا چنانچہ راستے میں ہی ان لوگوں کو مویشیان کا ٹیکس ادا کرنا پڑا۔ ابن سعود ان لوگوں کو اپنی رعیت سمجھتا تھا۔ اور حکومت عراق سے انہیں واپس لینا چاہتا تھا۔ اب اہم سوال یہ تھا۔ کہ آیا حکومت عراق صحرا کی ضرب المثل فیّاضی سے کام لیکر قبیلہ شمّار کو اپنے ہاں پناہ دے یا ابن سعود فاتح حائل کے پاس لوٹا دے۔ فہد بن ھدہل ابن سعود سے دوستانہ عقیدت رکھتا تھا۔ اور اس سے وعدہ لے چکا تھا کہ اسکے علاقہ پر اخوان کبھی حملہ آور نہ ہونگے۔ اب اس واقعہ سے ان خوشگوار تعلقات میں فرق آیا۔ ماہ اپریل میں ابن سعود نے فہد ابن ھدہل کو ایک تہدیدی خط لکھا کہ وہ (ابن سعود) خود بھی قبیلہ انیزہ میں سے ہے۔ اور وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ قبیلہ شمّار پر اس کے سوا کوئی اور حکمرانی کرے۔ اس خط میں یہ بھی تحریر تھا۔ کہ اس قبیلہ کے لوگ اخوان پر حملہ آور ہو کر امارت انیزہ میں پناہ گزین ہوتے ہیں۔ عراق کے ہائی کمشنر کو بھی موقعہ کی نزاکت کا احساس تھا۔ ابن سعود انگریزوں

کی خوشنودی کا اس درجہ خواہاں تھا۔ کہ سالہائے ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء میں اُس نے سخدیوں کو حج کرنے سے منع کر دیا تاکہ ان انتہا پسند لوگوں کی آمد و رفت سے شریف اور اس کے درمیان تنازعہ کی گنجائش پیدا نہ ہو۔ اصل میں ابن سعود کی یہ پہلو تہی انگریزوں کی وجہ سے تھی کیونکہ وُہ خود شریف سے نہ خائف تھا اور نہ ہی وہ اس سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنا چاہتا تھا۔ ابن سعود نے شریف حسین کی خصومت کے باوجود تحریری اعلان کر دیا تھا۔ کہ اگر انگریزی حکومت عراق کی سلطنت شریف کے بیٹے فیصل کو بھی دینا چاہے تو اُسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس اعلان کا مقصد بھی انگریزوں سے دوستی کا اظہار تھا۔

انگریز افسران متعینہ عراق نے فیصلہ کیا۔ کہ ابن سعود ایسے وفادار دوست کی جائز شکائیت کو ضرور بالضرور رفع کر دینا چاہئے۔ چنانچہ سر پرسی کاکس نے احکام جاری کر دئے کہ قبیلہ شمّار کے مہاجرین امارت ویرہ کو خالی کر دیں۔ اور دریائے فرات کے مغرب کی جانب چلے جائیں۔ غرض یہ تھی۔ کہ صحرائے شامیہ کی نسبت جہاں یہ لوگ شروع میں اقامت گزین ہوئے تھے مغربی اضلاع میں ان کی نقل و حرکت کی نگرانی بآسانی ہو سکتی ہے۔ بعد ازاں ہائی کمشنر نے کویت کے انگریزی ایجنٹ کے نام ہدایات جاری کیں کہ وُہ ابن سعود کو برٹش حکومت کی طرف سے حائل کی کامیابی کے متعلق مبارکباد پیش کرے۔ اور مفتوحین کے ساتھ حُسنِ سلوک کے بارے میں خراجِ تحسین ادا کرے۔ اور ابن سعود کو دعوت دے کہ مستقبل قریب میں وُہ پادشاہِ عراق سے کہیں ملاقات کرے جسکے دوران میں سرحد کے تنازعہ مسائل کا تصفیہ ہو جائے۔

ابن سعود سر پرسی کاکس کے اوصاف کا تہہ دل سے مدّاح تھا۔ اور بارہا اعتراف بھی کر چکا تھا۔ کئی برس گذر جانے پر بھی ان کے مابین دوستی میں کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ لیکن سیاست اور تدبّر کے بارے میں اس نے شیخ مبارک والئے کویت کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔ وُہ باقاعدہ طور پر اپنی سلطنت کی شمالی حدود متعین نہ کرنا چاہتا تھا۔ وُہ جانتا تھا۔ کہ عراقی حکومت انگریزی طاقت کے بل بوتے پر زیادہ سے زیادہ مفاد اُٹھانے کی کوشش کریگی۔ اس غرض سے اس نے سر پرسی کاکس کے پیغام کے جواب میں خیال ظاہر کیا۔ کہ مناسب یہ ہوگا۔ کہ اوّلاً وُہ اصول وضع کر لئے جائیں جنکے ماتحت باہمی تصفیہ ہوگا۔ ہائی کمشنر نے امیر فیصل کے مشورہ سے اس تجویز کی معقولیت کو تسلیم کر لیا۔ اور لکھا۔ کہ قبائل متعلق امارت انیزہ اور دوافر کو عراق کی حدود اختیار میں سمجھا جاوے۔ اور سرحد کا مسئلہ رواج اور دستور کے مطابق طے کر لیا جائے۔ ابن سعود نے اس تجویز کو درست مان لیا۔

حدود کا مسئلہ ناظرین کیلئے بظاہر دلچسپی کا باعث نہ ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ بعد میں ابن سعود نے جو روش شریف حسین کے خاندان کے بارے میں اختیار کی۔ وہ اس تنازعہ کا براہ راست نتیجہ تھی۔ اب وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ سرحد کے متعلق عراق اور نجد دونوں کے دعاوی بعض غلط فہمیوں پر مبنی تھے۔ مثال کے طور پر قبیلہ انیزہ کا ہی واقعہ ہے۔ اس کا وہ حصہ جو فہد بن ھدبل کے ماتحت تھا۔ وہ براہِ راست انگریزوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا غربی حصہ جو رولا کے نام سے موسوم ہے۔ ابن سعود کی حکومت کو پسند کرتا تھا۔

ابن سعود خود قبیلہ انیزہ میں سے تھا۔ اور اس قبیلہ کی سب سے سر برآوردہ شخصیت ہونے کی وجہ سے اس کے امیر ہونے کا کامل استحقاق رکھتا تھا۔ لیکن انگریز اپنی ذاتی منفعت کے خیال سے فہد بن ھدبل کی خواہشات اور مطالبات کو ٹھکرانا نہ چاہتے تھے۔ اس وقت کے ساتھ ہی ایک اور پیچیدگی پیدا ہوئی۔ حمود ابن سویط قبیلہ دافر کا شیخ تھا۔ یہ قبیلہ عرصے سے نجد کی سرحد پر تاخت کرتا تھا کیونکہ عراقی حکومت اس کو اس کاروائی سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے حمود ابن سویط کا ماہانہ وظیفہ بند کر دیا دافر قبیلہ کی سکونت نجد اور عراق کی شاہراہ پر واقعہ تھی۔ امیر فیصل والئے عراق نے اس علاقہ میں امن و امان قائم کرنے کی خاطر شتر سواروں کا ایک دستہ متعین کیا۔ اور یوسف بیگ السعدون کو اس کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا۔ یوسف بیگ کی حمود ابن سویط سے سخت عداوت تھی۔ جونہی کہ موخر الذکر کو اس نامزدگی کا علم ہوا وہ ذاتی تحفظ کیلئے ریاض جا پہنچا۔ حکومت عراق نے کوشش کی۔ کہ راستے میں ہی اُسے روک لیا جاوے۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ابن سعود اس کے ورود سے خوش ہوا۔ اور اطاعت کے عوض میں قیمتی تحائف عطا کئے۔ ابن معمر نامی ایک نمائندہ کو ساتھ کیا۔ کہ قبیلہ دافر سے ابن سعود کے لئے خراج جمع کرے۔

عراق کیلئے دافر کی علیحدگی نہائت اہم تھی۔ جس طرح پر ۱۹۱۹ء میں خرما کے فتح ہو جانے پر حجاز کی کلید ابن سعود کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ اسی طرح دافر کے ہاتھ آجانے سے عراق کے دروازے اُس کیلئے کھل گئے عراقی قبائل خوفزدہ تھے۔ کہ وہابی ضرور بالضرور عراق پر حملہ کرینگے۔ جب فروری ۱۹۲۲ء میں اخوان کثیر تعداد میں صفر کے مقام پر جمع ہوئے۔ تو عراقی قبائل حفاظت کے خیال سے بصرہ۔ نصاریہ ریلوے کے قریب تک ہٹ گئے۔ توقع کے مطابق حملہ واقعی ہوا۔ ۱۱ مارچ ۱۹۲۲ء کو فیصل الدویش نے جو کہ پہلے ہی غارتگری میں بیحد مشہور و معروف تھا۔ ابو غر نامی مقام کو جہاں شتر سواروں کی ایک جماعت عراقی

حکومت کی طرف سے متعین تھی۔ لُوٹ لیا۔ یہ شخص لوٹ مار کرتا ہُوا شقرہ کے مقام تک بڑھتا گیا۔ اور منطفق قبیلے کے بہت سے مرد و زن تہہ تیغ کر دئے۔ اخوان رفتہ رفتہ عراق کے آباد اضلاع کے قریب تک پہنچ گئے اگر بر وقت روک تھام نہ ہوتی۔ تو وہ عراق کے دولتمند شہروں کو لُوٹ لیتے۔ لیکن عراق کا ہائی کمشنر سر پرسی کاکس نجد کے ساتھ جنگ نہ کرنا چاہتا تھا۔ بعض مدبرین کا یہ خیال تھا۔ کہ فریقین کی بہبُودی اس میں ہے۔ کہ سرحد کے لوگوں کو بلا مزاحمت آپس میں لڑنے دیا جائے۔ لیکن ابن سعود اور سر پرسی کاکس دونوں اس خیال کے مخالف تھے۔ ہائی کمشنر نے ہوائی جہازوں کا ایک بیڑہ موقعہ کے معائنہ کے لئے بھجوا دیا۔ اخوان نے جہازوں پر گولیاں چلائیں۔ سر پرسی کاکس نے ابن سعود کو اس حرکت سے مطلع کیا اور پرزور احتجاج کیا۔ ابن سعود نے جواب دیا۔ کہ اُسے واقعی اس حرکت کا سخت افسوس ہے۔ اور اخوان کی موجُودہ نقل و حرکت اسکے علم و اجازت کے بغیر ہوئی ہے۔ اور یہ کہ وُہ مجرموں کو سخت سزائیں دیگا۔ چنانچہ فیصل الدویش کو اندرونِ عرب میں بُلا لیا گیا۔ اُس کا یہ بیان صحیح ہو یا غلط اتنا فائدہ ضرور ہُوا۔ کہ وُہ اب اس معاہدہ کی تکمیل کر سکتا تھا جسکی از حد خواہش سر پرسی کاکس کو تھی۔ شیخ ابن سویط عراقی حکومت کے حوالہ کر دیا گیا۔ اور سر پرسی کاکس نے اپنی تجاویز پیش کیں۔ اور لکھا کہ وُہ وہابی جو ایک خاص خطہ کے جانبِ شمال میں ہیں۔ وہاں سے ہٹ جائیں۔ ابن سعود نے انگریزی تجاویز کو تسلیم کر لیا۔ اور اپنے نمائندوں کو حکم دیا۔ کہ وُہ مصالحت کیلئے عراقی حکومت سے مفصل گفت و شنید کریں۔ چنانچہ ۵ مئی ۱۹۲۲ء کو معاہدہ محمرہ کو مکمل کر لیا گیا۔ عراقی حکومت کی طرف سے صبحی بیگ نشاط وزیر امور عامہ اور نجد کی طرف سے احمد ابن ثنونیان نے معاہدہ پر دستخط ثبت کئے۔ اس معاہدہ میں سرحد بندی کی پُوری کوشش کیگئی تھی۔ اس میں معاہدہ کرنے والوں نے طے کر لیا۔ کہ کون کون سے قبائل کس ریاست کی رعیت ہیں۔ اسکی ضرورت اس لئے تھی۔ کہ بہت سی قبائل کے متعلق فریقین میں آپس میں تنازعہ تھا۔ جونہی کہ یہ امر طے ہو گیا۔ کہ کونسے قبائل عراق کی رعیت ہیں۔ اور کونسے نجد کی۔ یہ فیصلہ کرنا کہ کون کون سا علاقہ کس کے ماتحت ہے۔ مشکل نہ رہا۔ اس معاہدہ کی رُو سے منطفق۔ دافر اور امارت انیزہ عراق کی رعیت قرار پائے۔

کچھ عرصے کے بعد ابن سعود نے اس معاہدہ کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور وجوہات یہ بیان کیں۔ کہ اس کی رُو سے عراق کو بہت مفاد پہنچا ہے۔ اور مقابلہ میں نجد کو سراسر نقصان اور نجد

کے قبائل کے چراگاہوں کے حقوق جوکہ انہیں صدیوں سے حاصل تھے پس پشت ڈال دئے گئے ہیں۔ باوجودیکہ ابن سعود نے بعد میں اس معاہدہ کو مسترد کر دیا۔ لیکن عراق اور نجد کے سیاسی تعلقات کی تاریخ میں یہ ایک اہم دستاویز ہے جس کا مختصر بیان ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ضمن اوّل یہ تھا۔ کہ منطفق دافر اور امارت انیزہ عراق کی رعیت ہیں۔ اور شمار کا وہ حصہ جو زمانہ سابق میں ریاست حائل میں شامل تھا۔ نجد کے ماتحت ہے۔ یہ بھی طے پایا۔ کہ نجد اور عراق کا مشترکہ وفد سرحد کے چاہات اور اضلاع کا فیصلہ کرے۔ کہ وہ کس کس فریق کی ملکیت ہیں۔ اور دونوں ریاستوں کی حد بندی کرے۔

ضمن دوئم میں فریقین نے حتمی عہد کیا کہ وہ حرمین الشریفین کی شاہراہوں کو کھلا رکھینگے اور حجاج کی مکمل حفاظت کے ذمّہ وار ہونگے۔

ضمن سوئم میں فریقین نے اقرار کیا۔ کہ تجارت اور کاروبار کے معاملہ میں فریقین ایک دوسرے سے خالص دوستانہ سلوک روا رکھینگے۔ اور باہمی تجارت میں مزاحم نہ ہونگے۔

ضمن چہارم میں قرار پایا۔ کہ ان مسافروں یا حجاج سے جن کے پاس پروانہ راہداری موجود ہوگا کوئی فریق مزاحمت یا تعرض نہ کریگا۔

ضمن پنجم کی رُو سے فریقین نے یہ طے کیا۔ کہ اگر ایک ملک کا کوئی قبیلہ دوسرے ملک میں عارضی طور پر سکونت کریگا تو وہاں مویشی چرانے کا ٹیکس ادا کرنا پڑے گا۔

ضمن ششم میں قرار پایا۔ کہ اگر فریقین میں سے کسی کے تعلقات انگریزی حکومت کے ساتھ کشیدہ ہو جائیں۔ تو یہ معاہدہ کالعدم اور منسوخ سمجھا جائیگا۔

ناظرین نے آخری ضمن کے مطالعہ سے سمجھ لیا ہوگا۔ کہ یہ معاہدہ انگریزوں کی تحریک پر انگریزوں ہی کے فائدہ کیلئے ہُوا۔ بہرکیف سرحد کا اطمینان بخش تصفیہ ہو گیا۔ ایک مشترکہ کمیٹی نے دونوں ریاستوں کی سرحدیں قائم کر دیں۔ اسی سال کے دسمبر میں عقیر کے مقام پر سر پرسی کاکس اور ابن سعود کی پھر ملاقات ہوئی۔ اور دونوں نے سرحد کے تصفیہ کے متعلق اظہار پسندیدگی کیا۔ ابن سعود کی خوشنودی کے خیال سے معاہدہ میں تین مدّیں اور بڑھا دی گئیں۔ عراق کی جانب سے ایک علاقہ مشترکہ استعمال کیلئے چھوڑ دیا گیا نجدی قبائل کو حق دیدیا گیا۔ کہ وہ عراقی چاہات سے فائدہ اُٹھائیں۔ بشرطیکہ یہ چاہات ان کی اقامت گاہوں سے نجدی چاہات کے مقابلہ میں نزدیک تر ہوں۔ دونوں حکومتوں نے عہد کیا۔ کہ وہ نئے کنوئیں ان چاہات

کے قریب اپنی افواج کو جمع کرینگی، اور نہ ہی قلعے اور گڑھیاں بنائینگی۔ اس دستاویز کو معاہدہ عقیر کے نام سے منسوب کیا گیا۔ اس معاہدہ پر ابن سعود نے بہ نفس نفیس دستخط کئے جس سے مُراد یہ تھی کہ کم از کم شمال میں وہابیوں کی تاخت وتاراج تھم جائیگی۔

لیکن سلطان کا معاہدہ پر دستخط کر دینا اور ہے۔ اور صحرائی عرب کا اس معاہدہ کو سمجھ لینا علیحدہ بات ہے۔ جس وقت عقیر کا معاہدہ ہُوا۔ کویت اور نجد کے درمیان بھی ایک معاہدہ ہوگیا۔ اس سمجھوتہ کی رُو سے ان دونوں ریاستوں کی حد بندی ہوگئی۔ کویت اور نجد کے درمیان ایک مشترکہ علاقہ چھوڑ دیا گیا جسمیں فریقین کے مشترکہ حقوق تسلیم کرلئے گئے۔ اسی طرح پر کویت اور عراق میں ایک معاہدہ ہُوا جسکی رُو سے ان دونوں کی حدود کا تصفیہ ہو گیا۔ اس معاہدہ کی تصدیق اپریل ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ ان دونوں معاہدوں کی رُو سے وہ علاقہ جسمیں کویت کا اثر ونفوذ تسلیم کیا جا چکا تھا۔ واپس لیلیا گیا۔ اور معاوضہ میں اُسے ہرجانہ دلایا گیا۔ عملی فائدہ یہ ہُوا۔ کہ کویت کی حیثیت مبہم نہ رہی۔

نظریہ کے طور پر تینوں ریاستوں میں کامل تصفیہ ہوگیا۔ لیکن دقّت یہ تھی۔ کہ صحرا کی معاشرت اور کوائف ایسے ہیں۔ کہ کسی نظام کا دیر تک بدستور قائم رہنا محال ہے۔ معاہدہ کی پابندی سخت مشکل ہے۔ اگر متعلقہ حکومتیں معاہدہ پر عملدرآمد بھی کرنا چاہیں۔ تو نقل وحرکت کے ذرائع کے فقدان اور بُعدِ مسافت کی وجہ سے رعیت کی بخوبی روک تھام نہیں کرسکتیں چنانچہ اس بات کی تصدیق ۱۹۲۸ء میں ہوگئی جبکہ عراق اور نجد کی سرحد پر فتنہ وفساد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اور عراق کے شہروں میں وہابیوں کے جہاد کی خبریں گرم ہوئیں۔

بہرصُورت معاہدہ میں طے پایا تھا۔ کہ نجد کے اخوان عراق پر حملہ آور نہیں ہونگے۔ لیکن پھر بھی ۱۹۲۲ء سے لیکر آجتک عراقیوں کے خیالات نجد کے بارے میں دن بدن مخالفانہ ہی ہوتے چلے گئے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی۔ کہ عراق میں امیر فیصل شریف حسین کے خاندان کا ایک فرد سریر آرائے سلطنت تھا۔ شریف کے خاندان سے ابن سعود کی عداوت تو دیرینہ تھی۔ مگر شریف حسین کی تباہی اور حجاز کی فتح سے یہ مخاصمت اور بھی بڑھ گئی۔ دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ عراق کی آبادی کا بیشتر حصہ شیعہ مذہب رکھتا ہے نجدی تو حنفی سُنّیوں سے بھی مختلف الخیال ہیں۔ لیکن شیعہ مذہب سے ان کے اختلافات اور بھی شدید ہیں شیعہ آبادی وہابیوں کی پہلی یورش کے وقت سے لیکر اب تک وہابیوں سے خائف ہے۔ اور اُنہیں

بیحد نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے جبسوقت انگریزی مدبرین اور عراقی حکومت نے ابن سعود سے معاہدہ کرنا چاہا تھا۔ تو شیعہ اس تحریک کے بیحد مخالف تھے۔

لیکن عراق کی مخالفانہ رائے عامہ کے باوجود عراق اور نجد کے تعلقات بظاہر اطمینان بخش رہے اُس زمانے میں خبر مشہور ہوئی کہ ابن سعود نے شام کے فرانسیسیوں سے خفیہ معاہدہ کر لیا ہے۔ انگریزوں کو فکر لاحق ہوئی وہ سمجھتے تھے۔ کہ اگر کوئی معاہدہ ہوا ہے۔ تو لازمی طور پر ان کے مفاد کے خلاف ہوگا۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے اگست ۱۹۲۳ء میں ابن سعود نے عراق کے ہائی کمشنر کے نام ایک مراسلہ بھیجا جس میں سرکاری طور پر اس افواہ کی باضابطہ تردید کی۔ ابن سعود نے اس تحریر میں درخواست کی۔ کہ ہائی کمشنر حضور ملک معظم پادشاہ جارج کو اس کے (ابن سعود) اخلاص اور مصادقت کا یقین کروائے

باب بست و دوئم

جنگ کے خطرات

شاید ناظرین خیال کرتے ہوں۔ کہ جب ۱۹۲۱ء میں ابن سعود کی قسمت اس قدر یاور تھی۔ کہ حائل کی باعظمت ریاست اسکی سطوت کے سامنے ریت کے تودہ کی طرح بہہ گئی۔ تو اُس ملک کے دیگر قبائل نے بھی اطاعت اختیار کر لی ہوگی۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہوا۔ بدویوں میں متمدن ممالک کی طرح حکومت سے کوئی وابستگی نہیں ہوتی۔ جسکی لاٹھی اُسی کی بھینس کا قانون ہے۔ امیر جسوقت تک طاقتور ہے۔ سب فرمانبرداری کا دم بھرتے ہیں۔ لیکن جونہی کہ وہ کمزور ہوا۔ سب نے اطاعت کا جوا اُتار پھینکا۔

یہ صحیح ہے کہ حائل کی تسخیر میں امیر ابن سعود کو خاص دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ انگریزی حکومت نے اُنہی دنوں شرق بردن میں امیر عبداللہ کیلئے ایک امارت قائم کی تھی۔ یہ شخص ۱۹۲۰ء میں عراق کا بادشاہ بن گیا تھا۔ لیکن اگلے سال یہ تخت امیر فیصل اُس کے چھوٹے بھائی کو دیدیا گیا۔ فیصل شام کا بادشاہ ہوا تھا۔ لیکن فرانسیسیوں نے اسکی افواج کو خان مسیلون کے مقام پر جولائی ۱۹۲۰ء میں

شکست دیکر اُسے مُلک سے باہر نکال دیا۔ آخرکار اتحادیوں نے فیصلہ کیا کہ شرق یردن کے سوا شام کا ملک فرانسیسیوں کو دیدیا جائے۔ اور شرق یردن میں شریف حُسین کے بڑے بیٹے عبداللہ کے ماتحت ایک امارت قائم کر دی جائے چنانچہ فروری ۱۹۲۱ء میں انگریزوں کے ماتحت یہ ریاست قائم ہو گئی نجد سے جو شاہراہیں شام کو جاتی تھیں ان پر ابن سعود کی بھی نظر تھی۔ اس علاقہ کے بیشتر حصہ پر رولا قبیلے کے شیخ نوری شعلان کا قبضہ تھا۔ جوف اور وادی سرحان کا علاقہ بھی اسی کے پاس تھا۔ پہلے بھی یہ علاقہ جات اس کے پاس رہ چکے تھے۔ پھر حائل کی ریاست کا اقتدار قائم ہو گیا۔ آل رشید کے زوال کے بعد نوری شعلان نے پھر اُن علاقوں پر قبضہ کر لیا لیکن وہابی عقائد کی ترویج و اشاعت برابر جاری تھی۔ اور ابن سعود اُن علاقوں کو بھی مفتوحہ ریاست کا جزو لاینفک سمجھتا تھا۔ نوری شعلان بوڑھا ہو چکا تھا۔ اب زندگی کی کوئی ہوس باقی نہ تھی۔ اُس نے فرانسیسیوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اور انگریزوں سے گفت و شنید جاری تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء کی بہار میں شرق یردن کی حکومت کا ایک وفد جس میں انگریزی نمائندہ مسٹر جان فلبی بھی شامل تھا۔ نوری شعلان کے پاس پہنچا تھا۔

ناظرین کو معلوم ہے۔ کہ مسٹر فلبی ۱۹۱۷ء و ۱۹۱۸ء میں ریاض میں انگریزی نمائندہ رہ چکا تھا۔ اور ۱۹۱۹ء میں فیصل ابن سعود کے ساتھ لنڈن بھی گیا تھا۔ نوری شعلان بلا پس و پیش اپنے علاقہ جات شرق یردن کے حوالے کرنے پر رضامند ہو گیا لیکن ابن سعود اس تجویز کو پسند نہیں کر سکتا تھا چنانچہ جوف کے خلاف اُس نے چھوٹی چھوٹی مہمیں بھیج دیں۔ اور نوری شعلان سے اطاعت قبول کر لینے کا مطالبہ کیا۔ سکاکا میں جو علاقہ جوف کا سب سے بڑا گاؤں ہے۔ بغاوت پھیلانے کا بندوبست کیا گیا۔ اور باغیوں کی امداد کیلئے ایک وہابی دستہ ابن سعود نے اپنے ہاں سے بھیج دیا۔ نوری شعلان کی طرف سے زیادہ مزاحمت نہ ہوئی۔ اور جولائی ۱۹۲۲ء میں جوف کا علاقہ ابن سعود کی براہ راست اطاعت میں آگیا۔ اب جوف کے اخوان ریاض سے سینکڑوں میل دور تھے۔ اور لوٹ کھسوٹ کے لالچ کو بآسانی نہ چھوڑ سکتے تھے۔ چنانچہ اگست ۱۹۲۲ء میں ایک ہزار آدمیوں کی جمعیت نے قصر الازرق پر چھاپا مارا۔ اور لوٹنے مارنے کے بعد یہ ہیبت ناک گروہ مغرب کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اور قبیلہ بنی سکر پر حملہ کر دیا۔ اس طرح یہ لوگ شرق یردن کی حدود میں داخل ہو گئے عمّان ریاست کے دارالسلطنت سے صرف پندرہ میل کے فاصلے پر طنیب نامی ایک گاؤں ہے جسکی آبادی صرف پینتیس ۳۵ نفوس پر مشتمل تھی۔ یہ سب کے سب تہہ تیغ کر دئے گئے۔

اخوان اسی طرح لُوٹ مار کر رہے تھے۔ کہ ایک ہوائی جہاز نے اُنکی نقل و حرکت کو دیکھ لیا۔ جہاز ران نے عمّان کی ہوائی جہازوں کے دفتر میں اطلاع کر دی۔ وہاں سے مدد پہنچی۔ ہوائی جہاز بھی تھے اور جنگی موٹریں بھی۔ بنی سکر نے بھی انگریزوں کی مدد کی۔ اس قدر گولہ برسا کہ ایک ہزار جوانوں میں سے صرف ایک نجدی زندہ بچا۔ یُوں کہنا چاہیئے۔ کہ وہابیوں کو پہلی مرتبہ ہوائی جہاز کی طاقت کا ذاتی تجربہ ہُوا۔ اس سے پیشتر وہابیوں کو ہوائی جہاز کی ہولناکی اور تباہ کاری کا علم نہ تھا۔ ناظرین اندازہ کریں۔ کہ ہوائی جہاز کے مقابلے میں اُونٹ کی سواری کیا چیز ہے۔ اور جب بروقت اطلاع ہو جائے۔ تو ہوائی جہازوں کی نقل و حرکت کس قدر سہل ہوتی ہے۔

جب ابن سعود کو اس واقعہ کی اطلاع ملی۔ تو اُس نے اسکی ذمّہ داری لینے سے انکار کیا۔ اور کہا کہ یہ معاملہ اس کے علم اور اجازت کے بغیر رُونما ہُوا ہے۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ لیکن ابن سعود پر اس واقعہ نے بہت گہرا اثر پیدا کیا۔ اسے معلوم ہُوا۔ کہ جدید اسلحہ کے بغیر اسکی پوزیشن بہت کمزور ہے۔ اور ہمسایوں کی طاقت کے مقابلے میں اس کے اخوان کی جرأت و ایثار اور شجاعت و بسالت ہیچ ہے۔

اس میں شک نہیں۔ کہ ابن سعود شریف حُسین کے دونوں بیٹوں عبداللہ اور فیصل سے ناراض تھا۔ وُہ بھی اُسے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ شریف حُسین کی روایتی دشمنی پیش نظر رہتی تھی۔ ہر وقت فریقین ایک دوسرے سے کھٹکے رہتے تھے۔ ایک دوسرے سے شکایات دن بدن بڑھ رہی تھیں۔ محمّرہ اور عقیر کے معاہدات کے باوجود وہابی ایسے قبائل سے محاصل وصُول کر لیتے تھے۔ جو مسلّمہ طور پر عراق کی رعیت تھی۔ لیکن عراق کی حکومت بھی قبیلہ ہائے شمار کے پناہ گزینوں کو اخوان پر حملہ آور ہونے سے نہیں روکتی تھی۔ ایک حد تک فریقین ہی اس صُورتِ حالات کے لئے ذمّہ دار تھے۔ بہر کیف حالت ناخوشگوار تھی ۱۹۲۳ء کے اوائل میں ابن سعود سخت بیمار ہو گیا۔ یہانتک کہ اسکی موت کی افواہ مشہور ہو گئی اسکا نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک تو اس کا ذاتی اقتدار قبائل پر کم ہو گیا۔ دوسرے اندرُون عرب کے بدوؤں میں شورش اور ہیجان بڑھ گیا۔ جون ۱۹۲۳ء میں شمّار کے بعض قبائل نے نجدی رعیت پر چھاپے مارے۔ ابن سعود ان شمّاریوں کو بھی اپنی رعیت سمجھتا تھا۔ اس لئے اُس نے حکومت عراق کے پاس زبردست احتجاج کیا۔ لیکن دادرسی نہ ہوئی۔ اس مخمصہ میں شریف حُسین بھی آ دھمکا۔ اُس نے تجویز پیش کی۔ کہ مسئلہ شمّار کا بہترین حل یہ ہے۔ کہ ابن سعود جبل الشمّار کے علاقوں کو خالی کر دے۔ ظاہر ہے کہ تجویز نامعقول تھی۔ اور شریف حُسین کے فقدانِ تدبّر کی نمایاں مثال۔ فاتح کیلئے مفتوحہ علاقوں کو

چھوڑ دینا آسان نہیں ہوتا۔ وہابیوں کو اس نامعقولیت سے اور بھی اشتعال پیدا ہُوا۔

اس قسم کے حالات کو دیکھکر عراق کے ہائی کمشنر سر پرسی کاکس نے سلطان نجد اور شاہ عراق امیر فیصل کی باہمی ملاقات کی تجویز کی۔ لیکن فریقین ملاقات کے بارے میں مستعد نہ تھے۔ چند ماہ بعد موسم خزاں میں پھر ایک کانفرنس کی تجویز ہوئی۔ اس دفعہ نجد اور عراق کے علاوہ حجاز اور شرق یردن کو بھی مدعو کرنا مقصود تھا۔ ۷ر دسمبر کو کویت میں کانفرنس ہوئی۔ خلیج فارس کا برٹش ریذیڈنٹ صدر مقرر ہُوا۔ سلطان ابن سعود خود نہ آیا۔ بلکہ اپنے ایک نمائندہ کو بھیجا۔ اس طرح پر امیر فیصل نے بھی اپنی بجائے ایک نمائندہ کو بھیجدیا۔ شریف حُسین نے کہا۔ کہ جب تک ابن سعود خرمًا اور حائل سے دست بردار نہ ہوگا۔ وُہ کانفرنس میں شرکت نہ کریگا۔ آخر کار شریف حسین نے اپنے بیٹے زید کے بھیجنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ لیکن اُسے نمائندگی کے اختیارات عطا نہ کئے۔ امیر عبداللہ اس بارے میں اپنے باپ کی متابعت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن انگریزی مشورہ کے سامنے خود سری کی جرأت کہاں سے لاتا۔ مجبورًا عمان سے ایک وفد بھیجدیا۔

کانفرنس باوجود کوشش کے کامیاب نہ ہوسکی۔ دو دفعہ اس کے اجلاس برخاست کئے گئے۔ پہلی دفعہ ۲۷ر دسمبر ۱۹۲۳ئہ میں اور دوسری مرتبہ ۲۶ جنوری ۱۹۲۴ئہ کو۔ عراق اور نجد کے نمائندوں میں آخیر تک اختلافات قائم رہے۔ عراقی حجاز کے معاملات کا تصفیہ بھی چاہتے تھے۔ لیکن حجاز کا کوئی نمائندہ موجود نہ تھا۔ نجدیوں نے سرحدات کے مسائل کے تصفیہ کیلئے مشترکہ عدالت کے قیام سے انکار کردیا وادیٔ سرحان کے متعلق یردنی نمائندوں کا نجدیوں سے اتفاق رائے نہ ہوسکا۔

عام طور پر توقع یہی تھی۔ کہ کانفرنس لامحالہ ناکام رہیگی۔ لیکن پھر بھی قطعی ناکامی کا باعث یہ ہُوا۔ کہ فیصل الدویش نے ۱۴ر مارچ ۱۹۲۴ئہ کو قبیلہ مطیر کے دو ہزار نوجوانوں کو ساتھ لیکر عراق کے سرحدی علاقوں پر دھاوا کردیا۔ یہ مہم المکھر کے مقام پر تیار ہوئی تھی۔ جو کہ معاہدہ محمّرہ کے مطابق سرزمین بے آئین میں واقعہ ہے۔ اس دھاوے میں عراقی رعیت کی ۱۸۶ جانوں کا نقصان ہُوا۔ اور اخوان نے ۲۶۰۰۰ ہزار بھیڑیں اور تین ہزار سات سو گدھے عراقیوں سے چھین لئے۔ عراق میں غم و غصہ کی لہر اُٹھی۔ اور ابن سعود کو اس حرکت کیلئے ذمّہ وار ٹھیرایا۔

اس اشتعال انگیز حرکت کے بعد عراقی اور نجدی نمائندوں میں گفت و شنید کے تعلقات منقطع ہوگئے۔ چنانچہ ۳ر اپریل ۱۹۲۴ئہ کو کانفرنس ختم کردیگئی۔

فیصل الدویش نے تنبیہ و سرزنش کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اور ۳۱ مئی ۱۹۲۴ء کو ایک دھاوا اور کر دیا۔ تینوں ریاستوں کے نمائندے منتشر ہوگئے۔ لیکن اپنے مخالفین کے خلاف معاندانہ جذبات لیکر گئے۔ اس طرح پر مصالحت و مفاہمت کی راہیں بند ہوگئیں۔

اس وقت شریف حسین کو جو گرانقدر وظیفہ انگریز دیتے تھے۔ وہ بند کر دیا گیا۔ جب اس کو استحکام حیثیت کیلئے براہ راست انگریزی معاونت کی کوئی امید نہ رہی۔ تو ایک عجیب و غریب چال چلا اس زمانے میں ترکوں نے اپنے ہاں سے خلافت کو موقوف کر دیا تھا۔ شریف حسین نے چاہا۔ کہ خلیفۃ المسلمین بنکر مسلمانوں میں روحانی اقتدار پیدا کرلے۔ یہ سب سے بڑی حماقت تھی۔ جو اس سے سرزد ہوئی۔ کیونکہ حجاز میں انگریزوں کا جو عمل دخل اسکی وساطت سے ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے مسلمان اس سے بیحد ناراض تھے۔ اور اسکی کسی روحانی یا دنیاوی حیثیت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔

باب بست و سوم

نجدی معاشرت اور طرز حکومت

یورپ کے علوم و فنون کی ترویج اور مغربی تمدن کے اثر کی وجہ سے مشرقی ممالک کی معاشرت بہت کچھ بدل گئی ہے۔ اکثر مغربی چیزوں کا رواج ہوگیا ہے۔ جو کہ ایک صدی پہلے کبھی سنی بھی نہ گئیں تھیں لیکن پھر بھی موجودہ نجد کے باشندوں کی طرز معیشت تقریباً وہی ہے۔ جو کہ صدیوں پیشتر تھی۔

نجد کے بعض حصے زرخیز اور قابل زراعت ہیں۔ لیکن ملک کا بیشتر حصہ بے آب و گیاہ ہے۔ سینکڑوں کوس تک درخت گھاس۔ پانی اور جاندار مخلوق نظر نہیں آتی۔ البتہ کبھی کبھی اونٹوں کے قافلے چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ اب کبھی کبھی کوئی موٹر بھی نظر آجاتی ہے۔ پہلے اس ملک کے راستے نہایت خطرناک تھے۔ کافی قوت کے بغیر کسی مسافر کا جان و مال محفوظ نہ تھا۔ مگر اب بالکل امن و امان ہے۔ نجدی ابھی تک بہت غریب ہیں۔ اس لئے نقل و حرکت اور باربرداری کا عام ذریعہ اونٹ ہے

نجد کے بڑے بڑے شہروں میں تو ضرورت کی اشیاء دستیاب ہو جاتی ہیں۔ لیکن صحرا کی زندگی بیحد سادہ ہے۔ صحرائی لوگوں کی گذران اوقات کا ذریعہ گیہوں اور غلے کی زراعت نخلستان اور اونٹوں اور مویشیوں کی پرورش ہے۔ بعض مقامات پر نمک بھی بنتا ہے۔ اور صحرائی مسافروں کے ہاتھ فروخت ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ صحرائی شکار پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ شہری آبادی کا ذریعہ معاش زیادہ تر مقامی تجارت ہے۔ بڑی بڑی تجارتی کوٹھیاں نجد میں مفقود ہیں۔ شہروں میں بعض لوگ اونی کپڑا اور دباغت وغیرہ قسم کی قدیم دستکاریاں اور صنعتیں بھی کرتے ہیں۔

بدو اب تک اپنی فطری سادگی پر قائم ہیں۔ تاہم اُن کے اقوال اور حرکات و سکنات ان کی غیر معمولی ذہانت کا پتہ دیتے ہیں۔ نجدی بدو ستاروں کی رہنمائی میں صحرا کی عظیم مسافتیں طے کر لیتے ہیں آدھے دن کی مسافت پر سے آدمیوں کی باتوں کی آواز بھی سن لیتے ہیں۔ ان کی قوت سامعہ اور قوت باصرہ بہت ہی قوی ہے۔ صحرا کی پاک زندگی نے اُن کے قویٰ ذکی الحس اور مضبوط کر دئیے ہیں۔ یہ لوگ فضول گوئی سے پرہیز کرتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی طرح سے بسیار گوئی میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ اور نہ ہی اسے لطف صحبت کا ضروری حصہ سمجھتے ہیں۔ پورے نجد میں کوئی شخص خالص نجدی لباس کے سوا کوئی لباس نہیں پہنتا۔ داڑھی رکھنا ضروری ہے۔ نجدی سب کے سب چھوٹی سی داڑھی رکھتے ہیں۔ مسلمان مسافر کیلئے بھی ضروری ہے۔ کہ اگر اُس ملک میں سیاحت کرنا چاہے تو مقرہ درازی کی داڑھی رکھے۔ ورنہ باشندے نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

نجد کے باشندے غریب ہونے کے باوجود بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ مہمان کی خدمت و خاطر فرض سمجھتے ہیں۔ دلجوئی و دلدہی کا کوئی ممکن طریقہ فرو گذاشت نہیں کرتے۔ یہ لوگ خوب تندرست ہوتے ہیں۔ کوئی شخص بھی کمزور اور بہت دبلا نظر نہیں آتا۔ اس ملک میں معمولی بیماریاں بہت کم ہوتی ہیں۔ پورے ملک میں کوئی ہسپتال نہیں۔ ریاض کے سوا ڈاکٹر بھی نہیں۔ کہیں کہیں قدیم وضع کے نیم طبیب مل جاتے ہیں۔ لیکن دوائیں بہت دقت سے دستیاب ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اس ملک کے لوگوں کو دوائیوں کی ضرورت بھی نہیں۔ باشندے طبعی اور سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ملک کی گرم خشک آب و ہوا اور پُر مشقت زندگی نے انہیں مضبوط اور توانا بنا دیا ہے۔ زندگی کی کشمکش اسقدر سخت ہے۔ کہ ضعیف الجثہ آدمی اپنے وقت سے پیشتر ہی مر جاتا ہے۔

وہابی تحریک اور سلطان ابن سعود کی موجودہ تربیت نے اہل نجد کو نہائیت دیانتدار اور پرہیز گار بنا دیا ہے۔ ان میں دینی رُوح اچھی طرح سے سرائیت کر گئی ہے۔ وُہ ہمیشہ ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے ہیں اُن کی گفتگو کا اصلی موضوع عربوں کی شجاعت۔ سخاوت اور دینی فضائل و مکارم ہے۔ یہ لوگ شعر و شاعری کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ عربی شعر صحراہی کی پیداوار ہے۔ اہل نجد سیاسیات کے مغربی اور مروّجہ مفہوم کو نہیں سمجھتے۔ سیاسی اختلافات سے بھی گریز کرتے ہیں۔ موجودہ نجدی سمجھتے ہیں۔ کہ حکومت خدا کی ہے۔ اور پھر عبدالعزیز ابن سعود کی۔ خود ہر معاملے میں رائے زنی کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

نجد کے بڑے بڑے شہروں میں تہذیب و تمدن کے تمام آثار موجود ہیں۔ بکثرت بلند عمارتیں موجود ہیں۔ مگر سب قدیم طرز کی ہیں۔ شہروں کے گرد عظیم الشّان فصیل ہوتی ہے۔ مشرقی وضع کے پھاٹک لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ضرورت کے وقت مقفل کر دئے جاتے ہیں۔ بعض شہروں میں دینی مدارس بھی موجود ہیں۔ مگر ان کی حیثیت قدیم مسجدی مکتبوں سے زیادہ نہیں۔ ان میں بچّوں کو ضرورت بھر لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ نیز پورا قرآن بھی حفظ کرا دیتے ہیں۔ علوم دینیہ کی تکمیل میں لوگ اپنا زیادہ وقت صرف نہیں کرتے۔ بہت تھوڑے سے آدمی ایسا کرتے ہیں۔ باقی ضرورت بھر تعلیم حاصل کر کے دنیاوی کاروبار میں لگ جاتے ہیں۔ وُہ سمجھتے ہیں۔ کہ قرآنی احکام کی رُو سے ضروری نہیں۔ کہ عام لوگ علوم دینیہ کی تکمیل کریں۔ یہ کافی ہے۔ کہ ایک منتخب جماعت ان میں مشغول رہے۔ البتہ بریدہ نجد میں ایک شہر ہے۔ جہاں علم و فن کا چرچہ بہت زیادہ ہے۔ اور جہاں علم کی سطح بھی نسبتاً بلند ہے۔ سلطان ابن سعود کے عہد حکومت میں یہاں کے اکثر تعلیم یافتہ ممتاز عہدوں پر سرفراز ہیں۔

نجد کی مسجدیں زینت و آرائش سے خالی ہوتی ہیں۔ فرش بھی نہیں ہوتا۔ گنبد بھی نہیں۔ بعض مسجدوں میں چھت تک نہیں ہوتی۔ مسجدوں میں روشنی بھی زیادہ نہیں کیجاتی۔ ایک دو شمعوں سے کام لیا جاتا ہے۔ جُمعہ کی نماز اُصول شریعت کے مطابق ایک آبادی میں ایک ہی مقام پر ہوتی ہے۔ خطبہ سُننے کا اہتمام اس قدر شدید ہے۔ کہ بعض لوگ صبح ہی سے آکر منبر کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ سلطان ابن سعود کے نئے قواعد کی رُو سے نماز فجر کے بعد روز صبح کو مؤذن نمازیوں کی حاضری لیتا ہے۔ پہلے دن کی بلا عذر شرعی غیر حاضری پر ٹوپی چھین لیجاتی ہے۔ دوسرے دن کی غیر حاضری پر

جنبہ ضبط کر لیا جاتا ہے۔ اگر پھر تیسرے دن کی غیر حاضری بھی ہو۔ تو جسمانی سزا دی جاتی ہے۔

سنجدیوں کے مکانات میں بھی تزئین و آرائش نہیں ہوتی۔ قدیم عربی نمونے اور سادی وضع کے مکان بناتے ہیں۔ کھجور کے تنے کی چھت ڈالتے ہیں۔ جگہ کی قلت کیوجہ سے عمارت کو تین منزلہ چہار منزلہ بنا لیتے ہیں۔ اور لکڑی کے پلوں کے ذریعہ سے عمارتوں کو باہم گر پیوست کر لیتے ہیں۔ تصویریں بنانا شریعت اسلامیہ میں ممنوع ہے۔ سنجدی فوٹو کو بھی حرام سمجھتے ہیں۔ شاہی قصر کے سوا در و دیوار پر نقش و نگار بھی نہیں کرتے۔ متمول لوگ لکڑی پر سادہ سا کام کروا لیتے ہیں۔ بعض لوگ دیواروں میں ڈیڈو کا کام بھی بنواتے ہیں۔ میز کرسی استعمال نہیں کرتے۔ چارپائی پر نہیں سوتے۔ البتہ فرش کا بہت اہتمام ہو۔ امیر آدمی قیمتی قالین استعمال کرتے ہیں۔ عام آدمی اونٹ کے بال اور اون کے کمبل کا فرش کرتے ہیں۔ قدیم وہابی قہوہ کو ناجائز قرار دیتے تھے۔ لیکن اب قہوہ کا عام استعمال ہوتا ہے۔ مہمان کی آمد پر کئی کئی دور ہوتے ہیں۔ اس دوران میں بخور دانیاں پھرائی جاتی ہیں۔ جنمیں مشک و عنبر و عود وغیرہ سلگتا ہے۔

اہل سنجد شریعت اسلامیہ کے احکام کے مطابق مسکرات کو قطعاً حرام جانتے ہیں۔ پورے سنجد میں ایک شخص بھی شراب نہیں پیتا۔ نہ کوئی شخص افیون وغیرہ دیگر نشہ آور اشیاء استعمال کرتا ہے۔ حقہ اور تمباکو تک ممنوع ہے۔ البتہ بریدہ کے متمدن شہر کے چند لوگ خفیہ طور پر سگرٹ پیتے ہیں۔ سنجد کے باشندے موسیقی کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ اسلئے گانے بجانے کے ساز و آلات سارے ملک میں کہیں دیکھے نہیں جاتی

احکام شریعت جرائم کی بیخ کنی کیلئے بہترین قانون ہیں۔ سنجد میں جرم کا ارتکاب بہت کم ہے۔ نئی تحریک نے لوگوں کو ظواہر شریعت کا سخت پابند کر دیا ہے۔ کوئی نہیں جو کھلم کھلا خلاف ورزی کی جرأت کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنجد میں ایسا سکون و وقار پایا جاتا ہے۔ جو اس وقت دنیا کی کسی مسلمان قوم میں نہیں۔

سنجدیوں کو مال و دولت سے محبت نہیں ہوتی۔ قیمتی چیز ہاتھ آجائے۔ تو قدر نہیں کرتے۔ روپیہ میسر ہو۔ تو جمع نہیں کرتے۔ معمولی سے معمولی چیزیں جلد جلد ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چلی جاتی ہیں۔ اسی قسم کی خرید و فروخت پر آبادی کے ایک حصہ کی گذران ہوتی ہے۔ یہ لوگ معمولی سی چیزیں اور متفرق اسباب بازاروں میں لئے پھرتے ہیں۔ لیکن شور و غل نہیں کرتے۔ بلکہ دوڑتے چلے جاتے ہیں۔ جسکو ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی چیز لے لیتا ہے۔ سنجدی خرید و فروخت میں بڑے دیانتدار

ہوتے ہیں۔ خرید و فروخت میں جھگڑا نہیں کرتے بہت متانت اور وقار سے گفتگو کرتے ہیں۔ خریدار سے
غلط بیانی کرنا یا اُسے دھوکہ دینا بھاری گناہ سمجھتے ہیں۔

نجد کے صحراؤں میں شُتر مُرغ۔ ہرن اور گورخر کا شکار بکثرت موجود ہے۔ شُتر مُرغ کا گوشت عرب
بہت پسند کرتے ہیں۔ بڑی بڑی دعوتوں میں یہ گوشت ضرور موجود ہوتا ہے۔ نجد کے لوگ ٹڈی کھانے کے بہت
دلدادہ ہیں۔ اسکی آمد کیلئے دعائیں مانگتے ہیں۔ اُسے بہت مُبارک سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ ٹڈی کو خشک کر کے
رکھ لیتے ہیں۔ خود بھی کھاتے ہیں اور دُور دراز ملکوں میں دوستوں کو قیمتی تحفے کے طور پر بھیجتے ہیں۔ شہری
آبادی کی اصل غذا جَو۔ چاول گیہوں اور کھجور ہے۔ چاول عام طور پر ہندوستان سے جاتا ہے گیہوں اور
جَو نجد میں بعض بعض مقامات پر پیدا ہوتے ہیں لیکن وہاں کی گیہوں گھٹیا قسم کی ہوتی ہے مُرغ اور بھیڑ
کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ نجد میں سبزیاں اور پھل عام طور پر نہیں ہوتے۔ اہل نجد ہاتھ سے کھانا کھاتے
ہیں۔ چُھری کانٹے کے استعمال کو ممنُوع سمجھتے ہیں چمچہ کا استعمال بھی مستحسن نہیں سمجھتے۔ نجدی کھانے
میں ہلدی ضرور ملاتے ہیں۔ اور بڑی مقدار میں۔ دُودھ اُن کے یہاں بہت افراط سے ہوتا ہے۔ نمک
ڈالکر کھویا بناتے ہیں۔ اور بہت رغبت سے کھاتے ہیں کچّی پیاز ہرگز نہیں کھاتے۔ اسے حرام قرار دیتے ہیں

تاریخ کا حساب سرکاری کاغذات اور تجارت میں سنہ ہجری سے ہوتا ہے۔ لیکن عام لوگ خصوصاً
صحرا کے باشندے قدیم عربوں کی طرح مشہور تاریخی واقعات سے حساب کرتے ہیں مثلاً فلاں واقعہ
سنہ حجاز کے ایک برس بعد ہُوا۔ عجیب بات یہ ہے۔ کہ یہ حساب ہمیشہ صحیح ہوتا ہے۔

نجد کی زبان مصر اور شام کی زبانوں سے بہت کچھ مختلف ہے۔ ان کا عربی لہجہ دوسرے ملکوں سے
نمایاں اختلاف رکھتا ہے۔ اتنا ضرور ہے۔ کہ نجد کی عربی اجنبی الفاظ سے ابھی تک مخلوط نہیں ہوئی۔

نجدیوں کی اُس نسل کا جسکی تربیت خود موجُودہ سلطان نے کی ہے۔ اور جنہیں اخوان کے نام سے
یاد کرتے ہیں۔ پُختہ ایمان ہے۔ کہ آدمی صرف اسلئے پیدا کیا گیا ہے۔ کہ اللہ کی عبادت کرے۔ اور اس کی
شریعت کی پابندی میں سرگرم رہے۔ ہر آدمی کی قسمت پہلے سے مقدّر ہو چکی ہے۔ موت کا جو وقت مقرّر
ہو چکا ہے۔ اس میں تقدیم و تاخیر ہرگز نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا انہیں چاہئیے۔ کہ موت سے بالکل بے خوف و
بے خطر ہو کر اللہ تعالےٰ کی رضا اور خوشنودی تلاش کریں۔ ہر آدمی کو اس کے عمل کی جزا و سزا ملیگی
نیکی کا ثواب حاصل ہوگا۔ بدی پر عذاب ملیگا یہی باعث ہے۔ کہ وہ ہر قسم کے گناہوں اور جرموں سے

احتراز واجتناب کرتے ہیں۔

جنگ کو وہ عظیم ترین عبادت سمجھتے ہیں۔ دینِ الٰہی کے دشمن کا قتل بہترین ثواب خیال کرتے ہیں۔ دین کی راہ میں خود قتل ہو جانا شہادت تصور کرتے ہیں۔ ان کا ایمان اس قدر پختہ ہے۔ کہ بڑے ہی شوق سے جنگ پر جاتے ہیں۔ ہر شخص اپنا کفن ساتھ لیجاتا ہے۔ بہت بے پرواہی سے اپنے تئیں موت کے حوالہ کر دیتے ہیں جب اُن کا کوئی ساتھی لڑائی میں مارا جاتا ہے۔ تو وہ بیک زبان اظہار حسرت کرتے ہیں کہ اُن کا دوست خُدا کی راہ میں سبقت لے گیا۔

وہ گولیوں کی باڑ کو ریح الجنّت کہتے ہیں۔ بہت شوق ورغبت سے سینے تانے دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ وہ اس موت کو موت نہیں زندگی خیال کرتے ہیں۔ اگر کسی آدمی کی پیٹھ پر گولی لگتی ہے۔ تو وہ بزدل خیال کرتے اور سخت نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ میدان سے بھاگنا اُن کے خیال میں ایسا ننگ ہے۔ کہ وہ ایسے شخص کو دفن تک نہیں کرتے۔ اُنکی ثابت قدمی اور بسالت حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ لوگ اُنکے نام ہی سے ڈر جاتے ہیں۔ ان کا رعب مُلک پر چھاچکا ہے۔

یہ لوگ سُنتِ نبوی کے اتباع میں بہت ہی سخت ہیں۔ اپنے مقتولوں اور مُردوں کا ماتم نہیں کرتے قبروں پر گنبد اور عمارتیں نہیں بناتے۔ اُن کا راسخ عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح موت کے بعد آدمی کی دُنیا کی دُنیاوی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس کا عمل بھی منقطع ہو جاتا ہے۔ وُہ خیال کرتے ہیں کہ مُردوں کو ہماری ظاہری تعظیم وتکریم کی ضرورت نہیں۔ وُہ ہم سے بے نیاز ہوگئے ہیں ہمیں اُن کیلئے دُعائے مغفرت کر دینی چاہئے اور بس۔

نجد کی حکومت قدیم وضع کی ہے۔ وہاں حکومت علیٰحدہ علیٰحدہ شعبوں پر منقسم نہیں ہے نہ مجلس حکومت ہے۔ نہ وزارت ہے۔ پُوری حکومت خود سلطان کی ذات ہے۔ اور اُسکا قانون کتاب وسُنت ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ کسی قسم کی بدنظمی پیدا ہو جائے۔ آمد وخرچ کے تمام حسابات مرتب ہوتے ہیں۔ خُود سلطان اُنکی نگرانی کرتا ہے۔ غبن مطلقاً نہیں ہو سکتا۔ حجاز میں یہ طریق حکومت موزوں نہ تھا۔ وہاں کی ضروریات اور تھیں۔ اور باشندے نسبتاً متمدن تھے۔ اس لئے سلطان نے وہاں دفتری حکومت کر دی۔ لیکن نجد کی حکومت بدستور سابق قدیم انداز کی رہی۔

نجد کی حکومت کے محاصل زکوٰۃ کے نام سے وصول کئے جاتے ہیں۔ زکوٰۃ کی مقدار شریعت حقہ نے متعین کی ہوئی ہے کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ حکومت کیلئے ممکن نہیں کہ کوئی نیا یا غیر شرعی محصول لگا سکے۔

باب بست و چہارم

شریف حسین کی بربادی

کویت کانفرنس سے پیشتر ہی شریف حسین انگریزی تدبر اور سیاست سے ناخوش تھا تعلقات دن بدن کشیدہ ہو رہے تھے ۱۹۱۶ء سے جبکہ اُس نے اپنے آقایانِ نعمت یعنی ترکوں کے خلاف بغاوت کی انگریز اسے دو لاکھ پونڈ ماہوار وظیفہ دے رہے تھے۔ اور فروری ۱۹۱۹ء تک برابر دیتے رہے بعد ازاں اس گرانقدر رقم میں تخفیف کر دی گئی۔ اور فروری ۱۹۲۰ء میں تو یہ ماہانہ وظیفہ بالکل بند ہو گیا۔ اس تخفیف کے زمانے میں بھی شریف کو برٹش حکومت کی طرف سے تقریباً بارہ لاکھ پونڈ موصول ہوئے۔ ناظرین کو معلوم ہے کہ اُسی زمانے میں عبدالعزیز ابن سعود کو بھی پانچ ہزار پونڈ ماہوار کا وظیفہ انگریزوں کی طرف سے ملتا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ شریف حسین کے لئے انگریزی احکام کی بجا آوری لازمی تھی لیکن ابن سعود کو بعض کام نہ کرنے کی ہدائیت ملی تھی۔ ایک زمانہ میں وُہ ہدائیت یہ تھی۔ کہ ابن رشید کے ساتھ دیرینہ سلسلہ جنگ و جدل بند نہ ہو۔ اور بعد میں یہ تھی۔ کہ ابن سعود بعض ریاستوں یعنی کویت۔ بحرین۔ حجاز اور شرق اردن وغیرہ پر جو انگریزوں کی ظلِ حمائیت میں تھیں۔ بلا واسطہ یا بالواسطہ حملہ نہ کرے۔ ابن سعود کا ماہانہ وظیفہ ۱۹۱۷ء سے شروع ہو کر مارچ ۱۹۲۱ء تک جاری رہا۔

شریف حسین کا وظیفہ بند ہونا تھا۔ کہ اسکی وجاہت اور وقار میں کمزوری شروع ہو گئی۔ اسکی اپنی طماع شخصیت بھی نمایاں ہو کر بدنامی کا باعث ہو چکی تھی۔ جنگ کے زمانے میں وُہ مختلف قبائل میں زر تقسیم کرتا رہتا تھا۔ تقسیمِ زر کا یہ طریقہ عرب کا قدیم رواج ہے۔ اور اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا جب یہ سلسلہ وظیفہ نہ ملنے کی وجہ سے ختم ہُوا۔ تو حرب اور عتیبہ وغیرہ مشہور قبائل کی اطاعت میں بھی فرق آ گیا۔ ان قبائل کی شورش نے ابن سعود کیلئے تسخیرِ مکہ کا کام بہت سہل کر دیا۔ حجاز پر حملہ کرنے کی اور بھی بہت سے وجوہات تھے۔ جو اپنے اپنے موقعہ پر بیان ہونگے۔

شریف حسین نے معاہدہ ورسیلز کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا تھا خصوصاً اسکی اس دفعہ کو جس میں سلطنت عثمانیہ کے بعض حصص کے متعلق [illegible] کا اُصول وضع کیا گیا تھا۔ اُس کا

خاص طور پر اختلاف تھا۔ کرنیل لارنس ۱۹۲۱ء میں جدّہ کے مقام پر اس کے ساتھ ترتیب معاہدہ کی غرض سے سیاسی گفت وشنید کر چکا تھا۔ شریف حسین کہتا تھا کہ شام اور فلسطین کی کامل آزادی کا انگریز حتمی وعدہ کر چکے ہیں۔ کرنیل لارنس کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ شریف کا نمائندہ ناجی الاصل ۱۹۲۳ء تک لنڈن میں گفت وشنید کرتا رہا۔ لیکن فلسطین کے بارے میں مفاہمت نہ ہو سکی۔ شریف حسین جب نمائندوں کی وساطت سے معاملات طے نہ کر سکا۔ تو اس نے براہ راست تصفیہ کرنا چاہا۔ اس غرض کیلئے وہ جنوری ۱۹۲۴ء میں شرق یردن کے دارالسلطنت عمان کو گیا۔ اسکے صاحبزادہ کلاں امیر عبداللہ کو بیرونی دنیا کے سیاسی معاملات سے بڑا شغف تھا۔ اُسے قبل از وقت معلوم تھا۔ کہ ترک قیام خلافت کو اپنے منافع کے خلاف سمجھتے ہیں اس کا یہ خیال صحیح ثابت ہؤا۔ کیونکہ مصطفےٰ کمال پاشا نے ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت کو موقوف کر دیا۔ عبداللہ نے خیال کیا کہ شریفی خاندان کے اقتدار کے بڑھانے کیلئے مناسب موقع ہے۔ اگر انگریز شریف کے مطالبات کو پورا نہیں کر سکتے تو نہ سہی۔ عالم اسلام میں اگر اثر و رسوخ پیدا کر لیا جائے تو لامحالہ انگریزوں کو ماننا پڑیگا۔ شریف حسین میں بظاہر تمام لوازمات موجود تھے۔ وہ یقیناً قریشی خاندان میں سے تھا۔ مستند اور مسلم الثبوت سیّد تھا۔ مقامات مقدسہ کا خادم تھا۔ اور حجاز کا بادشاہ بھی تھا۔ چنانچہ ان تمام امور کے متعلق امیر عبداللہ نے پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ حسین پہلے ہی خلافت حاصل کرنے پر تُلا ہؤا تھا۔ شرق یردن کی ایک خانہ ساز انجمن کی دعوت پر خلیفۃ المسلمین بننے کیلئے بطیب خاطر راضی ہو گیا۔ چنانچہ ۵ مارچ ۱۹۲۴ء کو امیر عبداللہ کی ریاست کے ایک گاؤں شفع میں حسین واقعی خلیفہ بن بیٹھا۔ اور عام اعلان کر دیا۔ شرق یردن تو اُسکے بیٹے عبداللہ کے اختیار میں ہی تھا۔ عراق پر بھی امیر فیصل برائے نام حکمران تھا۔ لیکن شام اور فلسطین نے بھی اس واقعہ کو دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا۔ مگر باقی اسلامی ممالک میں کسی کو خیال تک بھی پیدا نہ ہؤا۔ آواخر مارچ میں شریف حسین عمان سے مکہ معظمہ آیا۔ حج کے دن قریب تھے۔ یہ آخری حج تھا جو شریف حسین کے نصیب میں ہؤا۔

شریف حسین خلافت کی خصوصی ذمہ واری کے متعلق اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ مگر عبدالعزیز ابن سعود کو شریف کی اس کارروائی سے بیحد رنج ہؤا۔ وہ بھی اس بارے میں اپنی کچھ ذمہ واری سمجھتا تھا اُس نے حتمی ارادہ کر لیا۔ کہ کیونکہ شریف حسین کے غرور و خود پسندی کی انتہا ہو گئی ہے۔ اسلئے اب اُسے حجاز سے ملک بدر کر دینا ضروری ہے ۱۹۲۴ء کے موسم بہار میں ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ ابن سعود

بآسانی حجاز پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ برٹش گورنمنٹ اُسے جو ماہانہ وظیفہ دیتی تھی۔ وُہ خاص اس غرض کیلئے تھا۔ کہ ابن سعود حجاز پر حملہ آور نہ ہو۔ یہ وظیفہ اب بند ہو چکا تھا۔ اور ابن سعود کے احتراز اور اجتناب کی ذمہ داری بھی ختم ہو چکی تھی۔ نجد کے قبائل اور اخوان حملہ کیلئے مصر ہو رہے تھے۔ اب شریف حسین کے خلیفۃ المسلمین بن جانے پر اُنکے مذہبی احساسات کو اور بھی صدمہ ہوا۔ مادی اور سیاسی وجوہات کے علاوہ ابن سعود مذہبی نقطۂ نگاہ سے بھی حجاز پر حملہ کرنے کیلئے مجبور تھا۔ وُہ اور اہالیان نجد مذہبی خیال سے بھی شریف حسین کے نظم و نسق کے سخت خلاف تھے۔ وہابیوں کیلئے پچھلے تین برس سے حج بند تھا۔ شریف حسین کو اندیشہ تھا۔ کہ حج کے موقعہ پر غیر اسلامی شعائر دیکھکر نجدی بلوہ نہ کر دیں۔ مگر حج اسلام کا خاص رُکن ہے۔ اور اُسکی ممانعت آسانی سے برداشت نہیں کی جا سکتی۔ ۱۹۲۳ء میں جب چند نجدی احکام کے خلاف حج کیلئے چلے گئے۔ تو بلدالامین میں کشت و خون ہو چکا تھا۔ اس قسم کے واقعات سے اسلام کی سخت توہین ہوتی تھی۔ اور نجدی ایسے حالات میں صبر نہیں کر سکتے تھے۔

شریف حُسین کے خلیفۃ المسلمین بن جانے کے کچھ دن کم ۲ مہینے بعد ابن سعود نے ایک عام اعلان شائع کیا۔ جس میں شریف حُسین کے دعاوی کا دل کھول کر تمسخر اُڑایا۔ اور لکھا کہ حقیقی عرب ہم نجدی ہیں۔

اسکے بعد اُس نے ریاض میں مذہبی عُلما اور عسکری اکابرین کا ایک عظیم اجتماع کیا۔ فیصلہ طلب امر یہ تھا۔ کہ موجودہ حالات میں شریف حسین کے بارے میں کیا کیا جائے۔ ابن سعود کے والد عبدالرحمٰن اس کانفرنس کے صدر تھے۔ حج کی تکالیف اور دقتیں خاص طور پر زیر غور تھیں۔ اخوان عُمرہ کرنا چاہتے تھے اور یہاں تک کہہ بیٹھے تھے۔ کہ اگر ابن سعود اجازت نہ بھی دیگا۔ تو بھی وُہ حج کیلئے ضرور جائینگے۔ اور اگر شریف ممانعت کریگا۔ تو وُہ بزور شمشیر مکّہ معظّمہ میں داخل ہونگے۔ ابن سعود کی بے نظیر اوصاف اور بے مثال صلاحیتیں ایسے مواقع پر نمایاں ہوتی رہی ہیں۔ وُہ خُوب جانتا تھا۔ کہ اگر اخوان نے حج کے موقعہ پر حجاز پر حملہ کر دیا۔ تو تمام عالمِ اسلام میں وہابیوں کی سخت بدنامی ہوگی۔ اور حالات ایسے ہی ناقابل برداشت ہو جائینگے جیسا کہ مکہ مکرمہ کی پہلی فتح کے موقعہ پر ہو گئے تھے۔ چنانچہ اُس نے ایک مرتبہ اور حج کی اجازت دینے سے انکار کیا۔ اور کہا کہ اخوان کو تمام دُنیا کے مسلمانوں کے نمائندوں کی حیثیت سے حجاز کو فتح کرنا چاہئے یہ حکم سیاست اور تدبر پر مبنی تھا۔ جب بیرونی دُنیا کے مسلمانوں کو سلطان کے خیالات کا علم ہو گیا۔ تو

اُنہیں ایک گونہ اطمینان محسوس ہُوا۔ لوگ جانتے تھے کہ شریف حسین کے عہد میں حاجیوں کیلئے سلامتی اور امن نہیں ہے۔ اور مکّہ معظمہ کی آبادی کا چلن اسلام کے اخلاق کے خلاف ہے۔ ابن سعود نے آخر کار جب حجاز پر حملہ کیا۔ تو اُنہی دو باتوں پر خاص طور پر زور دیا۔ اس طرح پر حجاز کی فتح میں دو فوائد مضمر تھے ایک تو شریف حسین اور اسکے خاندان کا قلع قمع منظور تھا۔ دوسرے غیر اسلامی شعائر۔ اور بداخلاقی کی بیخ کنی مقصود تھی۔

موسم خزاں کے اوائل میں نجدی جنگ کیلئے تیار ہو چکے تھے۔ ابن سعود نے نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ تیاریاں کی تھیں اسکی افواج خرما اور طرابہ کے مقامات پر جمع ہوتی تھیں۔ جہاں سے کہ حجاز کے عین قلب پر حملہ ہو سکتا تھا۔ تین مختلف اطراف سے حملہ کرنے کی تجویز ہوئی تھی۔ ایک تو مدینہ منورہ کے شمال میں حجاز ریلوے پر۔ ایک شرق یردن کی طرف سے۔ اور دوسری عراق کی جانب سے۔ امدادی افواج وادی سرحان اور علاقہ جوف میں موجود تھیں۔ ان اطراف میں افواج بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ شریف حسین کو حجاز کی مدافعت کیلئے بیرونجات سے مدد نہ ملے

وہابیوں کیلئے امیر فیصل اور امیر عبداللہ کی متّصلہ ریاستوں کے خلاف کاروائیاں راس آئیں اُسی سال کے اگست میں اخوان نے الجوکھر کے مقام پر دو اخراونظق کے قبائل پر دھاوے کئے۔ اور دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں مزید حملے کئے۔ لیکن جنوری میں وہابیوں کی کاروائی کا علم رائل آیئر فورس کو ہو گیا۔ اور ہوائی جہازوں نے وہابیوں پر گولہ برسایا۔ اور تعاقب کرتے دُور تک نکل آئے۔ وہابیوں کا بہت نقصان ہُوا۔

اس طرح پر شرق یردن میں بھی ہوائی جہازوں نے اخوان کے خلاف سخت کاروائی کی۔ حجاز ریلوے کے زیزہ نامی اسٹیشن پر وہابیوں کی نقل و حرکت بعض چرواہوں نے دیکھ لی تھی۔ اُنہوں نے عمّان کو اطلاع بھیج دی۔ وہاں سے جلد از جلد کمک پہنچ گئی۔ وہابی کثیر نقصان اُٹھا کر پیچھے ہٹے۔

اخوان چالیس دن کا طویل سفر کرنیکے بعد شرق یردن کے علاقے میں صبح سویرے ہی پہنچ گئے تھے بہت سے یردنی ابھی بیدار بھی نہ ہوئے تھے کہ نجدیوں نے انکو تہہ تیغ کر دیا۔ لیکن ہوائی جہاز پہنچے۔ تو یہ شتر سوار کیا مقابلہ کر سکتے تھے پسپا ہوئے۔ اُوپر سے آگ برسنی شروع ہو گئی۔ چالیس میل تک جہازوں نے تعاقب کیا۔ کاف سے لیکر جوفنا تک نعشوں کی ایک لمبی قطار نظر آتی تھی۔

لیکن عراق اور شرق یردن میں وہابیوں نے جو کثیر نقصانات برداشت کئے۔ انکی تلافی حجاز میں بخوبی ہوگئی۔ عتیبہ کے طاقتور قبیلہ نے اپنے شیخ سلطان ابن بجاد کی جواب مشہور عام ہو چکا ہے۔ قیادت میں طائف فتح کر لیا۔ طائف کے فتح ہو جانے پر گویا حجاز کے دروازے وہابیوں کیلئے کھل گئے۔ طائف کی فتح بغیر جنگ کے حاصل ہوگئی۔ وہابیوں نے ۲۹ اگست کو حجاز کی سرحد پار کی اور طائف کے سامنے آ ڈٹے۔ طائف حجاز کا خوشگوار ترین مقام ہے۔ اور وہاں کے اُمرا موسم گرما یہیں بسر کرتے ہیں۔ یہاں شریف حسین کا بیٹا علی موجود تھا۔ کچھ فوج بھی متعین تھی لیکن اردگرد کے قبائل شریف حسین سے بہت زیادہ محبت نہ رکھتے تھے وہابیوں کی آمد آمد پر امیر علی فوج کا بیشتر حصہ لیکر طائف کی پہاڑیوں میں حدہ کے مقام پر طائف سے شمال مغرب کی جانب بیس میل کے فاصلے پر چلا گیا۔ شہر کی آبادی نہ تو فوج کو پسند کرتی تھی۔ اور نہ ہی انہوں نے امیر علی کے بھاگ جانے کو اچھا سمجھا۔ اس لئے انہوں نے امن کا سفید جھنڈا دیدیا۔ اور ۵ ستمبر کو شہر کے دروازے حملہ آوروں کیلئے کھول دئے۔ وہابیوں کو اس غیر متوقع کامیابی کی اُمید نہ تھی۔ جب وہابی شہر میں داخل ہوئے۔ تو ہراول کا افسر خرما کا شیخ خالد بن لوئی تھا حملہ آوروں کی جماعت میں ایک گولی اتفاقیہ غلطی سے لگ گئی۔ اس پر حملہ آوروں کا غیظ و غضب بھڑک اُٹھا۔ اور شہری آبادی کا قتل عام شروع ہو گیا۔ عورتیں اور بچے تک تہہ تیغ کر دئے گئے۔ شہر لوٹ لیا گیا۔ رات کے اندھیرے میں بھی یہ کشت و خون جاری رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایک پوری صدی گذر جانے پر بھی وہابیوں کی قساوت و بربریت بدستور سابق موجود ہے۔ دوسرے دن دوپہر کے بعد غطغط کے اخوان کا سردار اور قبیلہ عتیبہ کا شیخ سلطان ابن بجاد پہنچا۔ تو کشت و خون تھما۔ مقتولین کی تعداد کثیر تھی۔ مگر مورخین کا خیال ہے۔ کہ شریفی پروپیگنڈے نے بھی اس بارے میں بہت غلو کیا ہے۔ مسٹر جان فلبی صاحب طائف کے کشتگان کی تعداد تین سو بتاتے ہیں ظاہر ہے کہ جولناکی اور سفاکی کے اعتبار سے اتنے نہتے شہریوں کی موت کی تعداد بھی کم نہیں۔ وہابی حکومت کے ابتدائی مراحل میں یہ حادثہ فاجعہ نہایت افسوسناک ہے۔ لیکن ناظرین کو یاد رہے کہ اس خونی طوفان کی تمامتر ذمہ داری خالد ابن لوئی اور اسکے ساتھیوں پر ہے۔ عبدالعزیز ابن سعود اس سے بالکل بری الذمہ ہے۔ جب ابن سعود کو اس واقعہ کی اطلاع ملی۔ تو اس نے قیام امن کیلئے سخت تاکیدی احکام جاری کئے حکم ہوا۔ کہ مکہ معظمہ کے قرب و جوار میں ہرگز ہرگز خونریزی نہ ہونے پائے۔ طائف کے واقعہ کے بعد سلطانی احکام کی متابعت بخوبی کیگئی۔ اخوان کو ابن سعود کے عتاب کی فکر لاحق تھی۔ دوسرے

حجازیوں کی طرف سے کوئی قابل ذکر مزاحمت بھی نہیں ہوئی۔ امیر علی نے جدہ کے مقام پر بزدلی کے ساتھ کچھ مقابلہ کیا لیکن مقاومت کی طاقت نہ دیکھکر مکہ معظمہ کو بھاگ گیا۔

دارالسلطنت میں شریف حسین عجیب مصیبت میں مبتلا تھا۔ اسکی بہترین فوج دشمن کے ہاتھ سے کٹ چکی تھی۔ رعیت بغاوت اور حکم عدولی پر تُلی ہوئی تھی۔ احباب ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ کوئی حامئ کار نہ تھا۔ شریف حسین نے سونے چاندی کی چند انگریزی ٹکلیوں کے عوض اپنے ولی نعمت سے نمک حرامی کی تھی اب اُس نے انگریزوں سے مدد و معاونت طلب کی۔ انگریزوں نے بے رُخی برتی۔ اور بلطائف الحیل مدد دینے سے انکار کردیا لیکن انصاف کا اقتضا یہ ہے۔ کہ اس امر کو کھلے الفاظ میں تسلیم کرلیا جائے۔ کہ شریف حسین بذات خود بزدل نہ تھا۔ ایسے حوصلہ شکن اور رُوح فرسا حالات میں بھی ہراساں نہ ہُوا۔ اور تحفظ و مدافعت کیلئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا جب اسکی ملاقات امیر علی سے ہوئی تو بیٹے کی بزدلی پر سخت ناراض ہُوا۔ اور اسی رنج میں اُسے جدہ بھیج دیا۔ اور خود بدستور سابق متانت و وقار کو قائم رکھتا رہا۔ لیکن تمام مساعی بیکار ثابت ہوئیں۔ اور مدد کیلئے کوئی ہاتھ نہ بڑھا۔ آخر کار اُسکے مشیروں نے اُسے تخت و تاج سے دست بردار ہو جانے کا مشورہ دیا۔ چند دن تک تو انکار کرتا رہا لیکن مجبوراً اور کوئی چارہ کار نہ دیکھکر ۳ اکتوبر کو اپنے بیٹے علی کے حق میں دست بردار ہوگیا۔ اس طرح پر اسکی آٹھ سالہ حکومت کا خاتمہ ہُوا۔

شریف حسین کے ظلم و ستم رانی کیوجہ سے چند خوشامدی حاشیہ برداروں کے علاوہ حجاز میں کوئی شخص اسکی دست برداری پر رنجیدہ نہ ہُوا۔ اُس کے انگریز حلیف تو بھلا کیا پرواہ کرتے۔ بیرونی دُنیا میں بھی اسکی تباہی پر کوئی ہمدردی پیدا نہ ہوئی۔ اور یہ حرص و ہوا کا بندہ اور ہمہ گیر خواہشات کا پلندہ خُدا کی اس وسیع دنیا میں یکہ و تنہا اور بے یار و مددگار رہ گیا۔

مکہ مکرمہ اور جدہ سے بار بار انگریزی مداخلت کیلئے درخواستیں ہوئیں لیکن انگریز ٹس سے مس نہ ہوئے بلکہ الٹا یہ اعلان کردیا۔ کہ دو عرب حکمرانوں کی جنگ میں وہ غیر جانب دار رہیں گے۔ دوسری حکومتوں نے بھی اس مثال کی تقلید کی۔

شریف حسین کے پاس بارہ موٹر کاریں تھیں۔ ان کے سوا حجاز میں اور کوئی موٹر نہ تھی۔ کیونکہ شریف نے عوام کو موٹر خریدنے سے منع کیا ہُوا تھا۔ ان موٹروں میں پارچات۔ قالین۔ بستر۔ سونے چاندی کے زیورات سونے کی اینٹیں غرضیکہ تمام قیمتی غیر منقولہ جائیداد رکھی گئی۔ ایک کار میں شریفی خاندان کے افراد بیٹھے غلام

کو مسلح کر دیا گیا۔ اس طرح پر یہ قافلہ شہروں میں سے ہوتا ہوا جدہ کی طرف چلا گیا۔ اہالیان شہر شریف حسین سے نفرت تو کرتے ہی تھے۔ اب نظر حقارت سے بھی دیکھنے لگے لیکن راستہ روکنے یا حملہ کرنیکی جرأت کسی کو نہ ہوئی۔

جدہ پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد شریف حسین اپنے ذاتی دخانی جہاز میں بیٹھ کر اہل و عیال سمیت عقبہ ہوتا ہوا قبرص چلا گیا۔ اور سارا مال و دولت ساتھ لیتا گیا۔ سفر میں زر و مال کی نگہداشت بچشم خود کرتا رہا۔ سونے کی اینٹوں کے صندوق اکثر گنا کرتا تھا۔ تالوں کو بار بار ہاتھ لگا کر دیکھتا تھا کہ کہیں کھلے نہ رہ گئے ہوں۔ افسوس نمک حرامی سے پیدا کی ہوئی یہ دولت بھی آڑے وقت میں کام نہ آئی۔

امیر علی نے جو باپ کی جگہ تخت سلطنت پر متمکن ہوا تھا۔ چند روز میں دیکھ لیا کہ مکہ مکرمہ کی مدافعت محال ہے۔ ۱۵ اکتوبر کو اس نے بھی شہر خالی کر دیا۔ جونہی کہ وہ شہر سے نکلا۔ خالد بن لومی اپنے سپاہیوں کیساتھ شہر میں داخل ہو گیا۔

یہ واقعہ ہے کہ سلطان ابن سعود کے احکام اس وقت اہالیان مکہ کے کام آئے شہر میں قتل و غارت نہ ہوا۔ طائف کے کشت و خون کے متعلق انگریزوں نے زبردست احتجاج کیا تھا۔ اور سلطان ابن سعود نے ارادہ کر لیا تھا۔ کہ حجاز کے متعلق بقیہ کارروائیاں اسکی ذاتی نگرانی کے ماتحت ہوں۔ چنانچہ شہر میں امن و امان کا اعلان کر دیا گیا۔ اور سلطان ابن بجاد شیخ غطغط نے عارضی طور پر شہری نظم و نسق سنبھال لیا۔ لیکن امن و امان قائم ہو جانے کے باوجود اخوان بپھرے ہوئے تھے۔ انہیں اصرار تھا۔ کہ اگر مکہ کے مشرکین کی جانیں بچ جائیں تو بچ جائیں۔ لیکن مقابر و مزارات ضرور منہدم کر دئے جائیں گے۔ اور مساجد کی آرائشیں ضائع کر دی جائیں گی۔ کیونکہ ان کے اعتقاد کے مطابق ان چیزوں کے وجود میں شرک کا شائبہ پایا جاتا ہے چنانچہ حرم کے وہ تمام مقدس مزارات جو صدیوں سے زائرین کے مرجع رہے تھے۔ آن کی آن میں تباہ و برباد کر دئے گئے۔ وہ تمام رسوم و شعائر جنکی سند وہابیوں کے اعتقاد کے مطابق قرآن و سنت میں موجود نہ تھی۔ بیک جنبش قلم ممنوع قرار دئے گئے۔ اس کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ تمام عالم اسلام میں غصہ و اضطراب کی لہر اٹھی۔ ایران کے شیعوں اور ہندوستانی مسلمانوں میں ماتم کی صفیں بچھ گئیں۔ لوگ وہابیوں سے بدگمان تو پہلے ہی سے تھے۔ جو کچھ ان کے متعلق کہا گیا۔ بلا تحقیق و تدقیق صحیح تسلیم کر لیا گیا۔ وہابی اس فعل کو قرآن و سنت کے مطابق سمجھتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے غم و غصہ کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اور اپنے کام سے کام رکھا۔

۱۵ دسمبر کو ابن سعود حاجیوں کی طرح احرام باندھے مکہ مکرمہ میں داخل ہوا۔ اور حالات کی تحقیق و تفتیش

کی معلوم ہوا۔ کہ اُسکے تاکیدی احکام کی اب کی بار متابعت کیگئی ہے۔ اور شکایت کی گنجائش بہت کم ہے۔ ابن سعود نے اپنے رویہ سے اتنی بات کو بخوبی ثابت کردیا ہے۔ کہ وُہ اپنے متقدمین سے نہ صرف زیادہ رواداراور فراخ حوصلہ ہے۔ بلکہ زیادہ ہوشیار اور مدبر بھی ہے۔

مکہ مکرمہ کے فاتحانہ داخلہ کے بعد اخوان ارد گرد کے علاقوں میں پھیل گئے۔ پیشتر ذکر آچکا ہے۔ کہ لوگ شریف کی حکومت کو پسند نہ کرتے تھے مزاحمت کا تو کیا ذکر سب نے بطیب خاطر اطاعت قبول کرلی۔ امیر علی اسوقت جدہ میں پناہ گزین تھا۔ جدہ کے علاوہ صرف مدینہ منورہ اور ینبوع ایسے مقامات تھے جنہوں نے ابن سعود کی اطاعت ابھی تک اختیار نہ کی تھی باقی سارے حجاز پر ابن سعود کا اقتدار قائم ہوچکا تھا۔ شریفی طاقت کا بڑا مرکز اس وقت جدہ ہی تھا جسقدر اسلحہ اور سپاہی شریف کو میسر آسکتے تھے۔ جدہ میں موجود تھے۔ ان لوگوں میں سے جو شریف کی رہنمائی میں جنگ عظیم کے دوران میں ترکوں کے خلاف لڑ چکے تھے۔ اکثر زندہ تھے۔ اور شریف کی حمایت میں جنگ کیلئے تیار تھے چنانچہ شہر کے باہر خندقیں کھودی گئیں۔ اور ہر قسم کے عسکری استحکامات کر لئے گئے۔ بارود بچھا دیا گیا۔ تاریں پھیلائی گئیں اور چند پرانے ہوائی جہاز بھی جنگ کیلئے مخصوص کرئے گئے لیکن امیر علی نرم مزاج اور بیمار گو شخص تھا عسکری قابلیت نہ رکھتا تھا سپاہیوں کی تنخواہ دینے کیلئے اس کے پاس روپیہ نہیں تھا۔ اور شہری آبادی سامان رسد کی کمی کیوجہ سے فاقے کر رہی تھی جیسا کہ پیشتر بیان کیا جاچکا ہے۔ ابن سعود کا ارادہ شریف کے خاندان کے قلع قمع کردینے کا تھا۔ امیر علی نے نومبر میں قیام صلح کیلئے ایک وفد جدہ سے مکہ مکرمہ بھیجا۔ ابن سعود نے حوالگی شہر کی واحد شرط پیش کی۔ مفاہمت اور صلح کی راہ نہ دیکھکر وفد ناکام واپس ہُوا۔

۶ جنوری ۱۹۲۵ء کو جدہ کا باقاعدہ محاصرہ کرلیا گیا۔

اس وقت ابن سعود کو جدہ کی تسخیر سے بھی زیادہ فکر اس بات کی تھی۔ کہ حج خیریت و عافیت سے گذر جائے۔ وُہ خوب جانتا تھا۔ کہ اگر امسال حج نہ ہُوا۔ تو نہ صرف دُنیا بھر کے مسلمان اُس سے برگشتہ خاطر ہوجائینگے اور اپنی اخلاقی امداد سے محروم کردینگے۔ بلکہ غیر حکومتوں کو بھی خالص حجازی معاملات میں مداخلت کرنیکا معقول بہانہ مل جائیگا۔ لوگ وہابیوں سے پہلے ہی نفرت کرتے تھے۔ اور بدگمان تھے۔ ابن سعود چاہتا تھا۔ کہ وہ اسکی حکومت سے راضی ہوجائیں۔ اسکی نگاہ میں اس غرض کیلئے یہ ضروری تھا۔ کہ لوگ معقول تعداد میں حج کیلئے آئیں۔ اور بچشم خود دیکھ لیں کہ وُہ کس قسم کا آدمی ہے چنانچہ اُس نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو عام اعلان کردیا کہ حجاز کے مستقبل کے تصفیہ کیلئے وُہ جدہ میں مسلمانانِ عالم کا ایک عظیم اجتماع کریگا۔ ۲۵ فروری ۱۹۲۵ء کو اعلان

کیا گیا۔کہ گو جدہ کا محاصرہ بڑی سختی سے جاری ہے لیکن اگر حجاج چاہیں تو رابغ و لتھ یا قنفدا کی بندرگاہوں کی راہ سے حج کیلئے آئیں۔ ابن سعود انکی محافظت کا ذمہ وار ہوگا۔ بامن حج کیلئے ضروری تھا کہ حجاز میں امن قائم ہو۔ ملک کے بعض قبیلے خصوصاً قبیلہ حرب کے لوگ مدت سے حاجیوں کو لوٹنے اور مارنے کے عادی تھے۔ ترکوں اور شریف حسین کے عہد میں انکی یہی حالت قائم رہی تھی۔ یہ لوگ خیال کرتے تھے کہ ان کا یہ حق قائم رہیگا۔ بعض لوگوں نے اس بارے میں ابن سعود سے گفت و شنید بھی کی۔ اور اصرار کیا کہ یہ سلسلہ بدستور سابق قائم رہے۔ ابن سعود کو اس سے اتفاق رائے نہ تھا۔ اس نے اخوان کی وساطت سے ان غارتگروں کو وہ سبق دیا کہ ہمیشہ تک یاد رہیگا۔ اس اجمال کی تفصیل کسی اور مقام پر بیان ہوگی۔ بظاہر قیام امن کا یہ طریقہ سفاکانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حالات کا اقتضا یہی تھا اور نتائج کے لحاظ سے مؤثر بھی ثابت ہوا۔

جب چند ہزار حاجی مکہ مکرمہ میں پہنچ گئے۔ تو انہیں معلوم ہوا کہ ابن سعود کے اظہارات واقعی درست تھے۔ حجاز میں مکمل امن و امان قائم تھا۔ حج کے شعائر بخیریت ادا کئے گئے۔

حج کے بعد پھر فتوحات کا خیال پیدا ہوا۔ مدینہ منورہ ابھی تک شریف کے ہاتھ میں تھا۔ ناظرین کو معلوم ہے۔ کہ حضرت اعلیٰ و اقدس محمد مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روضۂ منورہ کی وجہ سے یہ شہر مرجع خلائق ہے اور اس شہر سے مذہبی رنگ میں ہر قسم کا پروپیگنڈا ہو سکتا ہے۔ اس شہر کی فتح کیلئے ابن سعود نے بہت اہتمام سے کام لیا۔ اس کے آباؤ اجداد سے سب سے بڑی غلطی اسی مقدس مقام پر سرزد ہوئی تھی۔

اگست میں نجدی افواج مدینہ کی طرف بڑھیں۔ اسی مہینے کی پچیس تاریخ کو امیر علی کے حکام نے اقصائے عالم میں یہ خبر مشہور کر دی۔ کہ نعوذ باللہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقدس مرقد پر نجدی گولہ باری کر رہے ہیں۔ نجدیوں کی طرف سے تردید تو شائع ہوئی لیکن بعد از وقت پہنچی۔ مسلمانوں میں پھر غیظ و غضب برپا ہوا۔ مسلمان حکومتوں کی طرف سے احتجاج شائع ہوئے۔ فرداً فرداً مسلمان بھی روضۂ مسلم کے تحفظ کیلئے کوشش کرتے رہے۔ ایرانی حکومت نے ایک وفد تحقیق حالات کی غرض سے بھیجا۔ ۱۹۲۵ء کے آواخر میں اس وفد نے بیان شائع کیا۔ کہ واقعی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روضے کے گنبد میں پانچ گولیاں لگی ہیں۔

آخر کار ۵ دسمبر کو مدینہ منورہ ابن سعود کے قبضہ میں آ گیا۔ ینبوع کی بندرگاہ اسی مہینے کی پہلی تاریخ کو فتح ہو چکی تھی۔ اس وقت جدہ میں بھی مزید مقابلہ کی ہمت نہ رہی تھی۔ امیر علی نے انگریزی قونصل کے توسط سے صلح کا پیغام بھیجا۔ شرائط یہ تھیں۔ کہ وہ حجاز کی حکومت سے دست بردار ہو جائیگا۔ اور شہر حوالے کر کے ملک چھوڑ

دیگا بشرطیکہ شریفی سپاہ سے باز پرس نہ کی جائے۔ اور اخوان شہر میں داخل نہ ہونے پائیں۔ ابن سعود نے یہ شرطیں قبول کرلیں ۱۸ دسمبر کو امیر علی نے اپنی دست برداری کا اعلان کر دیا۔ ۱۹ تاریخ کو وہابیوں کا قبضہ جدّہ پر ہو گیا۔ تین دن بعد امیر علی عدن کے راستے سے عراق چلا گیا۔ اور اب تک وہیں مقیم ہے آواخر دسمبر تک ابن سعود حجاز کے سارے ملک پر قابض تھا۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۲۵ء کو اس حقیقت کا عام اعلان کر دیا گیا۔

باب بست و پنجم

حجاز کی فتح کے بعد

ذکر آچکا ہے کہ شریف حسین نے اکتوبر ۱۹۲۴ء میں دست برداری دیدی۔ اور فیصلہ کر لیا کہ اب خود بخود حجاز سے چلے جانا چاہئے چنانچہ ۹ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو وہ مکہ شریف سے جدّہ کی طرف چلدیا۔ اسکی موٹر کار کی حفاظت کیلئے مسلح دستہ ساتھ تھا۔ شریف جدّہ میں بھی زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکا۔ ایک ہفتہ کے اندر ہی اپنے وسیع خاندان اور حرص و آز کی جمع کی ہوئی دولت کو ساتھ لیکر اپنے دخانی کشتی میں بیٹھ کر یہاں سے بھی رخصت ہوا۔ اور عقبہ میں پہنچکر دم لیا۔ یہاں بھی شہر میں داخل نہ ہو سکا۔ بلکہ کشتی میں ہی قیام پذیر رہا۔

انگریزی حکومت نے خیال کیا۔ کہ اگر شریف نے عقبہ کے قرب میں سکونت رکھی۔ تو وہابی ضرور بالضرور اس علاقہ پر حملہ آور ہونگے۔ ناظرین کو معلوم ہے۔ کہ انگریزوں نے شریف کے آخری ایام میں عقبہ و معان کا علاقہ حجاز سے علیحدہ کر کے شرق یردن کی ریاست کی حدود میں شامل کر دیا تھا۔ انگریزوں نے چاہا کہ شریف حسین کو یہاں سے ہٹا دیں۔ شریف عقبہ و معان کی علیحدگی سے ہی ناراض تھا ہٹا دینے کی کوشش پر اور بھی بگڑا۔ آخر کار جون ۱۹۲۵ء میں مجبوراً ماننا پڑا۔ انگریزوں نے اُسے قبرص بھیجدیا۔ اس کا خاندان ساتھ تھا۔ شریف یہاں گمنامی مگر امن کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اور عربی گھوڑوں کی پرورش سے دل بہلاتا رہا۔ ۱۹۳۱ء کے اوائل میں شریف حسین اپنے بیٹے امیر عبداللہ کی ملاقات کیلئے عمان کو گیا۔ یہاں کچھ عرصہ کے بعد بیمار پڑا۔ اور ۴ جون ۱۹۳۱ء کو راہئے ملک عدم ہوا۔ یروشلم کے حرم الشریف کی مغربی دیوار کے باہر بڑے تزک و احتشام کے ساتھ تجہیز و تدفین ہوئی۔

یہ وہ شخص تھا جسکی حرص و آز انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ غلط فہمی اور استحادی طاقتوں کے جھوٹے وعدوں پر فریفتہ ہوکر اپنے آقایانِ نعمت ترکوں سے غداری کی اور حجاز کے بیکس اور بے بس ترکوں پر ناگفتہ بہ مظالم ڈھائے لیکن جیسا کہ نمک حرامی اور غداری کیلئے مقدر ہوچکا ہے۔ آخر کار ناکامی اور نامرادی کے داغ اُٹھا کر گمنامی اور ذلت کی موت مرا۔

وہابی حکومت کیلئے شریف حسین کے آخری ایام اس لحاظ سے اہم تھے۔ کہ ان میں نجد اور شرقِ یردن کی سرحد کا تنازعہ چھڑ گیا۔ شریف اور ابن سعود سرودو کا خیال یہ تھا۔ کہ عقبہ اور معان حجاز کا جزو لاینفک ہے انگریز اس نظریئے کو صحیح نہیں مانتے تھے۔

جب ابن سعود نے حجاز کو فتح کیا تو اُسے بخوبی معلوم تھا۔ کہ حجاز کی تسخیر کے ساتھ ہی عالم اسلام میں ہیجان پیدا ہوگا۔ اسلئے رائے عامہ کی موافقت حاصل کرنے کیلئے اس نے بہت کوشش کی چنانچہ اُس نے اعلان عام کر دیا۔ کہ اس کے وہابی نجدا گانہ فرقے کے انتہا پسند نہیں ہیں۔ اسکے اعلان کا خلاصہ یہ تھا۔

"عام مسلمانوں کی طرح ہم بھی ایماندار ہیں۔ جو کہ خدائے واحد پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ اور محمد رسول صلعم کے مذہب کے پابند ہیں۔ مسلمانوں کو شریف حسین کے دھوکہ میں آکر اُسے روپیہ اور آدمی نہیں دینے چاہئیں کیونکہ وہابی بھی ان کی طرح سے مسلمان ہی ہیں"۔

بعد کے اعلانات میں ابن سعود نے اس بات پر بہت زور دیا۔ کہ حجاز مقدس کو محض آلائشوں سے پاک و صاف کرنیکی خاطر وہ حملہ آور ہوا ہے چنانچہ جونہی کہ وہابی مکہ مکرمہ پر قابض ہوئے۔ ابن سعود نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو اعلان کر دیا۔ کہ اُس کا مقصد حجاز کا نجد سے الحاق نہیں ہے۔ اور یہ کہ جمہور مسلمان ایک کانفرنس کے ذریعہ سے حجاز کی مستقبل نظم و نسق کے متعلق فیصلہ کرینگے۔ کئی ہفتے بعد ریاض سے اُس نے عام مسلمانوں کے نام ایک اشتہار جاری کیا۔ جس میں اس نے لکھا۔

"ہماری افواج ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوئیں۔ ہم خوش ہیں۔ کہ انہوں نے حرم شریف کا احترام بخوبی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ وہ چاہتے تو بزورِ شمشیر بلد الامین میں داخل ہو سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اس مقدس نواح میں کشت و خون پسند نہیں کیا۔ اور حتی المقدور تحمل سے کام لیا ہے

اب جبکہ ظلم و بیداد کا دور ختم ہوچکا ہے۔ ہماری دلی خواہش یہ ہے۔ کہ حرمین الشریفین عام مسلمانوں کے لئے کھلے رہیں۔ اور ان کا نظم و نسق جمہور کی رائے کے مطابق ہو۔ میں خود مکہ شریف جاؤنگا۔ اور برادران اسلام

کے نمائندوں کا انتظار کھینچونگا۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ مسلمان اپنے اپنے ممالک سے نمائندوں کو ضرور بالضرور بھیجیں"۔

چنانچہ اسی طرح کے متعدد پیغامات میں ابن سعود نے یہ بات اچھی طرح بتلادی۔ کہ اس کا مقصد محض اسکے سوا اور کچھ نہیں۔ کہ فریضہ حج بلامزاحمت ادا ہو۔ اور صوبہ حجاز کا انتظام بین الاقوامِ اسلام ہو۔

اس عجیب وغریب دعوت کا اثر شروع میں ایوس کُن تھا چنانچہ ۱۹۲۴ء میں کوئی اسلامی اجتماع نہ ہوسکا۔ دسمبر ۱۹۲۴ء میں ہندوستانی مسلمانوں کا ایک وفد جدہ پہنچا۔ لیکن کوئی نتیجہ خیز عمل نہ کرسکا۔ ۱۹۲۵ء کے پورے دوران میں عالمِ اسلام میں وہابیوں کے متعلق شکوک وشبہات کے جذبات موجزن رہے۔ ابن سعود جس انداز سے عام مسلمانوں کی طرح مکہ مکرمہ میں داخل ہوا۔ اور وہاں کے آداب وشعائر بجالایا۔ اُس کا حجازیوں پر بہت خوشگوار اثر ہوا۔ اس طرح پر ابن سعود کے معتقدین کی تعداد روز افزوں ترقی کرتی رہی۔ لیکن بیرونِ عرب کے مسلمانوں کی دلی کیفیت ہنوز ابن سعود کے موافق نہ تھی۔ سیاسی نقطۂ نگاہ سے نہایت ضروری تھا کہ ابن سعود گردونواح کے اُن ممالک کے متعلق جو انگریزوں کے زیر اثر تھے۔ ایک فیصلہ کُن پالیسی اختیار کرتا جس طرح سے ۱۹۲۱ء میں حائل کی فتح سے اندرون عرب کی طاقتوں کا توازن جاتا رہا تھا۔ اُسی طرح پر حجاز کی فتح سے ہمسایہ ممالک کیلئے طرح طرح کے مسائل درپیش ہوگئے تھے۔ سب سے بڑی بات عراق اور شرق یردن کی سرحد کا معاملہ تھا۔ حجاز کی فتح سے سلطان نجد کی وجاہت اور وقار میں بیحد وحساب اضافہ ہُوا تھا لیکن عام طور پر معلوم تھا کہ اس فتح سے نجد کے اخوان کو عملی اور مالی فائدہ بہت کم پہنچا ہے۔ اسلئے اندیشہ تھا۔ کہ متعصب اور سرکش اخوان مالی منفعت کے خیال سے شمال کے زرخیز اور زرریز ممالک پر دھاوا کرینگے۔

پیش بندی کے طور پر انگریزی حکومت نے ستمبر ۱۹۲۵ء میں سر گلبرٹ کلیٹن کو جدہ بھیجا۔ صاحب موصوف فلسطین کی حکومت کے چیف سیکرٹری رہ چکے تھے۔ غرض یہ تھی۔ کہ وہ ابن سعود سے عراق و نجد اور نجد و شرقِ یردن کی سرحدات کے تصفیہ کیلئے گفت وشنید کریں۔

اتفاق کی بات ہے۔ کہ اس انگریز مدبر کے ساتھ ابن سعود کے دوستانہ تعلقات بہت تھوڑے سے عرصہ میں مستحکم ہوگئے۔ اور ۱۹۲۹ء میں صاحب موصوف کی وفات تک بدستور قائم رہے۔ اس نازک مرحلہ میں ابن سعود نے انتہائی تدبر اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا۔ اسکی خواہش تھی۔ کہ تجارتی مفاد کی خاطر اس کے ملک کا اتصال شام کے ساتھ ہوجائے۔ لیکن انگریزی سفیر کو خاص ہدایات دیدی گئیں تھیں۔ کہ اس خواہش کو بلطائف الحیل ٹال

وے انگریز یہ چاہتے تھے کہ بحیرۂ روم سے لیکر خلیج فارس تک ان کا اثر و نفوذ غیر منقطع رہے۔ اور درمیان میں کوئی بیرونی حکومت حائل نہ ہو۔ اس غرض کے حصول کیلئے لازمی تھا۔ کہ عراق اور شرق یرون کی سرحدیں متّصل کر دی جائیں۔

آخر کار فریقین میں ایک معاہدہ ہو گیا۔ اس کا نام معاہدہ حدّہ قرار پایا۔ اس وقت ابن سعود بحرہ کے مقام پر سکونت پذیر تھا۔ ۲ نومبر ۱۹۲۵ء کو اس معاہدہ پر دستخط ثبت ہوئے اسکی رُو سے نجد اور شام کے درمیان ساٹھ میل کا علاقہ چھوڑ دیا گیا جو کہ شرق یرون کو عراق سے متّصل کرتا تھا۔ قرار پایا کہ اس علاقہ سے نجدی تجار شام کو بلا مزاحمت آجا سکتے ہیں وادی سرحان کا علاقہ شمال مغربی گوشہ کے علاوہ نجد میں شامل کر دیا گیا۔ نوری شعلان اور اسکے قبیلہ رولا کا تنازعہ دیر سے قائم تھا امیر نوری شعلان چاہتا تھا۔ کہ وہ اس علاقہ کا آزاد حکمران تسلیم کیا جائے لیکن وہ نجد کی رعیت قرار دیا گیا۔ ظاہر ہے۔ کہ ابن سعود کو اس معاملہ میں صریح کامیابی حاصل ہوئی۔

اس مقام اور اسی تاریخ پر ایک سمجھوتہ معاہدہ بحرہ نامی ہُوا جس میں نجد و عراق کی سرحد کے معاملہ کا تصفیہ ہو گیا ہر دو معاملات سے مقصد یہ تھا کہ وہابی شمالی علاقوں میں پیشقدمی نہ کرنے پائیں۔ اس لئے ہر دو معاہدات کے اکثر ضمن مشترکہ اور یکساں تھے۔ ہر دو میں تسلیم کیا گیا۔ کہ لوٹ و غارت تمدن اور مدنیت کے خلاف سخت جرم ہے اور لُوٹ مار کرنے والا قبیلہ جس حکومت کے ماتحت آباد ہو۔ وہ حکومت اسکی کارروائی کی ذمہ دار سمجھی جائیگی۔ اس قسم کے معاملات کے تصفیہ کیلئے خاص عدالتیں قائم کر دی گئیں۔ قبائل سرحد دونوں حکومتوں کی اجازت کے بغیر ایک علاقہ سے دوسری طرف نہیں جا سکتے تھے لیکن ساتھ ہی یہ بھی طے ہُوا کہ اگر قبائل کی یہ نقل و حرکت مویشی چرانے کی ضرورت سے ہو تو متعلقہ حکومت ضرور بالضرور حسب ضابطہ اجازت دیدیگی۔ اس قسم کی متعدد دفعات سے شمالی عرب کے سرحدی علاقوں کا انتظام عُمدہ طریق سے ہو گیا۔

لیکن فریقین کی بہترین مساعی کے باوجود ایک معاملہ کا تصفیہ نہ ہو سکا۔ یہ قضیہ عقبہ اور معان کی ملکیت کے بارے میں تھا۔ ابن سعود کو ضد تھی۔ کہ یہ علاقہ حجاز کا ضروری حصہ ہے۔ اور اس صوبہ کی حفاظت اور استحکام کیلئے ناگزیر ہے۔ کہ یہ علاقہ اسکے حوالہ کر دیا جائے۔ موقعہ کی عسکری اہمیت کے لحاظ سے انگریز نہیں چاہتے تھے۔ کہ یہ علاقہ وہابیوں کے حوالہ کیا جائے۔ انگریزوں نے ہر چند چاہا۔ لیکن ابن سعود کسی طرح بھی اس علاقہ سے دست بردار ہونے پر راضی نہ ہُوا۔ بالآخر یہ معاملہ کسی آئندہ موقعہ کیلئے ملتوی کر دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ ابن سعود نے ان معاہدوں کی تجویز و تکمیل میں حُسن تدبیر کا نہایت عُمدہ ثبوت دیا وہ جانتا تھا۔ کہ بحالات موجودہ اس کے وسائل اس قدر وسیع نہیں ہیں۔ کہ وہ انگریزی طاقت کا مقابلہ کر سکے

اور نہ ہی وُہ سرِ دست عرب میں فتنہ و فساد کی آگ سُلگتے دیکھنی چاہتا تھا اس لئے ناگزیر تھا۔ کہ وُہ انگریزوں کے ساتھ معاملات کا تصفیہ کرے۔ یہ تصفیہ صحرا کے رسم و رواج اور بین الاقوامی قانون کے امتزاج سے کیا گیا بڑی خوبی یہ تھی کہ ابن سعود کی آزادانہ حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا۔ اور انگریزی مفاد کو بھی نقصان نہ پہنچا۔

۱۹۲۳ء و ۱۹۲۴ء کی کویت کانفرنس کا منشاء بھی یہی تھا لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس تصفیہ سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ سلطان ابن سعود اور انگریزی حکومت کے تعلقات بہت خوشگوار اور دوستانہ ہو گئے۔

اب ابن سعود بالکل مطمئن تھا بعض امور کا تصفیہ کلی طور پر اسکے حق میں ہُوا تھا۔ اسکے مخالف کوئی بات قطعی طور پر فیصل نہ ہوئی تھی۔ شیخ مبارک کی سیاست و تدبر میں شاگردی آڑے وقت میں کام آگئی تھی

لیکن ابھی اور بہت سے معاملات غور طلب تھے سب سے اہم معاملہ یہ تھا کہ حجاز میں وہابیوں کی حیثیت کو متعین کیا جائے۔ شروع سے ہی ابن سعود نے تسلیم کر لیا تھا کہ شریف حسین کے اخراج کے بعد وُہ چُپکے سے اس مُلک میں حکمرانی نہیں کر سکتا تھا۔ عام مسلمانوں کی اخلاقی امداد حاصل کرنا ضروری تھی اور ذاتی رفعت کا خیال کرنا مضر تھا۔ سر گلبرٹ کے ساتھ سیاسی گفت و شنید شروع ہونے سے صرف ایک ہفتہ پہلے اُس نے اعلان عام کیا تھا۔ کہ اسے حجاز کا بادشاہ نہ سمجھا جاوے۔ بلکہ عام مسلمانوں کا ادنیٰ خادم تصوّر کیا جائے۔ مصر۔ ترکی۔ عراق۔ افغانستان اور ایران کی حکومتوں کے نام ایک گشتی چٹھی جاری کی تھی جسمیں درج کیا گیا کہ

"میں نہ تو حجاز کا مالک بننا چاہتا ہوں۔ اور نہ ہی اس ملک پر کسی طرح سے تصرّف کرنا چاہتا ہوں۔ حجاز امانت کے طور پر اس وقت تک میرے ہاتھ میں ہے۔ جب تک کہ حجازی متفقہ طور پر اپنا فرمانروا منتخب نہ کر لیں۔ وُہ حکمران عالم اسلام کا خادم ہوگا۔ اور مسلمانوں کی رائے کے مطابق حکومت کریگا۔"

۱۹۲۵ء کے آخیر تک پُورا حجاز ابن سعود کی اطاعت قبول کر چکا تھا۔ عملاً ابن سعود حجاز اور نجد دونوں کا بادشاہ تھا لیکن مسلمانوں کی اختلاف رائے کے باوجود وُہ حجاز کا بادشاہ بننا نہ چاہتا تھا۔ اُس کے دل میں ارض مقدس کے بارے میں تقریباً وہی مُبارک خیالات موجزن تھے۔ جو مسلمانوں کے بڑے بڑے قائدین فکر کے دلوں میں رہ چکے تھے۔ آخر کار اُس نے تہیہ کر لیا۔ کہ اس مخمصے کو جلد از جلد نپٹا لینا چاہیئے

مکہ مکرمہ کے عمائد ایک جلسہ میں جمع ہوئے۔ اور تجویز یہ ہوئی۔ کہ ابن سعود والئے نجد و ملحقات کو بادشاہ بنا دیا جائے۔ لیکن شرط یہ تھی۔ کہ وُہ قرآن و سنّت اور سلف صالحین کے اتباع کے مطابق حکومت کرے۔

ناظرین کو معلوم ہے۔ کہ اتباع شریعت ابن سعود کو دل سے منظور ہے۔ اور وہ اس حقیقت کا بارہا اظہار بھی کر چکا ہے چنانچہ ۸ جنوری ۱۹۲۶ء کو جب جمہور مسلمانوں نے متفقہ رائے کے مطابق حرم کعبہ میں حجاز کا بادشاہ بنا دیا گیا لیکن اسلامی وضع اور سادگی کو ملحوظ خاطر رکھا گیا۔ بادشاہانہ رسوم اور تزک و احتشام کا وحشیانہ اظہار نہیں کیا گیا۔ ابن سعود نے خود کہا تھا کہ وہ اس مقدس شہر میں ذاتی رفعت اور قدر و منزلت کا خواہاں نہیں۔ اہالیان شہر جوق در جوق ابن سعود کے پاس سے گذرتے گئے۔ اور حسب شریعت اسکی اطاعت اور وفاشعاری کی بیعت کرتے گئے۔ ابن سعود نے بعد میں اعلان کیا کہ نظم و نسق سلطنت کے بارے میں اور ذاتی زندگی میں شریعت محمدیہ کی پوری پابندی کرے گا۔ عدل و انصاف سے حکومت کریگا۔ ظالم کو تباہ و برباد اور مظلوم کی دستگیری کریگا۔ اور امیر و غریب میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھیگا۔

ابن سعود اب بھی اپنے عہود کا پابند تھا جو کہ اس نے عام مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں وقتاً فوقتاً کئے تھے۔ وہ شخصی حکومت کو پسند نہ کرتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ جمہور مسلمانوں کی نمائندہ حکومت حجاز میں قائم ہو۔ وہ حجاز کو دستوری حکومت دینا چاہتا تھا باقاعدہ انتظامات ہونے تک ایک حکومت کا غیر مستقل نظام مرتب کر دیا گیا۔ ابن سعود کا دوسرا بیٹا فیصل حجاز کا والی نامزد ہوا۔

ناظرین نے دیکھ لیا ہو گا۔ کہ ابن سعود نے حجاز کی تسخیر کے بعد بہت حزم و احتیاط سے کام لیا۔ نہ ہی اس نے شریف حسین کی طرح تمام عرب کے شہنشاہ ہونے کا بلند آہنگ دعویٰ کیا۔ اور نہ ہی خلافت اسلامیہ کا مدعی ہوا۔ اس نے جمہور کی رائے کے مطابق اپنے تئیں صرف حجاز کا بادشاہ قرار دیا۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکا حجازیوں کے حقوق شرعی و مدنی کو پیش نظر رکھا۔

حجاز دنیا بھر کے مسلمانوں کا مامن و مرجع ہے۔ اور حجاز کے بادشاہ کی حیثیت سے ابن سعود کے تعلقات نہ صرف عالم اسلام سے پیدا ہو گئے۔ بلکہ ان تمام حکومتوں سے جنکے نمائندے حجاز میں موجود و متعین تھے اسکے تعلقات استوار ہو گئے۔ اس طرح پر ابن سعود کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو گئی۔ جو کہ پیشتر ازیں طاقت و سطوت کے باوجود میسر نہ تھی۔

---

(۱)

اسلامی اقوام کے ساتھ روابط

فتح مکہ کے بعد ابن سعود نے ارادہ کر لیا۔ کہ حجاز کی مقدس سرزمین کو اسلامیانِ عالم کا مرکز بنا دے غرض یہ تھی کہ حج کے موقعہ پر جب اقطاعِ عالم سے مسلمان آئیں۔ تو حقیقی اسلام کی تعلیم سے مستفیض ہو کر جائیں۔ اس طرح پر دنیا بھر میں اصلاح و تہذیب کی دعوت عام ہو جائے۔

حجاز کے نظم و نسق کے متعلق سلطان کے ذہن میں کوئی خاص لائحۂ عمل نہیں تھا۔ اُسے عام اسلامی ممالک کی امداد کی ضرورت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ دنیا بھر کے مسلمان مکہ مکرمہ میں حاضر آئیں اور بحث و تمحیص کے بعد حجاز میں حکومت مرتب ہو۔ اُسکے انتظام و انصرام میں حصہ لیں۔ اس نے یہاں تک اعلان کر دیا۔ کہ طرزِ حکومت اور حکمران کا انتخاب مسلمانانِ عالم کی نمائندے اپنی مرضی کے موافق کرینگے۔

اس میں شک نہیں کہ سلطان حجاز کی حکومت کے بارے میں بالکل نیک نیتی سے کام لیتا تھا۔ لیکن حقیقت میں وہ خود غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ اُسکے معتقدات اور حالات و کوائف اجازت نہ دیتے تھے۔ کہ وہ اغیار کی مداخلت کو گوارا کر لے۔ وہ مقامات مقدسہ میں وہابیوں کے سوا کسی کا رسوخ دیکھ نہ سکتا تھا۔ وہ خود حکومت کا عادی تھا۔ اور ماتحتی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے اثنائے گفتگو میں امریکن سیاح امین ریحانی سے کہا۔ کہ ہم اپنے آپ کو خوب سمجھتے ہیں۔ اور اپنے سوا کسی کی رہنمائی کو قبول نہیں کر سکتے۔

یہ بیان ہو چکا ہے۔ کہ ابن سعود کے ذہن میں پیشتر سے کوئی لائحۂ عمل موجود نہیں تھا۔ لیکن وہ برابر حزم و احتیاط سے کام لیتا۔ اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا رہا۔ وجہ یہ تھی کہ نجد کی ریاست اندرونِ عرب میں واقع تھی اور وہاں بیرونی ممالک سے سروکار نہ تھا۔ حجاز کے تعلقات اور روابط اقصائے عالم میں پھیلے ہوئے تھے آخر کار ابن سعود نے تمام حالات و کوائف پر بنظر تعمق غور کر کے اس مقدس سرزمین کے بارے میں اپنی پالیسی وضع کر لی۔

سب سے اوّل اُس نے حجاز میں عارضی حکومت قائم کردی۔ حجاز کے طول وعرض میں بد امنی کا دور دورہ تھا۔ ابن سعود نے اپنی نگرانی میں عمائد وارکین کی ایک جماعت انتظام کیلئے مقرر کی اس کا دوسرا لڑکا فیصل اس حکومت کا صدر قرار پایا۔ مکہ مکرمہ اور حجاز مقدس کے نمائندے بھی ارکانِ حکومت میں شامل کرلئے گئے۔ خالد بن لوہی سپر عسکر مقرر ہوا۔ اور حافظ وہبہ مکہ مکرمہ کا حاکم اعلیٰ مقرر ہوا۔ اس تقرری سے مراد یہ تھی کہ حافظ وہبہ کی دنیاوی فراست اور رواداری اخوان کی تنگدلی اور کوتاہ بینی کو جادۂ اعتدال پر لے آئے۔

نظم ونسق کی ابتدائی کاروائیاں ابھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچی تھیں کہ مشکلات کا سامنا آپڑا مسلمانوں کی متعدد جماعتوں نے بالخصوص عراق اور ایران کے شیعوں نے وہابیوں کے خلاف شور وغوغا برپا کردیا۔ اہل السنّت والجماعت کی کثیر جماعت بھی اُن کی ہمنوا تھی۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ سرزمینِ حجاز میں وہابیوں کی حکومت گوارا نہیں کی جاسکتی۔ نجدی تنگدل اور متعصب ہیں۔ اور اپنے آباؤ اجداد کی طرح حجازیوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھا رہے ہیں۔ کچھ عرصہ میں عام مسلمان فریضۂ حج کی ادائیگی میں قاصر رہ جائینگے۔ یہ لوگ اپنے احتجاج کی تائید میں طائف کا قتلِ عام اور طرابہ کی تباہی کے واقعات پیش کرتے تھے۔

پیشتر ازیں ابن سعود کو غیر ملکی مسلمان عناصر سے معاملات طے کرنے کا تجربہ نہ تھا۔ لیکن اس نے انتہائی تحمّل اور تدبّر سے صورتِ حالات کو سنبھالے رکھا۔ اُس نے غیر ممالک کی مخالفانہ نقد وجرح پر ناراضگی یا اضطراب کا اظہار نہ کیا۔ بلکہ تمام اسلامی ممالک کے نمائندوں کو دعوت دی۔ کہ حجاز میں اُن کے وفد آئیں۔ اور بطور خود حالات کا مطالعہ کریں۔

سب سے اوّل ایرانیوں کا ایک وفد مکہ مکرمہ کے نقصانات کو معائنہ کرنے کیلئے حجاز پہنچا۔ یہ لوگ اپنے معتقدات کے اعتبار سے طبعاً ابن سعود اور وہابیوں کے سخت خلاف تھے لیکن ابن سعود نے خوش اخلاقی اور رواداری کا کچھ ایسا مظاہرہ کیا۔ کہ یہ لوگ اُسکے مدّاح ہوگئے۔ اور حکومت حجاز سے قطعی طور پر مطمئن ہوگئے۔

بعدازاں مصری آئے۔ اُن کی مخالفت بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ سعود اعظم اور اسکی وسیع سلطنت کے زمانہ سے مصریوں کی روایات معاندانہ چلی آتی تھیں۔ مروّجہ علوم سے آراستہ وپیراستہ ہونے کیوجہ سے مصری خواہاں تھے۔ کہ قاہرہ اسلامی دنیا کا مرکز اور اُن کا بادشاہ فواد خلیفۃ المسلمین بن جائے۔ شریف حسین کی اطلاع کی بنا پر مصری شکائت کرتے تھے۔ کہ اخوان نے فیصل الدویش کی قیادت میں مدینہ منوّرہ کے محاصرہ کے دوران میں روضۃ النبیؐ کے گنبد پر گولہ باری کی ہے۔ اور کہ فیصل الدویش نے تہیّہ کرلیا ہے۔ کہ فتحیابی کی صورت

ہیں مدینہ منورہ لُوٹ لیا جائیگا۔ اور اُسکی تمام آبادی تہہ تیغ کردی جائیگی۔ ابن سعود نے مصریوں کے ساتھ نہایت خوش اسلوبی سے سلوک کیا۔ اور اُنہیں یقین دلا دیا۔ کہ روضہ مطہرہ پر گولہ باری نہیں کیگئی۔ اور فیصل الدویش اور اسکے سپاہی اس پاکیزہ اور مقدس بستی کے اندر جانے نہ پائیں گے۔

سب کے بعد ہندوستانی پہنچے۔ یہ لوگ خوش گفتار لیکن کج رفتار واقعہ ہوئے تھے اکثر اوقات مغربی اقوام کی جمہوریت کے راگ گایا کرتے تھے۔ اور حجاز کے مخصوص حالات پر غور نہیں کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے رویہ سے ثابت کر دیا۔ کہ وُہ اپنے تئیں عربوں سے برتر والے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ گفت و شنید میں وہابیوں کو بڑی دقت پیش آئی۔ اکثر تنازعات ابن سعود کی بروقت مداخلت سے رفع ہوئے۔

شیخ سنوسی ترکی سے آئے۔ یہ بڑے متقی اور پرہیز گار تھے۔ اور زہد اور عبادت کی وجہ سے اقصائے عالم میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کے مرید لاکھوں کی تعداد میں حجاز اور دُنیا کے مختلف حصّوں میں موجود تھے۔ اپنی عادت کے مطابق وُہ امہات المومنین کے مزارات پر حاضر ہوئے۔ اور شفاعت کیلئے دُعا کی۔ وہابی سرے سے شفاعت کے قائل ہی نہیں۔ جب اُنہیں شیخ سنوسی کی دعائے شفاعت کا علم ہُوا۔ تو وُہ بہت برافروختہ ہوئے اور کہنے لگے کہ شیخ سنوسی نے ایک بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ وہابیوں کے اعتراضات سے مشتعل ہو کر شیخ سنوسی نے بھی اُن کی بہت سی باتوں پر رائے زنی کی۔ فریقین میں اشتعال طبع اس قدر بڑھا۔ کہ قتل اور نقص امن کا احتمال پیدا ہو گیا۔ لیکن ابن سعود نے فریقین کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔ اس طرح پر یہ فتنہ بھی فرو ہو گیا۔

لیکن ظاہر ہے۔ کہ ابن سعود کو اس وقت اندرون ملک اور بیرون سے طرح طرح کی مشکلات اور خطرات لاحق تھے۔ لیکن جہاں اس نے شاہی وقار اور حکومت کے تحمّل اور شکوہ کو ہاتھ سے نہ چھوڑا وہاں تدبر اور سیاست سے عامتہ الناس کو شکایت کا موقع بھی نہ دیا۔ اور مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات کو اس معاملہ فہمی اور خوش اسلوبی سے نپٹایا۔ کہ اپنے تو ایک طرف اغیار و اجانب نے بھی داد و تحسین کے خراج پیش کئے۔

(۴)

مکّہ کانفرنس

جب وہابی حجاز کو فتح کر چکے۔ تو دُنیائے اسلام میں اُن کے خلاف غم و غصّہ کے جذبات موجزن ہو چکے تھے اسکی ایک وجہ تو یہ تھی۔ کہ پہلی وہابی سلطنت نے عام مسلمانوں پر طرح طرح کے ظلم برپا کئے تھے۔ اور لوگ ابتک اُن کے نام سے خائف اور متنفّر تھے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی۔ کہ شریف حسین اور اس کا خاندان وہابیوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں پانی کی طرح روپیہ بہا رہا تھا۔ ان کے پاس نشر و اشاعت کے وافر ذرائع موجود تھے۔ اسی زمانہ یعنی مارچ ۱۹۲۴ء کو ترکوں نے اپنے ہاں سے خلافت کو منسوخ کر دیا تھا شریف حسین جو خود خلافت کا مدعی تھا۔ تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ لوگ خائف تھے کہ کہیں ابن سعود ہی خلیفہ نہ بن بیٹھے۔ غالباً پیش بندی کے طور پر ہی مصر والوں نے مئی ۱۹۲۶ء میں اپنے ہاں ایک وسیع کانفرنس کا انتظام کیا تھا۔ تاکہ ابن سعود کی شمولیت کے بغیر ہی خلافت کا انتخاب ہو جائے۔

خود ابن سعود خلافت کا مدعی یا خواہاں نہ تھا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ فی زمانہ خلافت کے حقیقی لوازمات کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ دوسرے جو کوئی بھی خلیفہ ہوگا۔ بہر صورت بارِ گراں کا متحمل ہوگا۔ اور کانٹے کی طرح سے دُنیا بھر کی نگاہوں میں کھٹکیگا۔ حالانکہ اس کی طاقت کچھ بھی نہ ہوگی۔

ساتھ ہی اُسے یہ بھی علم تھا کہ حرمین الشریفین کے قبضے کے متعلق لوگ اُس سے مطمئن نہیں ہیں اور انہیں اطمینان دلانا نہایت ضروری ہے۔ ابن سعود نے حجاز میں آکر پسندیدہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ اور عوام کی بدگمانیاں بڑی حد تک دُور ہو چکی تھیں۔ لیکن پھر بھی ضروری تھا۔ کہ اس اہم معاملہ کا تصفیہ من حیث المجموع ہو جائے چنانچہ ۸ اپریل ۱۹۲۶ء کو ابن سعود نے ایک عظیم اسلامی کانفرنس کیلئے دعوت دی۔ ایک ہی مضمون کی تاریں ترکی۔ ایران۔ افغانستان۔ اور یمن کی آزاد اسلامی حکومتوں اور مصر اور عراق کی نیم آزاد ریاستوں کو دی گئیں۔ امیر عبدالکریم عرا کشی۔ بے والئے ٹیونس۔ اور مجلس اعلیٰ فلسطین اور نظارت مذہبی اسلامی روس کو بھی دعوت دیگئی۔ دمشق سے دو مؤرخ اور الجیریا سے رئیس طلب ہوا۔ ہندوستان کی تین اور جزائر ہائے شرق الہند کی دو مذہبی جماعتوں کو دعوت نامے وصول ہوئے چنانچہ دُنیا کے مختلف حصّوں سے ستّر کے قریب نمائندے مکّہ کو جمع ہوئے۔ تقریباً سب کے سب غیر سرکاری

حیثیت رکھتے تھے۔ مختلف مضامین پر بحث و تمحیص ہوئی۔ بعض جزدی باتوں پر مفاہمت بھی ہو گئی۔ بڑی معرکتہ الآرا تقریریں ہوئیں لیکن عملاً بہت کم فائدہ ہؤا۔ مختلف نظریئے پیش ہوئے۔ اور یکے بعد دیگرے مسترد ہو گئے کئی دفعہ بین الاقوامی سیاسیات پر بحثیں چھڑ گئیں۔ وہابی حکام نمائندوں کے ذوق تقریر سے اکتا گئے ایک تجویز یہ بھی پیش ہوئی۔ کہ حجاز میں جمہوری حکومت قائم کر دی جائے۔ بالآخر ۷ جولائی کو کانفرنس برخاست ہوئی اور طے پایا کہ ہر سال اسکے اجلاس ہؤا کرینگے۔ افسوس ہے کہ یہ کانفرنس جسکا قیام ایسی خوش آئند فضا میں ہؤا تھا۔ پھر دوبارہ منعقد نہ ہو سکی۔

کانفرنس کے نمائندے لطیف و نفیس نظریئے پیش کرتے رہے لیکن کسی اہم معاملہ پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ کانفرنس کی ناکامی نے ثابت کر دیا۔ کہ نجد کی فتوحات غیر عرب عناصر کے شور و غوغا اور بین الاقوامی جمہوریت کے خوش آئند خواب کیلئے زائل نہیں کی جا سکتیں۔ اور حجاز کی مقدس سرزمین کی حکومت اور اسکی ذمہ واریوں کے بار گراں کا متحمل صرف ابن سعود اور اسکے ارکانِ سلطنت کو ہونا پڑیگا۔ واقعہ یہ ہے کہ ابن سعود نے اس واضح حقیقت کو پیشتر سے ہی سمجھ لیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ اس نے علی رؤس الاشہاد جنوری ۱۹۲۶ء کو حجاز کی بادشاہت کو قبول کر کے نظامِ سلطنت کو جاری کر دیا تھا۔

---

(۳)

ابن سعود اور مصر کا مناقشہ

ابھی مکہ کانفرنس کے اجلاس ہو ہی رہے تھے۔ کہ ایک ایسا واقعہ رُونما ہؤا جس سے ثابت ہو گیا کہ ابھی وہابی اور عام مسلمانوں کا اتحادِ عمل ممکن نہیں۔ اور ضرورت ہے۔ کہ ابن سعود بلا شرکت غیرے حجاز پر حکومت کرے اس سال ۱۹۲۶ء میں حج وسط جون میں ہونا تھا۔ حجاج ہر روز ہزاروں کی تعداد میں آ رہے تھے۔ کہ مصر کا سرکاری قافلہ محمل لئے ہوئے پہنچا۔ ناظرین کو معلوم ہو گا۔ کہ ہر سال حج کے موقعہ پر مصری حکومت سپاہ کے ایک دستہ اور توپخانہ کی معیت میں محمل مکہ مکرمہ بھیجتی ہے۔ اس کے ساتھ حرم کعبہ کیلئے غلاف ہوتا ہے۔ آج سے کئی سو برس پیشتر ملکہ شجرۃ الدر والئے مصر و حجاز ہر سال محمل میں سوار ہو کر حج کیلئے آیا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ محمل مصری حاجیوں کا قومی نشان بن گیا۔ اور کئی سو برس تک قائم رہا۔

معمول یہ تھا کہ خطبۂ حج کے روز محمل کو وادئ عبطہ اور منا میں سے ہو کر جبل عرفات کو لیجایا کرتے تھے چنانچہ اس سال مصری محمل کو لیکر منا پہنچ چکے تھے۔ کہ اُنکے بعض ساتھی پیچھے رہ گئے۔ ہجوم بہت ہو رہا تھا۔ اس لئے پیچھے رہ جانے والوں کی توجہ کو منعطف کرنے کیلئے مصری سپاہ نے بگل بجایا۔ منا کی پہاڑیوں پر ہزاروں کی تعداد میں حاجی موجود تھے جنمیں بہت سے وہابی بھی تھے۔ یہ لوگ باجے کو ممنوع سمجھتے ہیں۔ حج کے موقعہ پر تو باجا گوارا ہی نہیں کر سکتے۔ جونہی کہ انہوں نے باجہ کی آواز سُنی۔ ان میں بعض لوگ مصریوں کے پاس جا پہنچے۔ ایک نجدی نے کہا۔ کہ محمل مصریوں کا بُت ہے اور مصری اُسکی پرستش باجے کے ساتھ کرتے ہیں۔ ایک نجدی نے ایک مصری کو سگریٹ پیتے ہوئے دیکھا۔ بعض نجدیوں نے برافروختہ ہو کر محمل پر پتھر اور کنکر مارے۔ اور لوگ بھی اُنکے ساتھ شامل ہو گئے۔ نقصِ امن کا احتمال ہو گیا۔ مصری سپاہ کے افسر نے اُن لوگوں کو منتشر کرنا چاہا لیکن انہوں نے توجہ نہ کی۔ اور سنگباری کرتے رہے۔ افسر نے مجبور ہو کر سپاہ کو حکم دیا۔ کہ گولی چلائیں۔ ہجوم کی کثرت تھی۔ ٢٥ آدمی اور ۴٠ گھوڑے ہلاک اور بہت سے آدمی مجروح ہوئے۔ ہجوم کی بھاگ دوڑ اور مجروحین کی آہ وفغاں سے شور وغوغا برپا ہو گیا۔ ارد گرد سے اخوان اور نجدی اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے آ گئے۔ ان لوگوں کے پاس رائفلیں موجود تھیں۔ انہوں نے مصریوں کو نرغہ میں لے لیا۔

تھوڑے فاصلہ پر ابن سعود کا خیمہ نصب تھا۔ اس نے جب شور وغل سنا۔ تو اپنے بیٹے شہزادہ فیصل کو بھیجا۔ کہ حالات دریافت کر کے سلطان کی خدمت میں عرض کرے۔ شہزادے نے بہت چاہا کہ فریقین راہِ راست پر آ جائیں۔ اور آمادہ فساد نہ ہوں۔ لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ مجبوراً اس نے سلطان کو پیغام بھیجا۔ کہ وہ خود موقعہ پر آ کر تدارک کرے۔ ابن سعود پیغام سُنتے ہی فوراً موقعہ پر پہنچا۔ گارڈ کے سپاہی ساتھ تھے۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ منا کی پہاڑیوں پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ پھر بھی نجدیوں نے اپنے سلطان کو پہچان لیا۔ اور راستہ چھوڑ کر احکام کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ سلطان ابن سعود مصری افسر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "تم نے کس حق سے گولی چلادی۔ واضح رہے کہ اس مملکت میں ایک حکومت قائم اور ایک قانون جاری ہے۔ میں بادشاہ ہوں۔ اگر تم مجھے اطلاع کر دیتے تو میں مناسب تدارک کر دیتا۔"

مصری افسر نے غصہ میں بھر کر جواب دیا "میں صرف جلالتہ الملک کے لحاظ سے محتاط رہا۔ ورنہ اس ساری بھیڑ کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا۔" ابن سعود نے یہ سُنکر اشتعال طبع پر مشکل سے قابو پایا۔ اور کہا۔ کہ تعلّی کا یہ موقعہ نہیں۔ یہ بلد الامین ہے۔ حکم ہے کہ یہاں کوئی آدمی مارا نہ جائے۔ تم ہمارے مہمان ہو۔ اور اس وقت ہماری

حمائیت میں ہو۔ ورنہ اس گستاخی کا مزہ چکھتے۔"

سلطان ابن سعود نے نجدیوں اور مصری سپاہ کے درمیان اپنی گارد کے جوان متعین کر دئے۔ اور شہزادہ فیصل اور حافظ وہبہ کو مناسب احکام صادر کر کے قیام امن کیلئے مامور کر دیا۔ اور خود خراماں خراماں قیامگاہ کو واپس ہُوا۔

مصری حکومت کو جب اطلاع ہوئی تو اس نے نہ باضابطہ معافی مانگی۔ اور نہ ہی نقصانات کی تلافی کی۔ ابن سعود بھی مستقل مزاجی سے اپنی بات پر اڑا رہا۔ وہ نہ چاہتا تھا کہ کوئی طاقت اس کے اختیارات شاہی میں مداخلت کرے۔ اور حجاز میں نقص امن کا باعث ہو۔

نتیجہ یہ ہے۔ کہ مصر کے تعلقات اس وقت تک حجاز سے کشیدہ ہیں۔ محمل کی دیرینہ بدعت رُک گئی ہے۔ مصری حکومت اب غلاف کعبہ کا اہتمام نہیں کرتی۔ اس کے بعد ایک دفعہ ابن سعود نے غلاف ہندوستان سے تیار کروا کر منگوایا تھا۔ لیکن اب کئی برس سے حجاز میں ہی غلاف تیار ہوتا ہے۔ مصری حاجی ابتک بلا روک ٹوک آتے ہیں۔ ان پر کوئی پابندی نہیں۔ لیکن مصری حکومت قدیم دستور کے مطابق اپنا قافلہ نہیں بھیجتی۔

تمام اسلامی حکومتوں میں صرف مصر ہی ہے۔ جس نے ابتک حجاز کے ساتھ مصالحانہ تعلقات پیدا نہیں کئے۔

باب بست و ہفتم

خارجی تعلقات۔ حجاز کیلئے دستور حکومت۔ فتوحات ملکی کے بعد کے حالات و کوائف

جدّہ میں جن حکومتوں کے نمائندے متعین تھے۔ انہوں نے حجاز کی نئی حکومت کے بارے میں جلد ہی اپنا طریق عمل وضع کر لیا بابت ۱۹۲۶ء کے موسم بہار میں چار حکومتیں یعنی انگلستان۔ فرانس۔ ہالینڈ اور امریکہ جن کے ماتحت کثیر تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ سلطان ابن سعود کو والئے حجاز تسلیم کر چکی تھیں۔ حجاج کا معتدبہ حصہ ہندوستان اور جزائر شرق الہند سے آتا ہے۔ اسلئے انگلستان اور ہالینڈ کے تعلقات ابن سعود کیلئے اقتصادی اعتبار سے

بھی باعث طمانیت تھے۔ اس قسم کے حالات میں باقی حکومتیں بھی حجاز کے ساتھ روابط قائم کرنے میں پیچھے نہ رہ سکتی تھیں چنانچہ ترکی بلجیم اور سوئٹزرلینڈ نے بھی ابن سعود کی آزادانہ حیثیت کو تسلیم کر لیا جرمنی سے بھی ۱۹۲۹ء میں سمجھوتہ ہو گیا۔ سب کے بعد وہ اسلامی حکومتیں جو کہ مخالفانہ رائے عامہ کی وجہ سے ابتک خاموش تھیں۔ حجاز کے ساتھ سیاسی تعلقات پیدا کرنے پر آمادہ ہوئیں۔ چنانچہ ایران نے سن ۱۹۳۰ء میں اور عراق اور یمن نے ۱۹۳۱ء میں اپنے نمائندے ابن سعود کے پاس بھیجدئے۔ اٹلی کا خیال یہ تھا کہ اس کا وہ معاہدہ جو یمن کے ساتھ ۱۹۲۶ء میں ہوا تھا۔ وہابیوں کے ساتھ باقاعدہ تعلقات کی راہ میں حائل ہے اور اسی خیال سے اٹلی نے فروری ۱۹۳۲ء تک حجاز کی جدید حکومت کو تسلیم کیا۔ اس وقت ان ممالک میں سے جس کے ساتھ حجاز کے مذہبی سیاسی یا اقتصادی اغراض و مقاصد وابستہ ہیں صرف مصر ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے ابن سعود کے ساتھ سیاسی تعلقات پیدا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

ابن سعود نے ستمبر ۱۹۲۶ء میں اپنے دوسرے بیٹے امیر فیصل کو انگلستان، فرانس اور ہالینڈ وغیرہ ممالک میں اظہارِ تشکر و امتنان کی غرض سے بھیجا۔ یہ شہزادہ ۱۹۱۹ء میں بھی یورپ جا چکا تھا۔ اس وقت تک سلطان ابن سعود اندرون عرب کے ایک معمولی امیر کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن اب وہ جزیرۃ العرب میں سب سے بڑی طاقت بن گیا تھا۔ اس وقت اس کے سیاسی تعلقات دنیا بھر کی مہذب اور متمدن حکومتوں سے وابستہ تھے۔

جدہ کا انگریزی کونسل شہزادہ کو ساتھ لیکر ۲۳ ستمبر کو عبداللہ الدملجی وزیر خارجہ کی معیت میں لندن پہنچا۔ مسٹر جارڈن بھی ہمراہ تھا۔ شاہ معظم جارج پنجم نے نائٹ کمانڈر آف دی آرڈر آف سینٹ میکائل کا اعزازی خطاب شہزادہ کو عطا فرمایا۔ اور بنفس نفیس بکنگھم پیلس میں ملاقات کی۔ تین ہفتہ تک شہزادے کا قیام انگلستان میں رہا۔ شہزادہ لندن سے ہالینڈ گیا جہاں ملکہ ولہلمانے اس کا استقبال کیا۔ اسی طرح پر جب شہزادہ پیرس پہنچا۔ تو جمہوریت فرانس کے صدر نے خوش مقدم کیا۔ شہزادہ مغربی حکومتوں کی مہمان نوازی کے لطف اُٹھا کر ۲۹ اکتوبر کو مارسیلز کے مقام پر جہاز میں سوار ہوا۔ اور قاہرہ ہوتا ہوا ۱۹ نومبر کو جدہ پہنچ گیا اس وقت تک شہزادہ فیصل تین مرتبہ یورپ کی سیر کر چکا ہے۔ اور آل سعود میں سے پہلا شخص یہ ہے جس نے یورپ کی سیر کی ہے۔ اس کا بڑا بھائی شہزادہ سعود صرف ایک مرتبہ قاہرہ کی سیر کر آیا ہے امسال یورپ بھی گیا ہے۔ سلطان ابن سعود کبھی حدود عرب سے باہر نہیں گیا۔ شہزادہ فیصل نہایت بارعب جیہہ اور خوش اندام ہے۔ اور یورپ کے اکابرین اسکے وسیع اخلاق اور عظیم عقل و دانش سے بہت محظوظ ہوئے

ہیں۔ شہزادہ نے یورپ کی سیر سے طرح طرح کے معلومات اخذ کئے ہیں۔ چنانچہ ہوائی جہازوں کی جی بھر کر سواری کی۔ اور فنی اور علمی انکشافات سے خوب لطف اندوز ہوا۔ لیکن گو شہزادہ مغربی تمدن اور معاشرت کے معلومات اور گوناگوں سیاسی تخیلات لیکر واپس آیا۔ اسکے ورود کے سیاسی نتائج چنداں قابل ذکر نہیں۔ البتہ اتنی بات سچ بھی ثابت ہوگئی۔ کہ متعدد معاہدات جو مختلف مغربی حکومتیں ابن سعود کے ساتھ کر چکی تھیں۔ بوسیدہ اور بیکار ہو چکے ہیں۔ اور نئے حالات و کوائف کی روشنی میں جدید معاہدات ناقابل گریز ضرورت ہیں۔

جونہی کہ شہزادہ یورپ سے واپس آیا۔ انگریزی کونسل متعینہ جدہ نے جدید معاہدہ مرتب کرنے کے خیال سے وہابی حکومت کے ساتھ سیاسی گفت و شنید شروع کی۔ برٹش کونسل کے ساتھ مسٹر جارج انٹیونس حکومت فلسطین کے ایک رکن تھے چونکہ ۱۹۲۵ء میں بحرہ اور جدہ کے معاہدات کے سلسلے میں سر گلبرٹ کلیٹن کے ہمراہ آئے تھے۔ ہر دو اصحاب کی ملاقات سلطان ابن سعود کے ساتھ ابیار ابن حسنی نامی مقام پر جو رابغ اور مدینہ کے درمیان ہے۔ ہوئی۔ متعدد تصفیہ طلب امور پر فریقین میں بحث و تمحیص ہوئی۔ یہ امور سیاسی تجارتی اور مذہبی نوعیت کے تھے۔ لیکن غور و خوض کے باوجود اطمینان بخش تصفیہ نہ ہو سکا۔ دوران گفتگو میں ایسے سوالات در پیش ہوئے جن کے متعلق حکومت انگلشیہ کے نمائندوں کو کوئی ہدایات نہ ملی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہابیوں میں عام خیال پیدا ہو گیا۔ کہ اگر انگریزی حکومت کو جدید معاہدہ کرنا منظور ہے۔ تو اُسے کسی با اختیار اور عالی رتبہ سفیر کو بھیجنا چاہیئے۔ بالآخر وسط دسمبر میں گفت و شنید منقطع ہو گئی۔ اور چند ہفتوں کے بعد دوبارہ شروع ہوئی۔

اس درمیانی عرصہ میں سلطان ابن سعود کو اپنی وسیع مملکت میں دورہ کرنے کا وقت مل گیا۔ اخوان نے حجاز میں کامل امن و امان پیدا کر دیا تھا۔ اور اس قسم کی فضا تیار ہو گئی تھی۔ کہ وسیع اور پائیدار حکومت قائم ہو سکے۔ حجاز کی مقدس سرزمین کے باشندے ابن سعود کی عظیم شخصیت سے مرعوب ہو چکے تھے۔ اور بغاوت اور سرکشی کا کوئی احتمال باقی نہ رہا تھا۔ عارضی حکومت جو سلطان نے حال ہی میں قائم کی تھی۔ کامیابی سے چل رہی تھی۔

حجاز مقدس کی تاریخ میں ۱۹۲۶ء کا سال ہمیشہ تک یاد رہیگا۔ کیونکہ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ اسی سال میں اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلامیانِ عالم کا بے نظیر اجتماع ہوا۔ اور اس سے پیشتر اور بعد سلطان ابن سعود نے بہت سے کام حجازیوں کی منفعت اور بہبود کیلئے کئے۔ سلطان کا ارادہ شروع ہی سے یہ تھا۔ کہ

حرمین الشریفین فواحش اور خرافات کی آلائشوں سے پاک کردئے جائیں ۔ سلطان نے غیر مبہم اور صریح الفاظ میں حتمی وعدہ کر دیا تھا ۔ کہ حجازیوں کے حقوق کی کامل نگہداشت کی جائیگی ۔ اور انہیں حکومت میں شامل کر لیا جائیگا اس وعدہ کی تکمیل کے سلسلے میں اس نے ۱۹۲۶ء کے موسم بہار میں مکہ مکرمہ ۔ مدینہ منورہ ۔ جدہ ، ینبوع اور طائف کے شہروں میں پانچ مشاورتی کونسلیں قائم کیں ۔ اور پورے حجاز کے لئے ایک علیحدہ کونسل قائم کی جسکے بیشتر ارکان شہری اور صحرائی آبادی میں سے منتخب ہوئے تھے ۔ لیکن ان کونسلوں کے صدر حکومت کی طرف سے نامزد کر دئے گئے تھے ۔

ناظرین کو اتنی بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہئیے ۔ کہ ابن سعود نے ان مجالس کے انعقاد اور قیام میں سراسر مغربی حکومتوں کے انداز کی تقلید نہیں کی تھی ۔ ظاہر ہے کہ عرب کی آبادی جو کہ تعلیم اور سیاسی تربیت اور ذمہ واری کے لحاظ سے پسماندہ ہے ۔ یورپ کی جمہوریت کے اصولوں پر پورے طور سے کاربند نہیں ہو سکتی تھی ۔ البتہ حجاز کے اہل الرائے اصحاب کو مشورہ دینے کا حق دیدیا گیا ۔

حجاز اور نجد کے حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ نجد میں نہ کوئی دیوان ہے ۔ نہ دفاتر ہیں ۔ علیحدہ علیحدہ شعبہ جات کیلئے وزارت اور تخمینہ جات آمد و خرچ کا بھی کوئی سلسلہ نہیں ۔ پوری حکومت خود سلطان کی ہاتھ میں ہے ۔ وہ جسکو چاہتا ہے ۔ حکومت کے کام اور مناصب سپرد کر دیتا ہے ۔ لیکن حجاز کیلئے یہ صورت حالات ممکن نہیں تھی ۔ وہاں دفاتر اور الیوان ہائے وزارت کے بغیر چارہ نہیں ۔ لیکن پھر بھی سلطان ابن سعود نے حجاز کی حکومت کی پوری باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھی ۔ البتہ جنوری ۱۹۲۶ء میں مذکورہ بالا مشاورتی مجلس قائم کر دی گئی ۔ جو اکاون ۵۱ ارکان پر مشتمل تھی ۔ اور جس میں سنتالیس ۴۷ حجازی اور تین نجدی اکابرین تھے ۔ شہزادہ فیصل سلطان کا دوسرا بیٹا اس مجلس کا صدر مقرر ہوا ۔ اگست ۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود نے حجاز کیلئے دستور حکومت مرتب کر دیا ۔ جو کہ اسی مہینہ کی ۲۹ تاریخ کو ام القریٰ مکہ مکرمہ کے سرکاری اخبار میں شایع کر دیا گیا ۔ اس دستور کی رو سے حجاز کی حکومت شرعی بنیادوں پر قائم کی گئی ۔ اور سلطان خود شریعت کا خادم اور کارندہ قرار پایا ۔ اس آئین کے بعض ضمنات کا خلاصہ درج ذیل ہے ۔

۱ ۔ حجاز ہمیشہ ایک مملکت رہیگا ۔ اور مختلف حصوں میں تقسیم نہ ہو سکیگا ۔ اور اپنے داخلی اور خارجی امور میں کامل طور پر آزاد ہوگا ۔ مکہ مکرمہ اس کا صدر مقام رہیگا ۔ اور عربی سرکاری زبان ہوگی ۔ حکومت کا مذہب اسلام اور قانون شریعت حقہ اسلامیہ ہوگا ۔ ابن سعود اور اسکے جانشین حجاز کے بادشاہ ہونگے اور مجلس عام

مذکورہ بالا کے مشورات کے مطابق حکومت کریں گے۔

۲۔ ملک کی پوری حکومت جلالتہ الملک سلطان عبدالعزیز ابن عبدالرحمن کے ہاتھ میں ہوگی جو کہ قرآن و سنت اور اجتہاد صحابہ کرام کے مطابق شریعت اسلامیہ کو نافذ کریگا۔ پادشاہ حجاز کیلئے حاکم اعلیٰ اور مختلف شعبہ جات کیلئے حکام نامزد کریگا۔ مختلف شعبہ جات کے ارکان حاکم اعلیٰ کے روبرو کارگردگی کیلئے ذمہ دار ہونگے اور حاکم اعلیٰ بادشاہ کے سامنے جوابدہ ہوگا۔

۳۔ حکومت کے چھ شعبہ جات حسب ذیل ہونگے۔ دینیات۔ محکمہ داخلہ۔ امور خارجہ۔ مالیات۔ تعلیمات اور محکمہ جنگ

۴۔ مکہ مکرمہ میں ایک انتظامی مجلس اعلیٰ قائم کی جائیگی جس میں حاکم اعلیٰ اور چھ قابل اور کارکن ارکان شامل ہونگے۔ مدینہ منورہ اور جدہ میں بھی ایک ایک مجلس انتظامیہ منعقد ہوگی۔ ہر محکمہ اور ہر قبیلہ کیلئے اپنی اپنی مجالس ہونگیں۔ جو کہ صدر مجلس کے ماتحت سمجھی جائیں گی۔

ظاہر ہے۔ کہ اس آئین میں جہاں جملہ اختیارات بادشاہ کو تفویض کر دئے گئے وہاں عوام کی بھی معقول نمائندگی کر دیگئی۔ اس طرح پر جمہوریت کا افتتاح ہوگیا۔ لیکن انتظام سلطنت آبادی کی ذہنی اور اخلاقی حالت کے مطابق کیا گیا۔ تاکہ انتظام معقول اور حکومت خوشگوار اور پائیدار ہو۔

نجد اور حجاز کی وسیع مملکت میں سلطان ابن سعود کیلئے جملہ معاملات کو تن تنہا سر انجام دینا ممکن نہ تھا۔ تقسیم کار اور سہولیت کی غرض سے اس نے اپنے ولیعہد سعود کو نجد کا حاکم اعلیٰ مقرر کر دیا۔ اسی طرح پر فیصل کو حجاز کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا گیا تھا۔ نجد کے مقابلے میں حجاز کی حکومت نسبتاً مشکل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں سلطنت کے خارجی معاملات وہیں طے ہوتے ہیں۔ حجاز کی آبادی بھی نسبتاً زیادہ متمدن ہے۔ اور قدیم بدوی طرز کی نجدی حکومت کو گوارا نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ حجاز میں حاکم اعلیٰ کی امداد کیلئے دو مجالس منعقد کیگئیں ایک مجلس مشاورت ایک مجلس انتظامی اول الذکر کے متعلق اوپر بیان ہو چکا ہے۔ انتظامی مجلس ۸ ارکان پر مشتمل ہے۔ پانچ ارکان مکہ مکرمہ سے منتخب ہوتے ہیں۔ ایک ایک ینبوع اور طائف کے اور تین تین ارکان مدینہ اور جدہ کے ہیں اس مجلس کا صدر سلطان کی طرف سے نامزد ہوتا ہے۔

اس مجلس کے اجلاس ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ حجاز کی وزارت میں حاکم اعلیٰ وزیراعظم اور وزیر داخلیہ کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ وزیر مالیات اور دیگر وزرا علیحدہ ہیں۔ ان مجالس کے متعلق دو باتیں قابل غور ہیں

ایک تو یہ کہ افواج کا پورا انتظام اور اختیار سلطان کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس بارے میں رائے عامہ کو دخل نہیں
کیونکہ ایشیا اور افریقہ میں حکمران کا جاہ و وقار افواج کے اختیار کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اسلئے فوج کے متعلق
یہ خصوصیت مشرق کے تمام ممالک میں ہے۔ دوسری بات یہ ہے۔ کہ ملک کی وسعت کے اعتبار سے مجالس
کے ارکین کی تعداد کم رکھی گئی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ ملک عرب میں تعلیم یافتہ اور کار آزمودہ اشخاص کی
بیحد قلت ہے۔ ابن سعود نے اس وقت کا علاج یہ کیا ہے۔ کہ عربی ممالک سے قابل اشخاص اپنی ملازمت
میں لے لئے ہیں۔ ابن سعود کا پہلا وزیر امور خارجیہ ڈاکٹر عبداللہ دالمجی ایک عراقی تھا۔ جو کہ ۱۹۲۸ء سے حکومت
عراق میں بحیثیت ایک رکن کے کام کر رہا ہے۔ اسکے ملازمت ترک کر دینے پر شیخ فواد حمزہ وزیر خارجیہ مقرر
ہوا۔ یہ شخص ملک شام کے صوبہ لبنان کا باشندہ ہے۔ اس طرح پر ایک اور شخص جو سعودی حکومت میں مختلف
اعلے اور ذمہ وار عہدوں پر ممتاز رہا ہے۔ شیخ حافظ وہبہ ہے۔ وہ مصر کا رہنے والا ہے۔ اور ۱۹۳۰ء سے سلطان
ابن سعود کی طرف سے لندن میں سفیر خاص ہے۔ یہ لوگ قابل قدر شخصیت۔ اور عظیم قابلیت رکھتے ہیں۔
لیکن پھر بھی ضروری ہے۔ کہ اہالیان نجد اور حجاز کو علوم و فنون جدیدہ کی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کر کے حکومت
کے اعلے مناصب پر سرفراز کیا جائے۔ اور عرصہ تک غیر ملکی عناصر پر اعتماد نہ کیا جائے۔ جبتک سلطان خود
بقید حیات ہے۔ نگاہیں اسی کی جانب اٹھتی ہیں اور اہم معاملات اسی کی رائے سے فیصل ہوتے ہیں۔
بلکہ قابل ملکی اشخاص کے فقدان کی وجہ سے سلطان کے ذاتی اقتدار اور رسوخ میں دن بدن اضافہ ہوتا ہے
لیکن اسکی زندگی کے بعد سعودی حکومت کے قیام اور استحکام کیلئے نہایت ضروری ہے۔ کہ نجد اور حجاز کے
باشندے کثیر تعداد میں زیور تعلیم سے مزین ہو کر انتظام و انصرام معاملات کی قابلیت اور استعداد پیدا کریں
اور اپنی حکومت کے بار گراں کو اپنے کندھوں پر اٹھائیں۔

اندرونی معاملات کے علاوہ بیرونی امور پر بھی ابن سعود کی توجہ برابر رہی۔ یورپ کی حکومتوں کیساتھ
تعلقات اور روابط پیدا کرنیکے علاوہ سرحد کے متعلق بھی بعض تنازعات اس کے پیش نظر تھے معان اور
عقبہ کا معاملہ ابھی تصفیہ طلب تھا۔ سوال یہ تھا کہ آیا والی اس ولائت کی ریاست شرق اردن کے ساتھ
وابستگی قبول کر لیں یا نہ جنوب مغرب میں یمن کا معاملہ در پیش تھا۔ یمن اور حجاز کے درمیان صوبہ عسیر واقعہ
ہے۔ وہاں کا حاکم ادریسی کے لقب سے مشہور و معروف ہے۔ ادریسی عرب کا پہلا حکمران تھا۔ جو جنگ
عظیم میں اتحادیوں کی جانب سے شامل ہوا۔ اس جنگ میں شرکت کیوجہ سے ادریسی اپنے تئیں ایک طاقت

سمجھنے لگا جنگ کے اختتام پر ادریسی نے یمن کے بعض علاقوں کو دبالیا۔ امام یحییٰ والئے یمن جو کہ طاقت ور فرمانروا ہے۔ ادریسی کی اس زیادتی کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۶ء کے اوائل میں اُس نے عسیر کے جنوبی علاقہ کو جو تہامہ کے نام سے موسوم ہے۔ قبضہ کر لیا۔ ہدیدہ اور لیہہ نامی دو منفعت بخش بندگاہیں اس علاقہ میں واقعہ تھیں۔ امام یحییٰ نے صرف اسی پر قناعت نہ کی۔ بلکہ اور بڑھکر صابیہ اور خبران نامی دو مشہور قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔

ادریسی حاکم عسیر یمن کی زیدی افواج کے مقابلے کی تاب نہ لاسکا۔ مجبور ہو کر ابن سعود سے مدد کا خواہاں ہوا۔ ابن سعود عسیر کی مدد کیلئے مستعد نہ تھا لیکن سوال یہ تھا۔ کہ اگر عسیر اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکے تو کیا یمن کو اس علاقے پر قبضہ کر لینے دیا جائے۔ ظاہر تھا کہ عسیر اپنی آزادانہ حیثیت قائم نہ رکھ سکتا تھا۔ اسلئے لازمی تھا۔ کہ یا تو یمن اس صُوبہ پر قبضہ کر لے۔ یا ابن سعود اس کو فتح کرے۔ عسیر کیلئے بہر کیف ماتحتی اور لاچاری کے سوا چارہ نہ تھا۔

آخر کار نجد اور عسیر کے درمیان ایک معاہدہ کی رُو سے ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو اس طرح پر تصفیہ ہو گیا۔ کہ جس قدر علاقے پر یمن کی زیدی افواج قابض تھیں۔ امام یمن کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا۔ لیکن جو علاقہ فی الواقع ادریسی والئے عسیر کے ہاتھ میں تھا۔ اسکو سلطان ابن سعود نے اپنے ظلِ حمایت میں لے لیا۔ انہی ایام میں یمن نے اٹلی کے ساتھ ایک مخصوص معاہدہ کر لیا۔ جسکی رُو سے یمن کو اٹلی کی جانب سے عسکری امداد کا یقین دلا دیا گیا۔ امام یحییٰ والئے یمن نے شروع میں ہاتھ پاؤں تو مارے۔ لیکن پھر بھی عسیر اور نجد کے معاہدہ کی صریح خلاف ورزی نہ کی۔ بلکہ عسیر کے مزید علاقہ جات پر جارحانہ کارروائی چھوڑ دی۔ بعد میں تو ابن سعود اور امام یحییٰ کا معاہدہ بھی ہو گیا اور ایک عرصہ تک دونوں کے تعلقات مصالحانہ رہے۔ اس عرصہ میں جبکہ سلطان ابن سعود سرحدی علاقوں کے مخمصے میں پھنسا رہا۔ اور پیچ در پیچ معاملات کو نپٹاتا رہا اور اسلامی اقوام کو مصالحت و مفاہمت اور رواداری سے مطمئن کرتا رہا۔ نجد کے تنگ دل اور بدگمان وہابی اس کے متعلق دل میں شکوک و شبہات کو جگہ دیتے رہے۔ ناظرین کو معلوم ہے کہ وہابی بالطبع اور اپنے معتقدات کی رُو سے نکتہ چینی اور رائے زنی کے بارے میں بڑے بیباک واقع ہوئے ہیں۔ وہابی علماء موجودہ تہذیب و تمدن کی جاذبیت کو جانتے تھے اور سمجھتے تھے۔ کہ ممکن ہے کہ ابن سعود نجد کی سادہ معاشرت اور اہالیان نجد کی خشک دماغی اور فرسودہ مزاجی کے مقابلے میں مکہ مکرمہ کی متمدن اور پُر لطف زندگی اور اہالیان

حجاز کی خوش اخلاقی اور نرم روی کو ترجیح دینے لگے۔ اور ریاض کی بجائے مکہ مکرمہ کو دارالسلطنت قرار دے کر وہیں مستقل سکونت اختیار کرلے۔ نجدی مقامی جذبات کے ماتحت حجاز کی کسی برتری اور تفوّق کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ ابن سعود کی سلطنت کا قیام اور استحکام نجدی علماء کی عصبیت اور جوش اور نجدی سپاہیوں کی شجاعت و بسالت پر منحصر ہے۔ غیر ملکی عناصر کی شمولیت سلطنت کے ضعف و اضمحلال کا پیش خیمہ ہے۔ ناظرین کو معلوم ہے۔ کہ فتح حجاز کے بعد سلطان ابن سعود نے مصلحت کے لحاظ سے نجد کے اخوان عنصر کو وہاں سے واپس کر دیا تھا۔ وہابی حیران تھے۔ کہ فاتحین کی اس جماعت کو کیوں فتوحات سے متمتع نہیں ہونے دیا گیا۔ اس قسم کی متعدد باتوں سے طرح طرح کے شکوک تھے۔ جو کہ وہابیوں کے دل میں ابن سعود کے خلاف موجزن تھے۔

بالآخر ان شکوک و شبہات نے عملی صورت اختیار کرلی ۱۹۲۶ء کے موسم خزاں میں مطیر اور عتیبہ کے قبائل نے بعض مطالبات سلطان ابن سعود کی خدمت میں پیش کئے۔ ان مطالبات کی غرض و غائیت یہ تھی کہ وہابیوں کو اسلامی اور غیر اسلامی تمام اغیار کے خلاف جہاد کرنے کی اجازت مرحمت ہو۔ اور مغربی علوم و فنون اور معاشرت تمدن کی جس قدر بدعتیں مثلاً موٹر کار ٹیلیفون تار اور ہسپتال وغیرہ حجاز میں رائج ہو گئی ہیں یکبارگی قلم دُور کر دی جائیں۔

غرض یہ ہے۔ کہ رفتہ رفتہ نجدی و غیر نجدی کا سوال پیدا ہو گیا۔ ضرورت تھی کہ ابن سعود منافرت اور تفریق کے جذبات کو زائل کرتا چنانچہ جب انگریزی نمائندوں کے ساتھ آواخر ۱۹۲۶ء میں سیاسی گفت و شنید منقطع ہوئی۔ تو ابن سعود نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور ریاض کی طرف رخ کیا جونہی کہ وہ ریاض پہنچ گیا۔ اس کا پہلا اثر وسوخ عود کر آیا۔ اور گردو نواح سے وہابی جوق در جوق اسکے پاس آنے اور اظہار اطاعت کرنے لگے جنوری ۱۹۲۷ء میں نجد کے اکابرین و عمائد کا ریاض میں ایک عظیم اجتماع ہوا جس میں سلطان عبدالعزیز ابن سعود کو بادشاہ نجد و ملحقات کا خطاب دیا گیا۔ اس طرح پر ابن سعود حجاز اور نجد کی دو مملکتوں کا بادشاہ بن گیا۔

محض بادشاہت کے اعزاز سے نجد کے مسائل کا تصفیہ ممکن نہ تھا قبائل مطیر اور عتیبہ کے مطالبات ابن سعود کے پیش نظر تھے۔ غور و تعمق کے بعد اس نے یہ مطالبات علمائے کرام کے پاس استفتا کی غرض سے بھیجے۔ غرض یہ تھی کہ عوام علمائے دین کے فتویٰ کی پابندی کرینگے۔ سب سے بڑے مسائل جہاد اور

مغربی ایجادات کے بارے میں تھے۔ علماء نے باہمی مشورے اور بحث و تمحیص کے بعد فتویٰ دیا۔ کہ جہاد کا اعلان امام اور امیر کے خاص اختیار میں ہے۔ اور اسکے حکم کے بغیر جہاد جائز نہیں۔ مغربی ایجادات کے متعلق انہیں وافی معلومات نہ تھے۔ اسلئے فتویٰ نہ دے سکے۔ علمائے کے فتوے ابن سعود کی سیاست کے عین مطابق تھے کیونکہ انکی رو سے جہاد کا حق صرف اسے دیا گیا۔ اس طرح پر ہمسایہ ممالک کے ساتھ اخوان کی یورشوں کیوجہ سے پیچیدگیاں پیدا ہونے کا احتمال کم ہو گیا۔ دوسرے انتظام سلطنت کی سہولت کیلئے مغربی ایجادات سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ہاتھ آیا۔ گو فیصل الدویش کی بغاوت سے بعد میں یہ ثابت ہو گیا۔ کہ اخوان کا ایک مختصر حصہ علمائے دین کے فتووں کا احترام نہیں کرتا۔ لیکن نجد کی کثیر آبادی نے آمنا و صدقنا کہا اور مطمئن ہو گئی۔

حج کے ایام قریب تھے۔ انگریزوں سے بھی گفت و شنید شروع ہونے والی تھی۔ اس لئے ابن سعود نے نجد کے امن و امان اور سکون کو دیکھکر حجاز چلے جانے میں باک نہ دیکھا۔ وہاں پہنچتے ہی انگریزوں کے ساتھ سیاسی مفاہمت شروع ہوئی۔ انگریزی حکومت نے وہابیوں کے رویہ کو دیکھکر سر گلبرٹ کلیٹن کو بھیج دیا تھا۔ صاحب موصوف کے تعلقات ابن سعود کے ساتھ بہت خوشگوار تھے۔ اور اس کا ثبوت ۱۹۲۵ء کے معاہدہ میں بحرہ کے مقام پر ہوچکا تھا۔ فریقین کے مابین گفت و شنید مصالحانہ پیرایہ میں جاری ہوئی۔ اور ۲۰ مئی ۱۹۲۷ء کو معاہدہ جدہ مرتب ہو گیا۔ اس معاہدہ کی باقاعدہ تصدیق ۱۷ ستمبر ۱۹۲۷ء کو ہو گئی۔

اس معاہدہ کی میعاد سات برس تھی۔ اسکی تمہید میں یہ بات تسلیم کر لیگئی۔ کہ ۱۹۲۵ء کے معاہدہ کے بعد عرب کے سیاسی حالات و کوائف میں اس قدر تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ کہ جدید معاہدہ کی ضرورت ہے جس میں ابن سعود کی آزادانہ حیثیت کو باقاعدہ طور پر تسلیم کیا جائے۔ یہ معاہدہ فریقین کی کلی مساوات کی بنا پر کیا گیا۔ انگریزی حکومت نے وہابیوں کی نئی فتوحات کو تسلیم کیا۔ فریقین نے عہد کیا کہ وہ اپنی اپنی رعیت کو ایک دوسرے کے ملک پر حملہ آور نہ ہونے دینگے۔ ابن سعود نے انگریزی رعایا کے حاجیوں کو وہی مراعات دینے کا وعدہ کیا جو کہ اور حاجیوں کو دی جائیں گی۔ انگریزوں نے اقرار کیا کہ نجد اور حجاز کی رعایا کی جب کہ وہ انگریزی حکومت کی حدود میں قیام پذیر ہونگے۔ جداگانہ حیثیت کو تسلیم کیا جائیگا۔ اس طرح سے سعودی حکومت نے برٹش قومیت کو اپنے علاقے میں تسلیم کرنے کا حتمی وعدہ کیا۔ ابن سعود نے عہد کیا۔ کہ ان عرب امرا اور شیوخ کے ساتھ جو انگریزی حمایت میں ہیں وہ دوستانہ تعلقات قائم رکھیگا۔ اور کبھی حملہ آور نہ ہوگا۔ ابن سعود نے اقرار کیا۔ کہ وہ اپنی مملکت میں غلامی کا کامل انسداد کر دیگا۔ اس معاہدہ کے ساتھ سر گلبرٹ کلیٹن اور ابن سعود کے مابین سیاسی خط و کتابت ہوئی اور مصرحہ ذیل

امور کے متعلق مفاہمت ہوئی۔

سر گلبرٹ کلیٹن نے ایک یادداشت تحریر کی تھی۔ کہ عقبہ اور معان حجاز کا حصہ نہیں بلکہ شرق یردن کی امارت میں شامل ہیں۔ ابن سعود نے اس بات کو صحیح تسلیم کیا لیکن اس مسئلہ کا پھر کسی موقعہ پر تصفیہ کرنے کیلئے رضامند ہو گیا اس دوران میں اس ولایت کا انتظام حسب دستور سابق رہیگا۔

دوسری یادداشت یہ تھی۔ کہ حسب دستور سابق کچھ عرصہ اور زنگ انگریزی کونسل کو اختیار ہوگا۔ کہ غلامی کی روک تھام کیلئے مناسب کاروائی عمل میں لائے۔

یورپ کی طاقتیں کسی معاہدہ کی رُو سے ممالک عرب میں اسلحہ جنگ کی فراہمی میں مانع ہوتی تھیں تیسری یادداشت میں انگریزوں نے اس پابندی کو دُور کر دیا۔ اس تصفیہ کی رُو سے ابن سعود کو حق حاصل ہو گیا۔ کہ انگریزوں کے جس کارخانے سے جس مقدار میں چاہے۔ اسلحہ جنگ اور گولہ بارُود خرید لے۔

ناظرین پر واضح ہو گیا۔ کہ سنہ ۱۹۲۷ء کا نصف اوّل سلطان ابن سعود کیلئے بہر کیف مبارک زمانہ تھا مملکت سعودیہ میں اس وقت کامل امن وامان قائم تھا۔ نجدی وہابیوں کے شکوک وشبہات زائل ہو چکے تھے۔ انگریزی حکومت کے ساتھ جس کو جزیرۃ العرب میں بہت کچھ اثر ونفوذ حاصل ہے۔ نہایت اطمینان بخش معاہدہ ہو گیا تھا جس میں ابن سعود اور حکومت سعودیہ کی آزادانہ حیثیت کو نہایت شاندار اور غیر مبہم الفاظ میں تسلیم کیا جا چکا تھا۔

اس اطمینان بخش معاہدہ کے انعقاد کے مختلف وجوہات تھے۔ جن میں چند حسب ذیل ہیں:

۱۔ سلطان ابن سعود نے پچھلے چند سال کے عرصہ میں غیر معمولی قوّت حاصل کر لی تھی۔ حجاز اور عسیر کی فتح کے بعد وہ عرب کا ایسا طاقتور حکمران بن گیا تھا۔ کہ برطانیہ اس کو بآسانی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اگر برطانیہ اس کی آزادانہ حیثیت کو کھلے الفاظ میں تسلیم نہ کرتا تو اُسکے بہت سے تجارتی اور سیاسی مفاد کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ حکومت انگریزی مجبور ہو گئی تھی۔ کہ اسکے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرے۔ ورنہ اپنی دیرینہ آرزوؤں کو خاک میں ملا دے۔ سلطان کو ناراض کرنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا۔ کہ وہ اردگرد کے علاقوں پر ہاتھ صاف کرتا یمن کے سوا یہ تمام علاقے یا تو انگریزی حمایت میں ہیں۔ یا ان کے زیر اثر ہیں۔ اتنے وسیع علاقے کی حفاظت کے لئے بھاری فوج رکھنی پڑتی تھی۔ اور کثیر مصارف برداشت کرنے پڑتے تھے اس لئے برطانیہ نے مناسب سمجھا کہ اس قدر زحمت اُٹھانے سے بہتر یہی ہے۔ کہ ابن سعود کی طرف دوستانہ ہاتھ بڑھایا جائے۔ اس

سے تعلقات خوشگوار رکھے۔ اور اسکی کامل خودمختاری کے خلاف کوئی جذبہ ظاہر نہ ہونے دے۔

۲۔ جنگ عظیم کے بعد مفتوحہ ممالک کے بیشتر حصہ پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ اور مقابلتہً فرانس کو بہت کم حصہ ملا تھا۔ اسلئے فرانس اور برطانیہ میں رقابت کے تلخ جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ فرانس عربی ممالک میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا کر انگریزوں سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ برطانیہ نے محسوس کرلیا تھا۔ کہ اگر اُس نے اس موقعہ پر ذرا سی بھی غفلت کی تو بہت ممکن ہے۔ فرانس اُس پر بازی لے جائے۔

۳۔ بولشویک رُوس نے اس زمانے میں عرب کے معاملات سے اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا تھا اُن کا ارادہ تھا۔ کہ سرمایہ داری اور استعمار کے خلاف دعوت کا ایک مرکز حجاز میں قائم کردیا جائے۔ تاکہ وہاں سے ان خیالات کی اشاعت دنیا بھر کے مسلمانوں میں ہو سکے۔ معلوم ہے کہ برطانیہ اس وقت رُوس سے بیحد خائف تھا۔ رُوس کا یہ ارادہ معلوم کر کے اُس نے سر توڑ کوشش شروع کی۔ کہ دوستانہ معاہدہ منعقد ہو جائے۔

اسی سال کے دوسرے نصف میں حج ہُوا۔ اور بہت کامیابی سے ہُوا۔ مخالفین کے مخالفانہ پروپیگنڈا کے باوجود حجاج کی اس قدر کثرت تھی۔ کہ ایک عرصہ سے کبھی نہ ہوئی تھی۔ عام افواہ تھی۔ کہ ابن سعود اور یمن کے مابین جنگ ہونے والی ہے۔ مصری حکومت نے محمل اور غلاف کعبہ بھیجنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ لیکن حکومت سعودیہ کے نئے انتظامات۔ امن و امان۔ طبی امداد کی فراہمی اور وسائل نقل و حرکت کی فراوانی اور اجناس و اذخار کی کثرت کیوجہ سے دُنیا کے ہر حصے سے حاجی کثیر تعداد میں آئے۔ اور حجاز کی موجودہ حالت سے خوش و خرّم اور مطمئن ہو کر گئے۔ حاجیوں نے حکومت کی خوش انتظامی اور رواداری اور امن و امان کی روایات دنیا بھر میں پھیلادیں۔ اور ابن سعود کی شہرت میں بیحد اضافہ ہُوا۔

اتنی بات کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ حج کی کامیابی کیوجہ سے حجاز کی اقتصادی حالت پر بہت خوشگوار اثر پڑا۔ آبادی کا بیشتر حصہ مرفّہ الحال اور آسودہ ہوگیا۔

باب بست و ہشتم

(۱)

حجاز کی سابق حالت

سلطان ابن سعود کی دس سالہ اصلاحات کی ہمہ گیری اور وسعت سمجھنے کیلئے نہائیت ضروری ہے کہ حجاز کی سابق حالت کا مختصر سا خاکہ کھینچ دیا جائے۔ اس اجمال کی تفصیل کیلئے جلدیں درکار ہیں۔ اسلئے ناگزیر ہے۔ کہ چند اصولی باتیں نہائیت اختصار سے بیان کردی جاویں۔

حرمین الشریفین کے باشندے بالکل جاہلیت میں پڑے ہوئے تھے۔ اور اسلام اور اسکی حقیقی رُوح سے بہت دُور تھے۔ امن و امان مفقود تھا قتل وجرائم بہت بڑھ گئے تھے۔ غارت گری عام تھی۔ عام آبادی کی اخلاقی حالت بیحد پست تھی۔ آداب و اخلاق سے بے بہرہ تھی۔ لوگ مذہب کے ضروری اور اصولی امور کو فروگذاشت کرتے تھے۔ اور فروعی باتوں پر مصّر تھے۔ ان کے آباؤاجداد جب اسلام کے عقائد و جذبات سے سرشار اور زیور اخلاق سے مزیّن ہوئے۔ تو مشرق و مغرب کی ہدائیت کا سبب ہو گئے تھے۔ اور دُنیا بھر میں اسلام کی تعلیم کو عام کر گئے تھے لیکن یہ لوگ اب مذہب حقّہ کی ماہیت سے قطعاً بے خبر اور محض ناآشنا تھے۔ نہ امر بالمعروف تھا نہ نہی عن المنکر۔ نماز کہ مذہب اسلام کی جان اور اسلام وکفر میں حدّ فاصل ہے پڑھنا تو درکنار اس کے شعائر بھی عام طور پر معلوم و معروف نہ تھے۔ نفوس، اموال معاملات اور جملہ کیفیات کے متعلق ان لوگوں کا رویہ مذہب سے ناآشنائی کا تھا۔ لُوٹ و غارت گری کی یہ کثرت تھی۔ کہ قافلے کے قافلے لُوٹ لئے جاتے تھے۔

حاجیوں کا قتل ان حجازیوں کا محبوب مشغلہ تھا خوف و دہشت کی حکمرانی تھی۔ کوئی شخص اپنی جان اور مال کے بارے میں مصئون نہ تھا۔ حجاز کی حکومت منظّم نہ تھی۔ سڑکوں اور شاہراہوں کا انتظام نہ تھا۔ اور اُونٹ کی نامعقول سواری کے سوا نقل و حرکت کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ قریب کی منزلوں کیلئے گدھے کی سواری کام میں آتی تھی۔

باقی معاملات کی کیفیت بھی ایسی ہی ناگفتہ تھی مثلاً حفظان صحت عامہ کا کوئی محکمہ نہ تھا ہسپتال اور

مطب کا تو کیا ذکر پورے حجاز میں عوام کی خدمت کیلئے ایک طبیب بھی نہ تھا چند اطباء تھے لیکن وہ امراء اراکین دولت کے لئے مخصوص تھے۔ عوام سے ان کا کوئی سروکار نہ تھا۔ اس قسم کے حالات میں طاعون اور ہیضہ کی وباؤں کا آئے سال پھیل جانا عجب نہ تھا۔ حج کے ایام میں تو وبا کی بہ کثرت تھی۔ کہ حاجی اپنے خویش واقارب سے دور اور غریب الوطنی اور کس مپرسی کی حالت میں سینکڑوں کی تعداد میں ہر سال مرتے تھے۔ حکومت اس صورت حالات کو دُور کرنے کی کوئی منظم کوشش نہ کرتی تھی۔

حجازیوں کے لئے حج کا موسم مال جمع کرنے کیلئے مخصوص تھا۔ کوئی حیلہ اور کوئی فریب ایسا نہ تھا جس سے کام لیکر بھولے بھالے حاجیوں کو لوٹا نہ جاتا ہو۔ خوش عقیدہ حاجی ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا جبتک کہ کچھ نہ کچھ ادا نہ کر لے۔ مکہ معظمہ سے لیکر مدینہ منورہ تک کوئی قبیلہ نہ تھا۔ جو حاجیوں سے راہگذر کے بہانے سے معقول رقم نہ وصول کرلے۔ حاجیوں کیلئے ضروری تھا۔ کہ تحفظ جان کیلئے قافلوں میں شامل ہو کر سفر کریں۔ اور جگہ بجگہ روپیہ ادا کرتے جائیں۔ مطوف اور معلم اپنے کام میں بالکل آزاد تھے جس طرح چاہیں لوٹ کھسوٹ کریں غرض یہ ہے۔ کہ اخلاقی حالت اس قدر زوال پذیر ہو گئی تھی۔ کہ بیان ہونا مشکل ہے۔ فواحش کی یہ کثرت تھی۔ کہ جدہ میں ایک باقاعدہ چکلہ نکوتوانامی جگہ میں بن گیا تھا۔ جوئے خانے تو گھر گھر تھے۔ لواطت کھلم کھلا ہوتی تھی۔ لوگ اسے عیب ہی نہیں جانتے تھے۔ کس قدر افسوس اور قلق کا مقام ہے۔ کہ خاص حرم کعبہ کی حدود کے اندر شراب کی کشید ہوتی تھی۔ روضہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قریب ایک جگہ جنۃ المعلیٰ نام کی تھی۔ جہاں بدوضع مرد بدچلن عورتوں سے وعدہ کے مطابق ملاقاتیں کرتے تھے۔ شرم کی بات ہے۔ کہ حرم کی حدود میں اعلانیہ زنا ہوتا تھا۔ اور کوئی بازپرس نہ تھی۔ وہ حرم جہاں مردانِ خدا عشق الٰہی اور مذہب کی پاکیزہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور اولیاء اللہ دن رات عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ جو سرچشمۂ ہدایت اور منبع محاسن تھا اب اس حالت کو پہنچ گیا تھا۔

حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ جو خود مکارمِ اسلام اور محاسنِ اخلاق سے بے بہرہ اور ناآشنا تھی کوئی قانون اور نظام بھی ایسا نہ تھا جس سے فسق و فجور کی روک تھام ہو۔

اصلاحِ اخلاق تو ایک طرف مخربِ اخلاق باتوں کی دن بدن زیادتی ہو رہی تھی۔ صحیح شعائر اسلامیہ کی بجائے مقابر، مزارات اور نام نہاد متبرک چیزوں کی عبادت شد و مد سے جاری تھی۔ اور اوہام و خرافات پرستی کا دور دورہ تھا۔

جب حاجی حرمین الشریفین کی زیارت کو جاتے اور وہاں کے حالات دکوائف سے بیخبر ہوتے تو مطوفین اور معلّمین کی ایک جماعت انہیں گھیر لیتی اور جگہ بجگہ لئے پھرتی۔ کوئی قبر اور کوئی مزار ایسا نہ تھا جس کی بزرگی اور کرامات بیان نہ ہوتیں۔ یہانتک کہ بیچارے حاجیوں کی جیبیں مال وزر سے خالی ہو جاتیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ہر سال ایک نیا مزار تعمیر ہو کر جلب منفعت کا باعث ہوتا۔ ان لوگوں نے ایسی ایسی بدعتیں اختراع کیں جنکی کوئی اصل قرآن وسنت میں نہ تھی چنانچہ جاوا کے حاجیوں کے جاوی نام ہوتے تھے۔ حجازی معلّم ان کے عربی نام تجویز کر دیتے۔ اور اس تبدیلی کے صلے میں تین چار گنی تک یعنی پچاس وساٹھ روپیہ کی رقم وصول کر لیتے تھے۔ الغرض یہ مقدس مقامات کہ تمام عالم اسلامی کا ملجا وماویٰ ہیں۔ اخلاقی پستی اور ذلت ونکبت کی گہرائیوں میں ڈال دئے گئے تھے۔

ترکوں نے صدیوں تک طنطنہ اور سطوت سے حجاز پر حکومت کی اور کسی کو انکار کی گنجائش نہیں کہ انہوں نے حرمین الشریفین میں بہت سا مال وزر صرف کیا لیکن کثرت کے باوجود اس روپیہ کا مستقل فائدہ کچھ بھی نہ تھا کیونکہ یہ اخراجات شرعی طریقہ پر نہیں ہوتے تھے۔ ترکوں کی بڑی کارگذاری یہ تھی کہ راستوں اور شاہراہوں کی حفاظت کیلئے حجاز کے قبیلوں کے بڑے بڑے شیوخ کو گرانقدر رقمیں دیتے تھے۔ اور اس طرح پر عارضی امن وامان خرید لیتے۔ لیکن جونہی کہ امراء شیوخ کو مزید امداد کی ضرورت ہوتی۔ فتنہ وفساد برپا کر دیتے۔ اور غارت گری کرتے ترکی حکومت انہیں پھر روپیہ ادا کر دیتی۔ آئے دن یہی کیفیت قائم رہتی ترکی حکومت معلّموں اور بیکار وظیفہ خواروں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیتی تھی۔ یہ ناکارہ اور نااہل لوگ مفت کا روپیہ اڑا کر اور بھی بدمست ہوتے۔ اور فسق وفجور اور بدعت وضلالت کی زندگیاں بسر کرتے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ ترکی حکومت نے علوم وفنون کی اشاعت کیلئے کچھ نہ کیا۔ اور نہ ہی صنعت وحرفت کو ترقی دی۔ پورے ترکی عہد کی یادگار میں حجاز بھر میں ایک بھی منظم ادارہ موجود نہیں ہے۔

جب شریف حسین نے ترکوں سے بغاوت کر کے حجاز کی عنانِ حکومت کو سنبھالا۔ تو حالت اور بھی ابتر ہو گئی۔ اور رہا سہا امن وامان بھی مفقود ہو گیا حقیقت یہ ہے کہ شریف حسین جو کچھ بھی کرتا۔ ذاتی رفعت اور جلب منفعت کے خیال سے کرتا تھا۔ اسکو بڑی فکر اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کی تھی حقیقی اصلاح اور متمدن حکومت کا کچھ خیال نہ تھا۔ فقدانِ امن کی یہ حالت تھی۔ کہ حرمین الشریفین کے عین درمیان بھیڑیوں اور درندوں کی سی حکومت ہو گئی تھی۔ تین چار میل کا فاصلہ بھی معقول جمعیت کے بغیر طے نہ ہو سکتا تھا۔ بعض لوگ اس قدر مرعوب اور دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ کہ عوالی۔ قبا۔ بئیر علی وغیرہ مقامات تک جو مدینہ منورہ سے صرف تین چار میل کے فاصلے

پر واقع ہیں۔ اکیلے نہیں جا سکتے تھے۔ اگر کسی ضرورت خاص سے جانا پڑتا تھا۔ تو قافلہ بنا کر اور خوب اسلحہ بند ہو کر جاتے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان جس قدر قبائل آباد تھے۔ انہوں نے اپنی اپنی جداگانہ اور مستقل حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ وہ شریف حسین کی سیادت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ یہ قبیلے اپنے اپنے علاقوں سے بغیر خراج کی ادائیگی کے کسی کو گذرنے نہیں دیتے تھے۔

شریف حسین نے انگریزوں کے بل بوتے پر ترکوں سے بغاوت کی تھی۔ اور انہی کی اعانت کے بھروسہ پر اپنی عربی سلطنت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ کہ شریف حسین نے انگریزی حکومت سے کروڑوں روپے وصول کئے۔ اور اسکے صلہ میں انگریزی مفاد کو تقویت دیتا رہا۔ اور ان کے ہر مشورہ اور ہر دستارانہ حکم پر کاربند رہا۔ شریف حسین کے عہد میں حجاز بالواسطہ تو انگریزوں کے ماتحت تھا ہی لیکن اس کو بلاواسطہ انگریزی حمائیت و حکومت کو بھی قبول کرنے میں باک نہ تھا۔ چنانچہ اس نے بہت سی اقتصادی رعائتیں فرنگی اور انگریزی کمپنیوں کو عطا کیں۔ اگر کچھ عرصہ اور برسر اقتدار رہتا۔ تو وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ انگریزوں کا پورا عمل دخل حجاز کی ارض مقدس میں ہو جاتا۔ چنانچہ جاتے جاتے بھی شریف حسین نے اپنی ذلیل ذہنیت کا مظاہرہ یہ کیا۔ کہ برٹے معاہدہ عقبہ و معان کے اہم مقامات کو حجاز سے علیحدہ کر دیا۔ اور اس طرح پر اپنی جانشین حکومت کے پہلو میں کانٹے بو گیا۔ یہ چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ کہ حجاز کی محافظت اور مصئونیت کیلئے ان مقامات کا قبضہ نہائیت ضروری ہے۔

---

(۲)

حجاز کی موجودہ حالت

اس وقت حجاز میں امن وامان کا دور دورہ ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے۔ کہ مخالفین بھی اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہی معلم جو دغا و فریب سے حاجیوں کو لوٹ لیتے تھے۔ اب حاجیوں کے مال کو اپنے لئے حرام سمجھتے ہیں۔ اور وہی قبائل جن کا محبوب پیشہ حاجیوں کا قتل اور غارت گری تھا۔ اب بقدر استطاعت خود ان کی محافظت کرتے ہیں۔ اگر کسی حاجی کی کوئی کھوئی ہوئی چیز بیابان میں بھی پاتے ہیں۔ تو محکمۂ امانات کو پہنچا کر رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے۔ کہ اب تک سلطان ابن سعود

کے عہد میں کسی حاجی کے ہاں چوری ہونا تو درکنار کبھی کوئی چیز کھوئی نہیں گئی۔ اور نہ ہی کھو کر ضائع ہوئی بڑی بڑی زبردست حکومتیں اتنے تھوڑے عرصہ میں ایسا عدیم النظیر امن قائم نہیں کر سکیں لیکن سلطان ابن سعود نے یہ سب کچھ اس قلیل مدت میں کر دکھایا ہے۔ حالانکہ اس کے پاس مناسب وسائل موجود نہیں ہیں۔ حجاز میں تو باقاعدہ محکمہ جات تھے۔ نہ ہی تربیت یافتہ عملہ۔ اتنے بڑے علاقہ میں جیل خانہ تک نہ تھا۔ ناظرین کو شاید معلوم ہو گا کہ نجدی حکومت سے پہلے حجاز کی شاہراہیں حقیقت میں پہاڑوں کے درمیان معمولی پگڈنڈیاں تھیں جن میں لوٹ مار اور قتل و غارت نہایت آسان کام تھا۔ اور حکومت کیلئے اسکی روک تھام اور ایسے راستوں کی حفاظت محال تھی۔ لیکن سلطان نے اپنی شخصیت اور حسنِ تدبیر سے انہیں مخدوش راستوں کو قلیل مدت میں ایسا محفوظ و مامون کر دیا ہے۔ کہ اکیلا شخص بھی جہاں چاہے بہ اطمینان و فراغِ خاطر جا سکتا ہے۔

جب حرمین الشریفین اور جدہ سلطان کے زیرنگیں ہو گئے۔ تو اس نے ۸ جمادی الثانی سنہ ۱۹۲۶ء عیسوی کو حجاز کے بڑے بڑے شیوخ اور رؤساء سے اتباعِ شریعت اور قیامِ امن کیلئے بیعت لی۔ اکثر تو سلطان کی شخصیت اور سطوت سے ہی متاثر ہو گئے لیکن قبیلہ عسفان نے بیعت کرنے کے باوجود ایک قبیلہ کو لوٹ لیا ان کی گوشمالی اور تادیب کے لئے ایک جماعت کو مقرر کر دیا گیا۔ اور حکم ہوا کہ وہ آتشیں اسلحہ سے کام نہ لے۔ بلکہ صرف لاٹھی استعمال کرے۔ چنانچہ قبیلے کے تمام جوان مردوں کو زیرِ حراست کر لیا گیا۔ اور ایسی سزا دی گئی کہ تمام قبائل کو عبرت ہو گئی۔ اسکے بعد حجاز کے سارے ملک میں ڈاکہ کی ایک واردات بھی نہیں ہوئی۔ اور یہ ملک بھی نجد کی طرح امن و امان کیلئے مشہور ہو گیا۔

سنہ ۱۹۲۸ء میں ایک حاجی کی تھیلی گم ہو گئی جسمیں پندرہ ہزار روپیہ نقد تھا۔ یہ واقعہ جدہ و مکہ کے راہ میں پیش آیا لیکن وہ شخص ابھی مکہ نہ پہنچا تھا کہ یہ تھیلی صحیح و سالم اُسے مل گئی۔ اب تک اس قسم کے بہت سے واقعات پیش آ چکے ہیں۔ باخبر ناظرین کو یہ جتانے کی ضرورت نہیں۔ کہ قیامِ امن نوعِ انسانی کی ترقی کیلئے کس قدر ضروری ہے علوم و فنون کی ترویج اصلاح و تمدن کی ترقی اور تہذیب و شائستگی کی فراوانی مختصراً مکارمِ انسانی کی کوئی نوع ایسی نہیں جسکے حصول کیلئے امن و امان کی اشد ضرورت نہ ہو۔ اب کہ ایسے عدیم النظیر امن کا کئی پچھلے ہزار سال میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ دور دورہ حجاز میں ہوا ہے۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں انسانی زندگی کی جملہ ترقیات حاصل ہو جائیں گی۔

جس دن سے سلطان نے حجاز میں قدم رکھا۔ اپنی بہترین توجہات وہاں کے اداروں اور شعبوں کی

تحسین تنظیم کیلئے سبدل کیں سلطان نے جس قدر ارادے اوائل میں ظاہر کئے تھے اپنے عمل سے صحیح ثابت کر دیئے سلطان نے شروع سے ہی سمجھ لیا تھا کہ حجاز میں منظم حکومت موجود نہیں ہے۔ اس لئے وہاں کے قدیم ڈھانچے کی اصلاح و تربیت میں وقت ضائع کرنا تحصیل حاصل ہے۔ لیکن جدید حکومت کی تشکیل کیلئے وقت یہ تھی کہ نہ تو ضروری وسائل موجود تھے۔ اور نہ ہی کارکن و کاردان اشخاص۔ لیکن پھر بھی جہانتک ممکن ہو سکا۔ سلطان نے بہترین اشخاص کو منتخب کر کے ایک قابل قدر نظام میں منسلک کر دیا چنانچہ اس غرض کیلئے ایک مجلس قائم کی گئی جس کا نام مجلس التفتیشی رکھا۔ اصلاحات کا اجراء و نفاذ اس مجلس کا نصب العین تھا۔ حکم ہوا کہ جس شعبہ میں اصلاح کی گنجائش پائیں سلطان کو مطلع کرتے رہیں۔ اور انکی آراء کے مطابق عملدرآمد ہو چنانچہ پانچ بڑی مدیں جنکی اصلاح خاص طور پر منظور تھی حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اصلاح المعارف یعنی تعلیم۔

۲۔ اصلاح القضا یعنی قانون شریعت و عدالت و انصاف۔

۳۔ اصلاح صحت عامہ۔

۴۔ اصلاح الامور عامہ۔ مثلاً حرم کے صحن کی توسیع۔ چاہ زمزم کا جدید طریقوں پر اخراج، نہر زبیدہ کی اصلاح اور نئی سڑکیں تعمیر کرنا۔

۵۔ تار۔ ڈاک۔ ٹیلیفون۔ اور وائرلیس وغیرہ کا قیام و ترویج۔

(الف) **تعلیم**} مکہ۔ مدینہ اور جدہ میں چند سرکاری مدارس تو پیشتر سے موجود تھے۔ ان کے علاوہ بعض غیر سرکاری مدارس بھی تھے جن میں تعلیم و تدریس خانگی طور پر ہوتی تھی۔ لیکن نہ تو ان کا طریقہ تعلیم یکساں تھا۔ اور نہ ہی وہ کسی سلسلہ نظام میں منسلک تھے۔ لیکن جونہی کہ شریفی حکومت کا خاتمہ ہوا اور سلطان کا تسلط ہوا۔ نہ صرف یہ کہ سابقہ مدرسوں کو قائم رہنے دیا گیا۔ بلکہ تھوڑے ہی عرصے میں بہت سے جدید مدارس بھی کھول دئیے گئے۔ ان مدارس کے اساتذہ کو حسب لیاقت سلطان کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے سلطان نے ایک کمیٹی (الحجنہ التفتیشی) مدارس کے معائنہ اور نگہداشت کیلئے قائم کی۔ ایک شامی عالم بشیر کو اس کا صدر بنایا۔ یہ کمیٹی مدارس کے متعلق جملہ معائنہ و تفتیش تعلیم و تدریس و مالی امداد وغیرہ کی ذمہ دار ہے۔ اس کمیٹی نے قرار دیا کہ تعلیم عام متمدن ملکوں کی طرح تین قسم کی ہو۔ ابتدائی۔ ثانوی اور اعلیٰ۔ اور جملہ مدارس کا طریق تعلیم اور نصاب تعلیم ایک سی ہو۔ اس کمیٹی نے تجربہ و تالیف کے کام کو [illegible]

کروایا۔ اور نصاب میں ایسی کتابیں داخل کیں جن کی اس ملک میں واقعی ضرورت تھی۔ اور جن کا معیار اہالیان حجاز کی عقل و مزاج کے مطابق تھا۔ اور جوان کے اخلاق و مدنیت کیلئے واقعی مفید تھیں پرانے رطب و یابس کو ترک کر دیا گیا۔ جس موضوع پر عمدہ ترجمے دستیاب نہیں ہوئے نئی کتابیں تالیف کروائی گئیں۔ اس مجلس نے یہ بھی قرار دیا کہ قدیم علم ہیئت وغیرہ جو علوم اب متروک ہیں۔ درس سے خارج کر دئیے جائیں۔ دیگر ممالک کی وہ کتابیں جنکی باقاعدہ تحقیق و تدقیق نہ ہوئی ہو۔ داخل نصاب نہ کی جائیں۔

اس مجلس علمی کے بارہ ارکان ہیں۔ اور تعلیم کا پورا سلسلہ اسکے ماتحت ہے۔ نئے مدرسے روز بروز کھل رہے ہیں۔ اور توسیع تعلیم کی تجاویز ہو رہی ہیں۔ کیونکہ حجاز میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور آزمودہ کار اساتذہ کی کمی تھی۔ اس نئے مدرسین کی ایک معقول تعداد مصر و شام سے طلب ہو کر سر رشتہ تعلیم میں شامل کر دی گئی ہے۔

لیکن قبائل کی حالت خانہ بدوشی اور صحرا نوردی کی وجہ سے کچھ ایسی تھی۔ کہ وہ مستقل مدارس سے مستفید نہ ہو سکتے تھے اسلئے وہ مدت سے تعلیم کی روشنی سے محروم تھے۔ چنانچہ سلطان نے اس اہم فروگذاشت کو محسوس کیا۔ اور صحرائی آبادی کی ضروریات اور حالات و کوائف کے مطابق مدرسے قائم کئے۔ ان مدرسوں میں نجدی علماء کو تعلیم و تدریس کے لئے متعین کیا۔ اکثر قبائل کی تعلیم کا بندوبست اس طرح پر ہو گیا ہے۔ ابھی مزید انتظامات جاری ہیں۔ اور یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ چند سال کے عرصہ میں بدوی جہالت سے نجات پا کر زیور تعلیم و اخلاق سے آراستہ و پیراستہ ہو جائیں گے۔

بدوی مدارس کے اساتذہ دو قسم کے ہیں معلم اور مرشد۔ مرشد وہ کہلاتے ہیں جو کہ بدوی مرد ولی کو علوم دینیہ مثلاً قرآن خوانی۔ نماز وغیرہ فرائض و شعائر اسلامیہ سکھاتے ہیں۔ اور انکی سعی و عمل یہ ہے کہ لوگوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنائیں۔ اور ان کو اسلام کی حقیقی روح سے باخبر کریں۔ یہ لوگ بڑی جد و جہد اور جانفشانی سے کام کرتے ہیں۔ انکی مساعی عنقریب نہایت خوشگوار اور درخشندہ نتائج پر منتج ہونگیں۔

معلمین کا کام یہ ہے کہ وہ قبائل کے بچوں کو عام تعلیم دیں۔

سلطان نے ایک قانون معارف مرتب کیا ہے جس کی رو سے معلمین کو لجنہ تفتیشیہ کے قائم کردہ نصاب سے انحراف کرنے سے بڑی سختی سے منع رکھا گیا ہے۔ اور مقررہ منظور شدہ علوم کو ہی پڑھانا لازمی طور پر واجب قرار دیا گیا ہے۔ تمام تعلیمی ادارے اس قانون کے ماتحت کر دئیے گئے ہیں۔ اس قانون کی رو سے لجنہ تفتیش کی منظوری اور اجازت کے بغیر کوئی درسگاہ قائم نہیں ہو سکتی۔ اختصار کے طور پر تعلیم کا

لائحہ عمل حسب ذیل ہے :-

۱۔ یہ کہ تعلیم کی غرض وغائیت ایک ہو۔ نصاب بھی ایک ہو۔

۲۔ یہ کہ تعلیم کا طریق نظام جملہ مدارس میں یکساں ہو۔

۳۔ یہ کہ بتدریج ترقی ہوتے ہوتے ابتدائی تعلیم کو جبری کر دیا جائے۔

۴۔ یہ کہ غریب طالب علموں کو مفت تعلیم دی جائے اور ان سے کوئی فیس وغیرہ وصول نہ کی جائے اور نہ ہی انہیں دیگر اخراجات صرف کرنا پڑیں۔

۵۔ مسجد الحرام میں جس قدر مدارس ہیں۔ ان کو ایک سلسلہ میں منسلک کر دیا جائے۔

۶۔ اساتذہ کی تعلیم ولیاقت کی وقتاً فوقتاً تجدید ہوتی رہے۔

۷۔ مہذب ممالک کی طرح تمام درس گاہوں کا معائنہ باقاعدہ ہوتا رہے۔ تاکہ تعلیمی جدوجہد کا حال بخوبی معلوم رہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ کہ سلطان نے دارالسلطنت ریاض میں ایک اعلیٰ درس گاہ کا افتتاح کیا ہے جس میں جید علماء کی جماعت حدیث و دیگر علوم دینیہ کی تعلیم دیتی ہے۔ ساتھ ساتھ مروجہ دنیاوی علوم وفنون کی تعلیم بھی ہوتی ہے۔ غرض یہ ہے کہ اس درسگاہ کے فارغ التحصیل جہاں علوم عربیہ و اسلامیہ میں متبحر ہوں وہاں مروجہ فنون میں بھی معقول درک رکھیں۔ اور وقتی ضروریات اور ہنگامی مشاغل سے غافل نہ ہوں۔

اس درس گاہ میں عوام کے استفادہ کیلئے رات کو حدیث کا درس ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ایک مطبع بھی قائم کیا گیا ہے جس میں نادر ونایاب کتابیں طبع ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس مطبع سے متعلم اور معلم دونوں فائدہ اٹھاتے ہیں اس عظیم الشان درس گاہ کے کثیر مصارف اساتذہ کی تنخواہیں اور طلبا کا لباس وطعام وغیرہ سلطان کی جیب خاص سے ہوتے ہیں۔ اس درس گاہ کے طالب علم تعداد میں ہندوستان کے کسی خالص دینی مدرسہ کے طلبا سے کم نہیں کچھ عجب نہیں کہ ہوتے ہوتے یہ درس گاہ ایشیا میں سب سے بڑی اسلامی دینی درسگاہ بن جائے

ان تمام مساعی کے علاوہ سلطان نے بعض طلباء کو جدید علوم وفنون کی تحصیل کیلئے یورپ بھیجا ہے یہ سلسلہ برابر جاری ہے شروع ہی میں ایک حجازی طبیب کو علم جراحت سیکھنے کیلئے پیرس اور چار طالبعلموں کو بیت المقدس میں تار برقی اور ٹیلیفون وغیرہ کا کام سیکھنے کیلئے بھیجا تھا۔ اس وقت بھی ایک کثیر تعداد مصر و دمشق

میں زیر تعلیم ہے۔ یہاں سے فارغ ہونے پر یہ طلبا سرکاری اخراجات پر یورپ بھیجے جاتے ہیں۔ تاکہ مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کر کے اپنے ملک و قوم کے لئے مفید ثابت ہوں اور حکومت حجاز کو متمدّن اور منظم کرنے میں مدد دیں۔

(ب) محکمۂ عدالت و شریعت } تعلیمات کا بیان تفصیل سے ہو چکا پیشتر ازیں محکمہ عدالت کی حالت بھی چنداں اچھی نہ تھی۔ اس محکمہ کا عمومی اعتماد اس قدر کم ہو چکا تھا کہ متمدن ممالک کے باشندے اس محکمہ کے انصاف کو انصاف نہ کہہ سکتے تھے۔ یہ محکمہ حرف غلط کی طرح تھا۔ کہ موجود تو تھا لیکن عملی فائدہ کچھ بھی نہ تھا۔ بعض لوگ مقدمات دائر کرنے کی بجائے اپنے دعووں کو ترک کر دینا بہتر سمجھتے تھے۔ انصاف و عدالت کی حالت کو بہتر بنانے کیلئے "مجلس التفتیشی" نے تین محکمہ جات کے قیام کا حکم دیا۔

۱۔ محکمہ خفیفہ۔ اس عدالت کا اختیار سماعت تیس گنی یا اس کے برابر مالیت تک ہے۔ اگر کوئی حکم خلاف قانون شریعت ہو۔ تو اس کا اپیل ہو سکتا ہے۔

۲۔ محکمہ شرعیہ عالیہ۔ تمام وہ مقدمات جو محکمہ عدالت خفیفہ کے اختیار سماعت سے باہر ہوں۔ اس محکمہ میں سماعت ہوتے ہیں۔ اس عدالت کا فیصلہ قاضیوں کی کثرت رائے پر مبنی ہوتا ہے۔

۳۔ عدالت بدویہ

پہلے دونوں محکمہ جات مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ اور جدّہ میں ہیں۔ عدالت خفیفہ میں ایک ہی قاضی ہوتا ہے لیکن محکمہ شرعیہ عالیہ میں تین تبحر عالم قاضی ہوتے ہیں کیونکہ تیسرے محکمے کا تعلق صحرائی لوگوں سے ہے اس لئے کوئی خاص مقام عدالت مقرر نہیں ہو سکتا۔ قاضیوں کو صحرا میں دورہ کرنا پڑتا ہے۔ اور ضرورت کے مطابق مختلف مقامات پر مقدمات فیصل ہوتے ہیں۔ جملہ محکمہ جات کی نگرانی اور پڑتال کیلئے ایک مجلس مقرر ہے جس کا ایک صدر اور تین ارکان ہوتے ہیں۔ اس مجلس کے وظائف حسب ذیل ہیں:

۱۔ حدود شرعی کی نگہداشت۔

۲۔ کسی ایک فریق کے اپیل کرنے پر مقدمہ کی سماعت۔

۳۔ اوقاف کا انتظام اور محافظت کمسن بچوں اور یتیموں کے حقوق کی حمائت۔

۴۔ شریعت کے بارے میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

۵۔ ان تمام معاملات میں جن کا براہ راست تعلق محکمہ شریعت سے نہیں۔ فتویٰ جاری کرنا۔

۶- جہاں محکمہ شرعیہ کے قاضیوں میں اختلاف رائے ہو۔ اور مقدمہ فیصل نہ ہوا ہو۔ وہاں مجلس کی رائے قائم کرنا اور اس کے متعلق مقدمہ میں احکام جاری کرنا۔

جملہ احکامات کا اجراء و نفاذ فیصلے کے پانچ دن بعد ہوتا ہے۔ صدور حکم سے بیس دن بعد تک اپیل دائر ہو سکتا ہے۔ قانون کی رُو سے کوئی قاضی عدالت کے اوقات میں نجی ملاقاتیں نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی مقدمات کے فیصلہ کرنے میں تساہل و غفلت سے کام لے سکتا ہے۔ قاضی کا فرض ہے کہ ہر مقدمہ کے متعلق اپنی محکم رائے کا اظہار کرے۔ گمراہ کن اور غلط تاویلوں میں نہ پڑے۔

اس قسم کے انتظامات کی وجہ سے پبلک کو عدالت ہائے سرکاری میں از سر نو اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔ اب مقدمات کا فیصلہ باطمینان ہوتا ہے۔ اور کسی خاص شکایت کی گنجائش نہیں ہے۔

ہر مقدمے اور ہر معاملے میں شرع محمدی کا نفاذ و اطلاق ہوتا ہے کیونکہ شریعت محمدیہ ایک مکمل اور ترقی یافتہ قانون ہے۔ اسلئے نت نئے قوانین کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مغربی انداز کی عدالتوں کی طرح کوئی کورٹ فیس نہیں لیا جاتا۔ نہ ہی انصاف و عدالت کی کوئی اُجرت وصول کی جاتی ہے۔ فیصلہ مقدمات میں غیر معمولی التوا نہیں کیا جاتا۔ مقدمات جلد از جلد فیصل ہوتے ہیں پیچیدہ اور مشکل ضابطے بھی مقرر نہیں ہیں۔ کیونکہ حجاز میں اہل السنّت والجماعت کے چار فرقے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی موجود ہیں۔ اور ان فرقوں کے فقہا کا بعض شرعی معاملات میں آپس میں اختلاف ہے۔ اسلئے بسا اوقات قاضی کو سخت دقت واقع ہوتی ہے۔ ایسے قاضیوں کا جو چاروں مذہبوں کے فقہ سے کما حقہ واقف ہوں معقول تعداد میں دستیاب ہونا محال ہے اس لئے سلطان نے اس تکلیف اور ضرورت کو پیش نظر رکھکر ایک مجلۃ الاحکام الشرعیہ تیار کروایا ہے۔ چاروں مذہبوں کے بڑے بڑے متبحر علماء نے اس کو مرتب کیا ہے۔ اور مختلف معاملات میں اپنی اپنی فقہ کے مطابق احکام درج کئے ہیں۔ اس طرح پر ایک ایسی کتاب تیار ہو گئی ہے جس کو ایک نظر دیکھ لینے سے کسی مسئلہ کے متعلق چاروں مذہبوں کے مفصل احکام معلوم ہو سکتے ہیں۔ اور قاضی کو مذکورہ بالا دقت پیش نہیں آتی۔

ہر چند کہ سلطان کا اپنا مذہب حنبلی ہے۔ اور وہ خود اپنے مذہب کی سختی سے پابندی کرتا ہے لیکن رعیت کے معاملے میں فراخ دلی اور رواداری سے کام لیتا ہے۔ کسی شخص کے حقوق پر مذہب کی وجہ سے اثر نہیں پڑتا۔ فیصلہ مقدمات میں بھی فریقین کے مذہب کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

(ج) امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ کیونکہ سلطان خود صحیح مذہبی خیالات کا شخص ہے۔ اسلئے اس

نے اپنے نظامِ حکومت اور جملہ اصلاحات کا انحصار امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر رکھا ہے۔ حجاز تمام اسلامی دنیا کا مرکز ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان سال میں ایک دفعہ حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ میں جمع ہوتے ہیں۔ اس لئے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے حجاز میں اجراء پذیر ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عنقریب تمام دنیائے اسلامی میں خوشگوار نتائج پیدا ہونگے۔ اس غرض کیلئے سلطان نے خاص مکہ مکرمہ میں ایک صدر مجلس قائم کی ہے جسکی شاخیں مدینہ منورہ جدہ۔ طائف۔ ینبوع وغیرہ قصبات میں موجود ہیں۔ صدر مجلس کے دس اعضا ہیں۔ شاخوں کے ارکان حسب ضرورت ومصلحت مقرر کئے جاتے ہیں۔ ہر رکن کا اخلاق وآداب حسنہ سے مزین ہونا ضروری ہے۔ ہر مجلس کے ماتحت ایک مسلحہ جماعت ہے جو مجلس کے احکام کو نافذ کرتی ہے۔ اور انحراف نہیں ہونے دیتی۔ ہر حجازی کیلئے واجب ہے کہ اس مجلس کے احکام کی متابعت کرے۔

مندرجہ ذیل امور کی نگرانی اس مجلس کا فرض ہے:۔

۱۔ بازار کے دوکانداروں کا فرض ہے کہ جس وقت اذان سنیں فوراً مسجد میں جاکر نماز ادا کریں۔ نماز میں تاخیر شرعی مواخذہ کا باعث ہے۔ اسی طرح پر کسی مذہب کو برا کہنے والا یا تحقیر کرنے والا تعزیر کا مستحق ہے۔

۲۔ اللہ کے نام کے سوا کسی اور نام کی قسم کھانے والا سزا کا مستوجب ہے۔

۳۔ لہو ولعب کیلئے کہیں کوئی اجتماع نہیں ہوسکتا۔

۴۔ شراب کا پینا خواہ کسی قسم کی ہو ممنوع ہے۔

۵۔ ڈاڑھی منڈوانا یا خلاف شریعت کترانا یا رنگ کرنا منع ہے۔

۶۔ تمباکو پینا منع ہے۔ جو شخص حقہ یا سگرٹ پیئے اس کو زبانی تنبیہ ہوتی ہے۔ اگر پھر بھی باز نہ آئے تو سزا دی جاتی ہے۔

۷۔ میت پر ماتم کرنا اور پیٹنا ناجائز ہے۔

۸۔ موت کے بعد سوئم وغیرہ کی مجالس منعقد نہیں ہوسکتیں۔

۹۔ عورتیں اور مرد ایک ہی مجلس میں جمع نہیں ہوسکتے۔

۱۰۔ فال۔ رمل۔ نجوم اور اس قسم کی تمام خرافات جائز نہیں ہیں۔

۱۱۔ مرد سونے اور چاندی کی انگشتری یا کوئی زیور نہیں پہن سکتے۔ نہ ہی خالص ریشم کا لباس زیب تن کر سکتے ہیں لیکن جس قسم کے مشروع ریشم کا استعمال شریعت میں حلال ہے۔ وہ جائز ہے اور کوئی روک ٹوک نہیں۔

۱۲۔ نہانے اور وضو کرنے کے مقامات پر کوئی شخص اپنی شرمگاہ کو ننگا نہیں کر سکتا تاکہ کسی کی نگاہ نہ پڑے اور بیحیائی اور بے شرمی کا ارتکاب نہ ہو۔

۱۳۔ سود خواہ کسی صورت میں ہو بالکل ممنوع ہے۔

۱۴۔ عورتیں بن سنور کر کھلے منہ گھر سے باہر نہیں جا سکتیں۔ اور نہ ہی ایسے مقامات میں جا سکتی ہیں۔ جہاں مرد جمع ہوتے ہوں۔ اور نہ ہی اشد ضرورت کے بغیر رات کو باہر نکل سکتی ہیں۔ اگر مجبوری میں کہیں جانا بھی پڑے تو محرم کا ساتھ ہونا نہایت ضروری ہے۔

۱۵۔ کسی معلم یا مطوف کیلئے جائز نہیں کہ وہ حاجیوں کو ایسی دعائیں یاد کروائے جو سنت رسول اللہ صلعم کے مطابق نہ ہوں۔ اور بدعت کی راہ سے گھڑ لی گئی ہوں۔

۱۶۔ عورتیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روضہ منورہ کے علاوہ کسی مقبرے کی زیارت نہیں کر سکتیں

۱۷۔ مرد بھی غیر شرعی امور کیلئے جمع نہیں ہو سکتے۔ چاہیں تو جائز ضروریات کیلئے تکیوں یا گھروں میں مجمع کریں۔

میر محلہ دار اپنے محلے میں ان امور کے منع کرنے پر مامور ہیں۔ اگر مجلس میں یہ شکائت پہنچے کہ کوئی میر محلہ دار خود شریک جرم ہے یا ارتکاب جرم پر چشم پوشی کرتا ہے۔ تو وہ بھی سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے۔ بالعموم اخلاقی قوت سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں جبر سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ اصلاح کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں۔

(د) رفاہِ حجاز: حجاز کی حکومت سعودیہ نے حفظان صحت کے انتظامات بھی کئے ہیں۔ پیشتر ازیں اس ملک میں عوام کے معالجے کی صورت نہ تھی۔ اب حکومت نے متعدد شامی اور مصری ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ جدہ میں ایک عظیم طبی مرکز جدید ترین اسلوب پر قائم کر دیا گیا ہے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھی ہسپتال قائم ہو گئے ہیں۔ طائف، ینبوع وغیرہ قصبات میں شافیں کھل رہی ہیں۔ حج کے موقعہ پر طبی امداد کے خاص انتظامات کئے جاتے ہیں۔ مریضوں کو ادویات مفت ملتی ہیں۔

حجاز کے چند نوجوان پیرس اور یورپ کے دیگر مقامات پر اعلیٰ طبی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بھیجے گئے ہیں۔ حجاز کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے۔ کہ وہاں کے نوجوان یورپ کی تعلیم کے لئے گئے ہیں۔

علاج مویشیاں — مویشیوں کے علاج کیلئے جدہ میں ایک بڑا ہسپتال کھولا گیا ہے جس کا افسر اعلیٰ ایک ولندیزی ہے۔ اس شخص نے سات برس کی خدمت کا معاہدہ کیا ہے۔ اس ہسپتال میں جدید ترین ادویات مہیا کی جاتی ہیں۔ ولندیزی ڈاکٹر کے ساتھ چند حجازی طبیب بھی کام کرتے ہیں مقصد یہ ہے۔ کہ کام سیکھنے کے بعد یہ حجازی اس قابل ہو جائیں کہ حجاز کے مختلف ہسپتالوں میں کام کر سکیں۔

جدید سڑکیں — حجاز میں عمدہ سڑکیں نہ تھیں۔ حکومت نے چاہا کہ بڑے بڑے شہروں کے مابین پتھر کی سڑکیں تعمیر کر دے۔ جدہ اور مکہ کی درمیانی سڑک ایک عرصہ سے قابل مرمت تھی۔ اس راستے میں جا بجا دُور دُور تک ریت پھیل گئی تھی، اور حاجیوں کو سخت تکلیف ہوتی تھی۔ حکومت نے اس سڑک کی مرمت کروا دی ہے۔ پُوری سڑک پر پتھر کُوٹا گیا ہے۔ حاجی اب بہت آرام پاتے ہیں۔

مکہ اور طائف کے مابین بھی ایک سڑک بنا دی گئی ہے جس پر موٹر چلتے ہیں۔ طائف ایک نہایت خوش فضا مقام ہے۔ آب و ہوا بہت عمدہ ہے ہر قسم کی سبزیاں، ترکاریاں اور میوے پیدا ہوتے ہیں۔ راستہ کے فقدان کی وجہ سے مکہ اور طائف کا سفر پہلے کئی دن میں ختم ہوتا تھا۔ اب نئی سڑک بن جانے سے موٹر تین دن میں پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح پر اس نفیس قصبے کی آبادی و ترقی کا سامان ہو گیا ہے۔ سلطان ابن سعود کی خواہش ہے۔ کہ اس شہر کو حجاز کا گرمائی صدر مقام بنا دے۔ چنانچہ موسم گرما میں اب مکہ مکرمہ کے اکثر اکابر و عمائد طائف چلے جاتے ہیں۔

اس طرح پر حکومت نے مکہ سے مدینہ اور مدینہ سے ینبوع تک بھی نئی سڑکیں بنا دی ہیں۔

اصلاحات حرم — سلطان ابن سعود نے حرم میں بھی اصلاحات کی ہیں۔ حرم کے انتظامات کیلئے ایک مجلس ادارۃ الحرم کے نام سے قائم کر دی گئی ہے۔ یہ مجلس وہاں کے انتظامات کی ذمہ وار ہے حرم کعبہ میں دو قسم کی اصلاحات ہوتی ہیں۔ تعمیری اور انتظامی۔ تعمیری اصلاحات کے سلسلہ میں تین امور اہم ہیں:-

۱۔ حرم کا موجودہ رقبہ ضروریاتِ حاضرہ کیلئے کافی نہیں ہے۔ حجاج بیت اللہ کی تعداد روز زیادہ ہوتی ہے۔ اور جگہ کم۔ اس دقت کو رفع کرنے کیلئے حکومت نے اطراف حرم کے بعض مکان خرید کر لئے ہیں۔ تاکہ صحن حرم کی توسیع عمل میں آ سکے۔

۲۔ حرم کے گرد متعدد مکان کئی کئی منزل اُونچے بنے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے بیت اللہ کی رونق و عظمت پُوری طرح سے ظاہر نہیں ہوتی۔ حکومت نے فیصلہ کر لیا کہ بتدریج اطراف کے یہ مکانات خرید کر کے منہدم کر دیئے جائیں

چنانچہ اس سلسلے میں بعض مکانات گر چکے ہیں۔ بقیہ اپنے وقت پر گر جائیں گے۔

۳۔ مسجد الحرام کی صحن پر چھت نہ تھی۔ صرف اطراف کے دالان تھے۔ لیکن وُہ بھی دھُوپ کی مداخلت سے محفوظ نہیں تھے۔ دھُوپ اور گرمی کیوجہ سے حاجیوں کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اکثر لوگ بیمار ہو جایا کرتے تھے۔ اب سلطان نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ چاروں طرف دالانوں کے سامنے پتلے پتلے آہنی ستون کھڑے کئے جائیں۔ اور اُن پر ۱½ میٹر لمبا شامیانہ نصب کر دیا جائے۔ یہ شامیانہ دن کو تان دیا جائے گا۔ اور رات کو اُٹھا دیا جائے گا۔ تاکہ ہوا بند نہ ہو۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ کم از کم پچیس ہزار آدمی بیک وقت سایہ میں بیٹھ سکیں گے۔

حرم کے صحن میں سنگ ریزوں کا فرش تھا۔ جسکی وجہ سے گرمی بھی زیادہ رہتی تھی۔ اور پوری طرح صفائی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ سلطان نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ سنگ ریزے اُٹھا کر تمام فرش پر سیمنٹ بچھا دیا جائے۔ سیمنٹ بچھانے کی مشین یورپ سے آ چکی ہے۔

حرم میں متعدد انتظامی اصلاحات بھی ہوئی ہیں۔ اُن میں سے صرف بعض کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

۱۔ ابتک کعبہ کے اندر داخل ہونے کیلئے حاجیوں کو روپیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ سلطان نے اس کو ناجائز قرار دیدیا ہے۔ کوشش ہو رہی ہے۔ کہ تمام حاجی ایک پیسہ بھی ادا کئے بغیر بیت اللہ میں داخل ہوں۔

۲۔ معلّموں کو حکومت سے اجازت اور سند لینی پڑتی ہے۔ معلّموں کا لباس اور علامات مقررہ ہیں مقررہ اُجرت سے زیادہ لینے والے معلّموں کو سزا دیجاتی ہے۔

۳۔ خواجہ سراؤں کی تعداد جو حرم کعبہ کی خدمت پر مامور ہیں۔ بہت زیادہ تھی اُن میں کمی کر دیگئی ہے

۴۔ حرم میں بہت سے امام مقرر تھے۔ بعض کی ضرورت نہ تھی۔ صرف دس امام حرم میں نماز کے لئے کافی سمجھے گئے ہیں۔ باقی موقوف کر دئے گئے۔

۵۔ حرم کعبہ کے امام اور خدام حاجیوں سے وظائف و ہدایا قبول کر لیا کرتے تھے۔ اب اس وصُولی کو ناجائز قرار دیدیا گیا ہے۔ سب مقررہ سرکاری تنخواہ پر کام کرینگے۔

۶۔ فراشوں کی تنخواہ کم تھی۔ اسلئے وُہ توجہ سے کام نہیں کیا کرتے تھے۔ اُنکی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ کوشش ہو رہی ہے کہ صفائی کا انتظام بہتر سے بہتر ہو۔

۷۔ مکبّروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مناسب تخفیف کر دیگئی ہے۔

۸۔ حرم میں کل اٹھائیس دروازے ہیں۔ چار دروازے گرد کے مکانات والوں کے ہیں۔ اُن کو حکومت

نے ہدایت کی کہ اپنے دروازوں پر دربان مقرر کریں۔ تاکہ یہ دروازے عام گذرگاہ نہ بن جائیں۔ باقی دروازوں پر بھی حکومت نے خود دربان مقرر کردئیے ہیں۔ تاکہ انتظام قائم رکھیں۔ غرض یہ ہے۔ کہ بیت اللہ خدا کی عبادت کے لئے مخصوص رہے۔ شارع عام نہ بن جائے۔

۹۔ مسجد الحرام میں سونا قطعی ممنوع کردیا گیا ہے۔ شرعاً وہ پردیسی جو کوئی جائے پناہ نہ رکھتے ہوں۔ مسجد میں آرام کرسکتے ہیں لیکن حج کے دنوں میں مختلف ممالک سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ آتے ہیں۔ ہر آنیوالا یہی عذر پیش کرسکتا ہے۔ اس لئے عام ممانعت کردیگئی ہے۔ صرف اعتکاف کرنیوالے اس سے مستثنےٰ ہیں۔

۱۰۔ حکومت نے حرم کی نگرانی کیلئے چند مفتش مقرر کردئیے ہیں۔ تاکہ انتظام قائم رکھیں۔ اور ضروری امور کو سرانجام دیں۔

پانی حجاز کا سب سے اہم مسئلہ پانی کی قلت ہے۔ حکومت نے تجویز کیا ہے۔ کہ مختلف مقامات پر جدید وضع کے کوئیں کھودے جائیں۔ لیکن کیونکہ صرف کوئیں ملک کی ضرورت کے لئے کافی نہیں ہوسکتے۔ اسلئے برسات اور پہاڑی سیلاب کا پانی محفوظ کرنے کیلئے بڑے بڑے تالاب بھی بنائے جائیں۔ اس اسکیم پر عملدرآمد شروع ہوچکا ہے۔ وادی نعمان شہدا وغیرہ میں متعدد کوئیں تیار ہوچکے ہیں۔

نہر زبیدہ چونکہ نہر زبیدہ مکہ معظمہ میں میٹھے پانی کا تنہا منبع ہے۔ لہذا اسکی حفاظت اور ترقی کے لئے سلطان ابن سعود نے خاص توجہ کی ہے۔ یہ نہر مسقّف تھی لیکن پھر جا بجا سے کھل گئی تھی۔ اسکو بالکل بند کرنا مشکل ہے کیونکہ ہزاروں آدمی وہاں سے پانی پیتے ہیں لیکن لوگ اس میں میلے کپڑے بھی دھوتے اور نہاتے تھے۔ اُن کی نگرانی ناممکن ہے۔ لہذا حکومت نے طے کرلیا کہ عرفات میں ایک بڑا تالاب بنایا جائے نہر کا تمام پانی جدید ترین صحی اصول پر اُس میں صاف کرلیا جائے۔ یہ پانی صاف ہونے کے بعد آگے بڑھے اس تدبیر کا لازمی فائدہ یہ ہوگا۔ کہ اہالیان مکہ اور حاجیوں کی صحت پر بہت خوشگوار اثر پڑیگا۔

زمزم چاہ زمزم کی موجودہ صورت یہ ہے۔ کہ اس پر سایہ کا کوئی انتظام نہیں۔ پانی ڈول سے نکالا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ پانی غلیظ رہتا ہے۔ اور بہت کم مقدار میں دستیاب ہوتا ہے۔ حکومت نے تجویز کی ہے۔ کہ پانی نکالنے کی جدید ترین مشین نصب کی جائے۔ حرم کے چاروں طرف نل پھیلا دئے جائیں اور اُن میں پانی جاری کردیا جائے۔ اگر یہ تجویز پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ تو اس کا لازمی فائدہ یہ ہوگا۔ کہ حاجی بغیر کسی زحمت کے جس وقت چاہیں گے زمزم کا پانی پی سکیں گے۔

سایہ کا انتظام حجاز کی نئی حکومت نے یہ تجویز بھی کی ہے۔ کہ منیٰ عرفات، مزدلفہ، مکہ اور جدہ کے مابین حاجیوں کیواسطے بڑے بڑے دیوان تعمیر کئے جائیں تاکہ وُہ اُن کے نیچے دھوپ سے پناہ حاصل کر سکیں۔ ہر سال موسم حج کے دنوں میں متعدد حاجی دھوپ کی تپش سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ انتظام ہو گیا۔ تو دھوپ اور گرمی کی مصیبت سے بڑی حد تک نجات ہو جائیگی۔

(۵) اصلاحات حجاز پر ایک اجمالی نظر

سلطان ابن سعود چاہتا ہے۔ کہ مندرجہ بالا اصلاحات کو اپنے ملک میں جلد از جلد نافذ کر دے بعض کیلئے تو عملی کام بھی شروع ہو چکا ہے بعض کیلئے ابھی مزید غور و فکر درکار ہے لیکن ہندوستان کے باشندوں کے لئے اصلاحات کی پُوری اہمیت سمجھنے کیلئے ضروری ہے۔ کہ اتنی بات کو نظر انداز نہ کریں کہ حجاز ایک ایسی سرزمین ہے۔ جہاں صدیوں سے اصلاح و تہذیب کا نام نہیں سُنا گیا۔ حجازیوں کے مزاج بگڑے ہوئے ہیں طبیعتیں اتنی سرکش ہیں۔ کہ ادنیٰ سی بات پر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ حکومت کی معمولی سی غفلت اُنہیں بے لگام کر دیتی ہے۔ ایک مُدت سے قانون اور امن عامہ مفقود ہے۔ ہر طرف فساد و اختلال کے آثار نظر آتے ہیں۔ لوگ قانون کی پابندی کے عادی نہیں اعتدال اور سلامت روی کی راہیں نہیں جانتے۔ تعلیم و تربیت کے فقدان کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ دیانتدار اور قابل کارکُن میسر نہیں آ سکتے ظاہر ہے کہ دیانت شعار کارکنوں کے بغیر لائحہ اصلاح پر عملدر آمد ہونا محال ہے۔

ترکوں کے عہد میں ذمہ وار عہدوں پر ترک افسران ممتاز ہوتے تھے۔ صدیوں کی غلامی نے حجازیوں میں احساس ذمہ داری باقی نہیں رہنے دیا۔ حجازی بالعموم وثوق اور بھروسے کے قابل نہیں ہوتے تعلیم اس قدر کم ہے۔ کہ بہت کم لوگ لائق اور کاردان ہیں۔ اگر سلطان چاہتا تو ممکن تھا کہ نجد سے قابل لوگ بھرتی کرلئے جاتے اور وُہ حجاز میں سرکاری خدمات سرانجام دیتے۔ لیکن سلطان کا منشا یہ ہے۔ کہ حجازی زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنے ملک کے نظم و نسق میں حصّہ لیں۔ اور انہی مراعات اور حقوق سے متمتع ہوں۔ جو کہ نجدیوں کو پیشتر سے حاصل ہیں۔ چنانچہ واقعہ ہے۔ کہ ابن سعود نے حجاز کے باشندوں کو بلا کسی اندرُونی یا بیرونی تحریک کے بہت سے حقوق عطا کر دئے ہیں۔

اصلاح کا کوئی قدم اطمینان بخش طریق سے نہیں اُٹھ سکتا تاوقتیکہ کافی مال و دولت موجود نہ ہو۔ حالت یہ ہے کہ حجاز کے ملکی محاصل بہت ہی کم ہیں۔ ملک کا بیشتر حصّہ قابل زراعت نہیں نتیجہ یہ ہے۔ کہ خام اجناس وافر نہیں ہوتیں۔ صنعت و حرفت مفقود ہے۔ تجارت کی راہیں مسدود ہیں۔ باشندے بمشکل

تمام گذران اوقات کرتے ہیں۔ حجاز کی آمدنی کا زیادہ تر حصہ حج پر ہے۔ حاجیوں کا بھی وُہ حصہ جو خاص عرب سے حج کیلئے آتا ہے حجاز کیلئے منفعت بخش نہیں پچاس ساٹھ ہزار کے قریب حاجی ہر سال بیرونی ممالک سے آتے ہیں۔ اُن کا بھی بیشتر حصہ غربا پر مشتمل ہوتا ہے چنانچہ حج کے تمام محاصل ملک کے نظم و نسق اور اصلاح کی جملہ ضروریات کے لئے مکتفی نہیں ہوتے۔ یہ سلطان ابن سعود کا علو حوصلہ ہے کہ وُہ اصلاح کیلئے قدم اُٹھاتا ہے لیکن ملک کی بے بضاعتی اور فرومائگی کیوجہ سے ہر قدم پر بیشمار دقتیں پیدا ہوتی ہیں پھر بھی جہانتک ممکن ہوسکتا ہے سلطان اپنی طرف سے فروگذاشت نہیں کرتا۔

باب بست و نہم

عراق اور اخوان کی آویزش

سنہ ۱۹۲۷ء کے موسم خزاں میں وُہ وقت شروع ہوا جسے بجا طور پر سلطان ابن سعود کے عہد فرمانروائی کا سب سے نازک زمانہ کہہ سکتے ہیں اپنے سیاسی مخالفین مثلاً خاندان رشید والئے حائل اور خاندان شریف کے مقابلے میں اُس نے اپنی طاقت و سطوت ثابت کر دی تھی۔ دنیائے اسلام میں بھی اپنے لئے جگہ پیدا کر لی تھی۔ غیر ممالک کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات روز افزوں ترقی پر تھے۔ لیکن اب اپنی رعیت کے ایسے آدمیوں سے مقابلہ درپیش تھا جن کیوجہ مخاصمت ذاتی یا خاندانی نہیں تھی۔ بلکہ محض مذہبی تھی۔ وہابیوں میں ایک جماعت انتہا پسند ہے۔ وُہ عراق اور شرق یردن وغیرہ ممالک کے ساتھ مصالحت کرنیکے سخت خلاف تھی۔ اس جماعت میں فتنہ و فساد کی آگ مشتعل ہوئی۔ تو انگریزی مدبروں اور عراقی حکومت کو فکر لاحق ہوئی۔ ابن سعود بھی اس فتنہ کو جلد از جلد رفع کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن کامل دو برس کی جدوجہد سے معاملات رُو بہ اصلاح ہوئے اگر یہ بغاوت کامیاب ہو جاتی تو خاندان سعود کا نام صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جاتا۔

حکومت نجد نے عراق کیساتھ جو معاہدہ بحرہ کے مقام پر سنہ ۱۹۲۵ء میں کیا تھا۔ اُسکی متابعت میں وہابیوں نے پُورے دو برس تک عراق کی سرحد پر کوئی یورش نہ کی۔ لیکن عراق کی حکومت اپنی رعیت کو سنبھال نہ سکی۔ بالخصوص قبیلہ

شمار ہیں نے اپنے وطن جبل شمار سے ہجرت کر کے عراق میں سکونت اختیار کر لی تھی موقعہ بموقعہ نجدیوں کو لوٹ مار کرتا رہتا تھا
ان پر پورا قابو اور اقتدار حاصل کرنے کیلئے حکومت عراق نے چاہا کہ سرحد پر چند پولیس کی چوکیاں قائم کر دے۔ جب
چوکیاں تعمیر ہو چکیں۔ تو حکومت نے وہاں سے تار برقی کے کھمبے لگا دیئے۔ غرض یہ بیان کیگئی کہ تار برقی کے ذریعہ سے
شتر سواروں اور ہوائی جہازوں کی نقل و حرکت میں بہت سہولیت ہو جائیگی۔ اور اس وجہ سے عراقی قبائل نجد پر حملہ آور
نہ ہو سکیں گے۔ اولاً بوسیہ اور ابو گھر کے دو مقامات منتخب کئے گئے۔ تجویز یہ تھی کہ یہ سلسلہ ۱۹۲۷ء کے موسم خزاں تک
مکمل ہو جائے۔

بعض اخوان شروع ہی سے نجدی عراقی مصالحت کے خلاف تھے اور عراق پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔ ان
چوکیوں کی تعمیر سے انکی نگاہ میں نہایت معقول بہانہ ہاتھ آیا۔ ۱۹۲۲ء کے معاہدہ عقیر میں فریقین کے مابین قرار پایا
تھا کہ وہ سرحد کے مقامات پر چوکیاں قائم نہ کرینگے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ حکومت نجد کو بھی اپنی محافظت کے متعلق
خطرہ محسوس ہوا۔ ریاض کے اکابرین نے خیال کیا۔ کہ ابن سعود نے واقعی عراق کے ساتھ معاہدات کرنے میں غلطی کی
اور کہ انتہا پسند وہابیوں کے اندیشے درست تھے۔

لیکن جب حکومت عراق ان حالات سے مطلع ہوئی۔ تو اس نے چوکیوں کو اٹھانا نہ چاہا۔ عراق کے
مشیر سمجھتے تھے کہ بوسیہ کا فاصلہ نجد کی سرحد سے ۵۰ میل ہے اور ابو گھر نوے میل کی مسافت پر ہے۔ اسلئے ان مقامات
کو سرحدی مقامات نہیں کہا جا سکتا۔ اسلئے وہ ان کے استحکامات کے بارے میں حق بجانب ہیں۔ اور انہیں نجدیوں
کے نقطہ نگاہ کو صحیح تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں۔

حکومت عراق کے انکار کو بعض نجدیوں نے غنیمت جانا۔ یہ لوگ سیاست کے مقابلے میں صرف طاقت
کو سمجھتے تھے۔ انہوں نے صدر مقام سے احکام حاصل کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ ۵ نومبر ۱۹۲۷ء کو ایک سو اخوان
فیصل الدویش کی قیادت میں بوسیہ پر ٹوٹ پڑا۔ عراق کی سرکاری اطلاع کے مطابق بوسیہ کی چوکی میں اس وقت
چھ پولیس کے سپاہی ایک اور بیمار عرب مزدور اور ایک عورت تھی۔ اخوان نے ان سب کو تہہ تیغ کر دیا۔ اور
چوکی کو مسمار کر دیا۔

جب یہ خبر مشہور ہوئی تو عراق میں شور برپا ہو گیا۔ عراق کے سرحدی قبائل اخوان کے خوف سے اندرون
ملک میں بھاگ گئے۔ عراق کی رائے عامہ انگریزی حکومت کو ایسے نازک وقت میں خاموش رہنے پر مطعون کر رہی
تھی۔ مطیری اخوان نے تقریباً ایک مہینہ بعد کویت کی حدود میں جہرہ نامی مقام پر حملہ کر دیا۔ حالانکہ وہابیوں کو

ریاست کویت کیخلاف کوئی شکایت نہیں تھی۔ اسی قبیلہ نے ۹ دسمبر کو بنی شثیم نامی گڈریوں کے ایک امن پسند قبیلہ کو لوٹ لیا۔ اخوان نے صرف اسی پر بس نہ کیا۔ بلکہ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۷ء کو مطیر کے شیخ فیصل الدویش نے جمیمہ کے مقام پر بہت سے عراقی گڈریوں کو لوٹ کر قتل کر دیا۔ بچوں تک کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ کوئی مرد زندہ نہیں رہنے دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ فیصل الدویش اور اس کے ہمراہی نہ تو ابن سعود کی اطاعت میں تھے۔ اور نہ ہی عراقی حکومت کی پرواہ کرتے تھے فیصل الدویش بالکل خود مختارانہ حیثیت سے قتل و غارت کرتا تھا۔

اس قسم کی کارروائیوں سے تمام عراق میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی آخر کار انگریزوں اور عراقیوں نے نجدیوں کے خلاف ایک مشترکہ مہم تیار کی۔ بعد میں تجربہ نے ثابت کیا کہ عراق کی سپاہ محض بیکار ہے۔ اس لئے یہ تجویز قرار پائی کہ صرف ہوائی جہاز نجدی قبائل کا تعاقب کریں۔ اور سرحد پر اخوان کی نقل و حرکت دریافت کرنے کیلئے گشت کرتے رہیں۔

جب انگریزوں کے ہوائی جہازوں نے اندرون نجد تک پرواز کی۔ تو ابن سعود نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ وہابی انگریزوں کی مداخلت کو سخت توہین خیال کرتے تھے۔ اور عراق پر حملہ کرنا چاہتے تھے لیکن ابن سعود نے بڑی کوشش سے اُن کے بڑھتے ہوئے غم و غصّہ کو قابو میں رکھا۔

اس عرصہ میں بھی نجدیوں کی تاخت و تاراج جاری رہی۔ آواخر جنوری ۱۹۲۸ء میں قبیلہ مطیر کے اخوان نے کویت کے علاقہ کو لُوٹ لیا۔ ہوائی جہازوں نے تعاقب کیا۔ اور مال غنیمت کو دم بھر میں اخوان سے رکھوا لیا۔ ۱۹ فروری کو نجدی سپاہ نے عراق اور کویت کی مشترکہ افواج کو جریشن کے مقام پر جو بصرہ کے جنوب مغرب میں پینتالیس میل کے فاصلہ پر ہے لُوٹ لیا۔ اس معرکہ میں عراق کے اٹھائیس آدمی مارے گئے۔ ۵۷۹۵ بھیڑیں۔ ۶۹۹ اُونٹ۔ ۲۹ بندوقیں اور ۲۶م خیمے نجدیوں کے ہاتھ آئے۔ ہوائی جہازوں نے پھر تعاقب کیا اور گولہ اندازی کی ۲۴ فروری کو ہوائی جہاز نجد کے صفا نامی مقام تک پہنچ کر گولہ باری کرتے آئے۔ یہ جگہ نجد کی سرحد کے اندر ۱۳۰ میل کے فاصلہ پر واقعہ ہے۔

اس طرح یہ فتنہ و فساد کی آگ بڑھتی گئی عراقی نجدیوں کے حملے روک تو نہ سکتے تھے لیکن ہوائی جہازوں کے ذریعے سے تعاقب کر کے انہیں سزا خوب دیتے تھے۔ نجدی جنگ کیلئے تلے ہوئے تھے۔ اور ہوائی گولہ باری کا سخت انتقام لینا چاہتے تھے۔ جنگ عظیم کے بعد صورت حالات کبھی ایسی نہ ہوئی تھی۔ افواہیں مشہور ہوئیں کہ نجدی جہاد کرنے والے ہیں۔ اور عبدالعزیز ابن سعود خود انکی قیادت کریگا عراق شرق یردن اور کویت کے

اخبارات نے سنسنی خیز خبریں شائع کیں حسنِ اتفاق یہ ہے کہ تمام افواہیں غلط ثابت ہوئیں بصرہ اور یروشلم کے اخبار نویسوں نے اپنے جریدوں کی اشاعت بڑھانے کیلئے بہت مبالغہ سے کام لیا تھا۔ اور اخبار کی صحت کا خیال نہ رکھا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہابیوں کی ایک انتہا پسند جماعت جو شروع سے ابن سعود کی مصالحانہ روش کے خلاف تھی جنگ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ابن سعود خوب جانتا تھا۔ کہ ایسے ملک پر حملہ کرنا آسان نہیں جسکی محافظت ہوائی جہازوں پر منحصر ہو۔ انگریزوں نے باہمی گفت وشنید کیلئے بارہا دعوت دی تھی۔ آخر کار ابن سعود کو ماننا پڑا۔ ۱۴ اپریل ۱۹۲۸ء کو اُس نے باقاعدہ طور پر انگریزی حکومت کو اطلاع دی۔ کہ وہ اپنے قدیم دوست سر گلبرٹ کلیٹن سے نجد وعراق کا مناقشہ دُور کرنیکی غرض سے گفت وشنید کرنے کو تیار ہے۔

قرار پایا کہ سر گلبرٹ کلیٹن عراق اور شرق یردن کے نمائندوں کی معیّت میں ماہِ مئی میں جدّہ آئیں۔ اور ابن سعود سے ملاقات کریں۔ نجدیوں کیلئے یہ نہایت نازک موقعہ تھا کیونکہ اگر انگریزی سفیر کے ساتھ سمجھوتہ نہ ہو تو ملک کی اندرونی پیچیدگیاں بڑھ جانیکا سخت احتمال تھا۔ پولیس کی چوکیوں کی نسبت فریقین کا تصفیہ نہ ہو سکا۔ حج کا موسم قریب تھا۔ سر گلبرٹ کلیٹن کو آواخر مئی میں بغیر کوئی خاص تصفیہ کئے جدّہ سے رخصت ہونا پڑا۔ ابن سعود چوکیوں کے متعلق انگریزوں کی تاویل کو درست نہیں تسلیم کرتا تھا۔ سر گلبرٹ کہتا تھا۔ کہ ان چوکیوں کی تعمیر سے معاہدہ عقیر کی پیمان شکنی نہیں ہوتی۔ اور سرحد سے مُراد زیادہ سے زیادہ پچیس میل کا فاصلہ ہو سکتا ہے۔ حج کے بعد سر گلبرٹ کلیٹن پھر جدّہ آئے۔ اور یکم اگست ۱۹۲۸ء کو ابن سعود سے ملاقات کی۔ لیکن پھر بھی کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ فریقین کا نقطہ نگاہ ایک دوسرے سے متضاد واقع ہُوا تھا۔

ابن سعود کو بڑی دقّت واقع ہوئی۔ اُس کا طریق کار ناکام ثابت ہُوا تھا۔ وُہ جنگ کی اجازت بھی نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں جدید اسلحہ اور عسکری نظام کے فقدان کیوجہ سے نجد کی شکست یقینی بات تھی آخر کار اُس نے فیصلہ کر لیا کہ عوام کے مشورے سے اس گتھی کو سلجھائے وُہ جانتا تھا کہ لوگ اسکی مرضی کیخلاف ہیں تو موٹر کار کے ذریعہ سے حجاز سے ریاض پہنچا۔ ۵ نومبر ۱۹۲۸ء کو ریاض میں ایک عظیم اجتماع طلب ہُوا۔ علماء اور اکابرین جمع ہوئے۔ اخوان کی تمام آبادیوں سے نمائندے بلائے گئے تھے۔ لیکن بعض سر برآوردہ نجدی حاضر نہ ہوئے چنانچہ قبیلہ مطیر کا شیخ فیصل الدویش قبیلہ عتیبہ کا شیخ سلطان ابن بجاد اور قبیلہ عجمان کا شیخ وہیدان ابن حثلین غیر حاضر تھے۔ ناظرین کو معلوم ہو کہ یہ لوگ وہابی سلطنت کی برگزیدہ اور زبردست شخصیتیں ہیں اُنکی غیر حاضری معنی خیز تھی۔ اور بغاوت اور سرکشی پر محمول کیگئی۔ یہی وُہ لوگ ہیں جو ابن سعود کے بہترین مؤیّد اور حامیِ کار رہ چکے تھے۔ اب وہابیوں میں خانہ جنگی ناگزیر تھی۔

باب سوم

وہابیوں میں خانہ جنگی

سلطان ابن سعود نے ریاض میں اپنی قوم کے اکابرین کا ایک عظیم اجتماع کیا۔ نجد کی یہ کانفرنس انتہائی تدبر کا نتیجہ تھی۔ اس میں ابن سعود کی جرأت و جسارت اور اخلاص و صداقت کا بے نظیر مظاہرہ ہُوا۔ واقعہ یہ تھا کہ سلطنت سعودیہ کو واقعی خطرہ لاحق تھا۔ عوام میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی کئی دن تک مشاورت ہوتی رہی۔ ایک دن ابن سعود نے کہا:۔

"میں تم میں سے کسی سے بھی خائف نہیں ہوں۔ کیونکہ میں نے ایزدِ متعال کے فضل و کرم سے تن تنہا سلطنت پیدا کی ہے میں نے احکام الٰہی کے مطابق اسکی خشیت کیوجہ سے تمہیں طلب کیا ہے تاکہ میں نخوت او غرور میں نہ پڑ جاؤں"۔

عوام اس تقریر سے بہت متاثر ہوئے۔ ابن سعود نے تقریر شروع رکھتے ہوئے کہا:۔

میں چاہتا ہوں کہ تم اس بات پر بھی غور کر لو کہ آیا میں حکمرانی کے قابل ہوں یا نہیں۔ اگر میں اس لائق نہیں۔ تو میرے خاندان میں سے کسی ایک کو منتخب کر لو میں اپنی بجائے اُسے تخت نشین کر دونگا۔ اور اُسے پوری امداد دُونگا"۔

بہت سے آدمی یک زبان ہو کر بولے:۔

"نہیں نہیں۔ ہمارے سردار ہم تمہارے سوا کسی اور کی فرمانروائی نہیں چاہتے

کانفرنس کے ارکان نے ابن سعود کی پالیسی کے متعلق ہر ایک بات پر بحث و تمحیص کی۔ لیکن بالآخر سلطان کی تجویز ہی درست تسلیم ہوئی۔

سلطان چاہتا تھا۔ کہ وائرلیس تمام قلمرو میں رائج کر دی جائے۔ اُسے بخوبی معلوم تھا کہ عرب جیسے وسیع ملک کیلئے وائرلیس کا اجرا نہایت ضروری ہے لیکن سوال یہ تھا کہ نجدیوں کو اسکے جواز کا یقین کیونکر دلایا جائے۔ بالآخر معاملہ علمائے شریعت کے رُوبرو پیش کیا گیا۔ انہوں نے متفقہ طور پر فتویٰ دیا۔ کہ شریعت

کی رُو سے وائرلیس کا استعمال ناجائز نہیں ہے۔

اسکے بعد سلطان نے نظم و نسق کے متعلق اپنی تجاویز پیش کیں۔ اور ہمسایہ طاقتوں کے متعلق اپنا نقطہ نگاہ بیان کیا۔ حاضرین جلسہ نے سلطان کی آرا اور تجاویز سے اتفاق رائے کیا۔ لیکن مطیر عجمان اور عتیبہ کے قبائل متفق نہ ہوئے۔ وہ کہتے تھے کہ عراق۔ کویت اور شرق یرون کے مشرکین کے ساتھ صلح کرنا بہر صورت ناجائز ہے اگر ریاض کے سہل انگار باشندے جہاد نہ کرنا چاہیں۔ تو نہ کریں۔ وہ خود جنگ کرینگے اُنکے اس رویئے سے سلطان ابن سعود کی کھلی توہین ہوتی تھی۔ اس خیال کے بڑے حامی حمید شیخ عتیبہ اور فیصل الدویش شیخ مطیر تھے۔ اول الذکر غطغط کی قدیم ہجرہ کا اور موخرالذکر ہجرہ ارطاویہ کا افسر اعلیٰ تھا۔ انہوں نے اخوان کو سلطان کے خلاف مشتعل کیا۔ اور بعض لوگ اُنکے حامی بھی ہو گئے۔ رفتہ رفتہ سلطنت ریاض کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی۔

سلطان ابن سعود ان لوگوں کی سابقہ خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جنگ کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ لوگ اپنے آپ کو چپکے سے حکومت کے حوالہ کر دیں۔ اور علماء دین کے سامنے اپنے افعال کیلئے جواب دہ ہوں۔ لیکن سلطان کی مصالحت کارگر نہ ہوئی۔ مجبوراً جنگ کیلئے تیار ہونا پڑا۔ جنگ کی تیاری سلطان نے بڑے حزم و احتیاط سے کی کیونکہ اگر کسی فروگذاشت کیوجہ سے اُسے شکست ہو جاتی تو پھر سلطنت کا قیام مشکل تھا۔ اپریل ۱۹۲۹ء تک جنگ کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اُس وقت باغی ارطاویہ اور زلفی کے درمیان فروکش تھے۔ سلطان کی سپاہ کے مختلف دستے مختلف مقامات سے باغیوں کی طرف بڑھے سبیلا کے مقام پر فریقین کی مٹھ بھیڑ ہوئی۔ باغی جان توڑ کر لڑے لیکن تعداد میں کم تھے سینکڑوں کھیت رہے فیصل الدویش سخت زخمی ہوا۔ افواہ پھیل گئی کہ وہ مر گیا ہے۔ اس کا بیٹا بندر بھی مارا گیا۔ ابن بجاد بھاگ نکلا۔ لیکن گرفتار ہو کر ریاض میں محبوس ہوا اب تک وہیں مقیم ہے۔ اور مختلف شیوخ اور اُمرا کے ساتھ جو متعدد لڑائیوں میں گرفتار ہو کر ابن سعود کے پاس رہائش رکھتے ہیں۔ آرام و عافیت کی زندگی بسر کرتا ہے

فیصل الدویش کی زبوں حالت پر ابن سعود کے دل میں کرم و رحم کے جذبات موجزن ہوئے چنانچہ اُسے معاف کر دیا گیا۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ نامور شجاع جو متعدد جنگوں میں کارہائے نمایاں کر چکا ہے۔ چند روز میں مر جائیگا۔ فیصل الدویش کی معافی سے بہت خوشگوار نتائج پیدا ہوئے۔ ابن سعود سے عوام کی عقیدت بڑھ گئی ابن سعود نے اپنے ایک بھائی کو باغیوں کی بیخکنی کیلئے مامور کیا۔ اور حکم دیا کہ غطغط کی ہجرہ کو تہہ و بالا کر دیا جائے ابن سعود ضروری احکام جاری کرنے کے بعد حج کیلئے چلا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اُس نے سُن لیا۔ کہ بغاوت

جیسے وہ اپنے خیال کے مطابق فرو کرچکا تھا۔ ازسرنو پھوٹ پڑی ہے۔

فیصل الدویش نے زخموں کیوجہ سے تکلیف تو بہت اٹھائی لیکن اس قدر سخت جان تھا کہ بچ نکلا۔ بندر اس کا بیٹا بھی حقیقت میں مرا نہ تھا۔ صحیح سلامت موجود تھا۔ فیصل نے سلطان کے رحم کی قدر نہ کی بلکہ اسکی کمزوری پر محمول کیا ابن حامود ریاض میں قید تھا لیکن فرحان ابن مشور اسکی جگہ قائم ہو گیا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ صوبہ الحصاء کے عجمان نے بھی جو بدعہدی اور کینہ وری میں رسوائے عالم ہیں۔ بغاوت کا علم کھڑا کیا۔

فیصل کی قیادت میں مطیر اور وہیدان ابن ہتلان کی ماتحتی میں عجمان عراق عرب کے علاقوں پر چھاپہ مارتے رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس علاقے کو تاخت و تاراج کرنا ان کا پیدائشی حق ہے۔ رفتہ رفتہ انکی کارروائیوں کی اطلاع الحصاء کے حاکم عبداللہ ابن جلیوی کو ہوئی۔ یہ شخص بہترین منتظم شجاع حکومت ریاض کا وفادار اور ابن سعود کی ذات خاص کا عقیدت مند ہے۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ باغیوں کی سرکوبی کردی جائے۔ اور انہیں من مانی کارروائیوں کی اجازت نہ دی جائے لیکن جس طرح خود سلطان اپنے رسوخ سے ان لوگوں کی روک تھام نہ کر سکا تھا۔ اسی طرح پر عبداللہ بھی مصالحت میں ناکام رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی اضلاع میں پھر خانہ جنگی چھڑ گئی۔ عبداللہ نے الحصا کے شہروں سے اور قبائل بنی خالد مرۃ اور بنی حجر سے ایک لشکر تیار کیا۔ اور اپنے بیٹے فہد ابن جلیوی کی قیادت میں باغیوں کے مقابلے کیلئے بھیجا۔

سرار کے مقام پر جو دھیدان ابن ہتلان کا صدر مقام تھا۔ دونوں فوجیں بالمقابل ہوئیں جنگ سے پیشتر صلح کی ایک اور کوشش ہوئی۔ دھیدان چند سواروں کو ساتھ لیکر فہد ابن جلیوی کی قیام گاہ پر پہنچا۔ اور صلح کی گفت شنید شروع کی۔ اس دوران میں باغیوں میں افواہ پھیل گئی۔ کہ فہد ابن جلیوی دھوکہ سے ہیدان کو قتل کردینا چاہتا ہے۔ باغی مشتعل ہو کر فہد کی افواج پر حملہ آور ہوئے۔ اس کشمکش میں فہد نے دھیدان کو قتل کرادیا۔

یہ واقعہ عجمان کے خوابیدہ قبائلی جذبات کو برانگیختہ کرنے کیلئے کافی تھا۔ فہد کے ملازموں میں سے ایک عجمان نے اسی وقت اپنے آقا کا خاتمہ کردیا۔ اور باقی وفادار عجمان باغیوں سے جا ملے۔ اب شاہی افواج میں صرف الحصا کے باشندے رہ گئے تھے۔ رات بھر طرفین میں جنگ ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ طلوع آفتاب کے ساتھ حکومت کے لشکر کو میدان عجمان کے ہاتھوں ہی چھوڑ کر پسپا ہونا پڑا۔ اس طرح صحرائے عرب کا مشرقی حصہ پھر ایک دفعہ فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن گیا۔ اور سلطان عبدالعزیز جب حجاز سے واپس آیا۔ اسے ان

حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

نیف ابن ہثلان نے مقتول دھیدان کی جگہ سنبھال کر لوٹ مار اور غارتگری شروع کر دی۔ سلطان ابن سعود نے باغیوں کی سرکوبی کیلئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اور اپنے بڑے لڑکے اور ولی عہد امیر سعود کو باغیوں سے مدافعت کیلئے روانہ کیا۔ اور ساتھ ہی صوبہ الحصا کے گورنر کے فرائض بھی اسی کے سپرد کر دئیے۔ کیونکہ وفادار عبداللہ ابن جلیوی اپنے مرحوم بیٹے فہد کے صدمے سے صاحب فراش تھا۔ ادھر سلطان فضائی طاقت سے آئین شکن اخوان کی کامل بیخکنی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن قبل اسکے کہ سلطان مدافعتی اقدام اٹھاتا الحصاء کی وفادار فوجوں نے ۱۵ اکتوبر کو عجمان اور مطیر کی متحدہ طاقت کو شکست دیدی جس میں فیصل الدویش کا ایک اور لڑکا کام آیا۔ یہ غیر متوقع کامیابی مصیبتوں کے خاتمہ کی ابتدا ثابت ہوئی۔ فیصل نے بغاوت کو کامیاب بنانے کیلئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر حکومت کی فرمانروا فوجوں کے آگے کوئی پیش نہ چلی۔ عراق۔ کویت اور نجد کی حکومتوں میں سمجھوتہ ہو چکا تھا کہ باغیوں کی امداد نہ کی جائے۔

۴ نومبر کو سلطان عبدالعزیز کی قیادت میں وہابیوں کی طرف سے وسیع پیمانہ پر پیشقدمی کی گئی۔ سلطان نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے اپنی فوج کے دستوں میں نجد کی آبادی میں سے ہر فرقہ اور جماعت کے لوگ شامل کر لئے تھے۔ تاکہ اجتماعی طور پر تمام ملک حکومت کے احیاء اور بقا کے سلسلہ میں ہاتھ بٹا سکیں۔ باغیوں کی سلامتی صرف اسی میں تھی کہ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیں۔ منزل بمنزل وہ سب سرحد کویت اور عراق کے جنوب مشرقی کونہ میں گھیر کر جمع کر دئیے گئے۔ بچاؤ کے تمام وسائل مسدود ہو گئے تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا زخم خوردہ فیصل الدویش اتنی رسوائی کے بعد اپنے آپ کو سلطان کے حوالہ کر دیگا؟ نہیں یہ اسکی فطرت کے خلاف تھا۔ ۴ دسمبر کو مقام ریغئی پر شاہی لشکر سے اس کا مقابلہ ہوا۔ اور اسے بری طرح شکست اٹھانا پڑی اب وہ ایک عام مفرور تھا۔

اواخر سال میں باغیوں نے ہتھیار ڈال دئیے۔ وہابیوں کے آگے نہیں بلکہ فیصل الدویش اور دیگر سردار ہزارہا باغیوں کیساتھ کویت اور عراق کی سرحدوں کو عبور کر کے حکومت عراق اور انگریزوں کے آگے جھک گئے۔ مگر اس شرط اور ضمانت پر کہ انکے ساتھ انسانیت سوز سلوک نہ کیا جائیگا ابن سعود کے حوالے کر دئیے گئے۔ اس طرح نجد میں ایک طویل بغاوت فرو ہوئی فیصل الدویش کی سرگرمیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ عراق اور نجد کے مابین وجہ اختلاف دور ہوئی اور ہر دو ممالک میں دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے۔

باب سی ویکم

عرب اور عراق کے تعلقات

بغاوت کے خاتمہ کے بعد سلطان ابن سعود نے کویت اور عراق کی حکومتوں سے باغیوں کی حوالگی کا فوری مطالبہ کیا۔ عرب کی روایات کا تقاضا تھا کہ ان کی حفاظت کی کافی ضمانت مہیا کی جاتی کیونکہ ہر دو حکومتیں پناہ گزینوں کو محض اسلئے واپس نہیں کر سکتی تھیں کہ سخد میں انہیں قتل کر دیا جائے۔ یہ معاملہ بیحد کشیدگی کا باعث ہوا مگر انجام کار جنوری ۱۹۳۵ء میں جب سلطان نے باغیوں کے ساتھ حسن سلوک کا یقین دلا دیا۔ تو انہیں سپرد کر دیا گیا۔ اس مسئلہ کے حل ہو جانے کے بعد سلطان ابن سعود اور شاہ فیصل والئے عراق کے درمیان ایک تاریخی ملاقات کے اسباب مکمل ہو گئے۔ دونوں بادشاہوں نے ایک دوسرے کو کبھی نہیں دیکھا تھا چنانچہ ۲۲ فروری کو عراق کے ہائی کمشنر کی موجودگی میں "لوپن" نامی برطانوی جنگی جہاز پر دونوں بادشاہ اکٹھے ہوئے۔ ایک نظر میں دونوں کو معلوم ہو گیا۔ کہ ایک عرصہ تک غلط فہمی میں مبتلا ہو کر وہ دونوں خواہ مخواہ ایک دوسرے سے کھنچے رہے حالانکہ خاک پاک عرب کی عظمت اور محبت دونوں کے دلوں میں موجود ہے۔

ان خوشگوار حالات کے ہوتے ہوئے ابتدائی گفت و شنید میں کوئی چیز سد راہ نہ تھی۔ اگرچہ یہ بھی صحیح تھا۔ کہ خلیج فارس میں سخد اور عراق سے متعلقہ تمام مسائل ابھی طے نہ ہو سکتے تھے۔ بہرحال دوستانہ معاہدوں کا ایک خاکہ سا تیار کر لیا گیا۔ ہر دو ممالک نے ایک دوسرے کی آزادی کو تسلیم کر لیا تبادلۂ سفارت منظور کر لیا قبائلی بغاوت اور مفرورین کی واپسی کے متعلق باہمی سمجھوتہ کر لیا۔ اور متنازعہ فیہ امور کے تصفیہ کیلئے ایک دائمی سرحدی کمیشن کی تقرری منظور کر لی گئی۔

دونوں عرب بادشاہ اس ملاقات سے بیحد خوش ہوئے۔ شاہ فیصل اسلئے خوش تھا۔ کہ عراق محرب کے اتحاد کے متعلق اس کا دیرینہ خواب پورا ہوا۔ سلطان ابن سعود اسلئے خوش تھا۔ کہ عراق اور سخد کے پشتہا پشت کے تنازعات کا ایک قلم خاتمہ ہو گیا۔ دونوں بادشاہوں نے علیحدگی کی کیوقت ایک دوسرے کو تحفے تحائف دئے اس ملاقات کی کامیابی پر ہر چہار جانب سے مبارکباد اور تہنیت کے پیغامات آئے۔

اس واقعہ کے فوراً بعد وہابی سلطان کا مشیر شیخ حافظ وہبہ نجد و حجاز کے ناظم امور خارجہ کی معیت میں معاہدات کی تفصیلات طے کرنیکے لئے بغداد روانہ ہوا. گفت و شنید کے بعد ۱۸مارچ کو تمام معاہدے تیار ہو گئے. مگر دستخط کیلئے کافی عرصہ انتظار کرنا پڑا کیونکہ ایک طرف حکومت عراق کو بعض اندرونی معاملات سے دو چار ہونا پڑا تھا. اور دوسری طرف ۱۹۳۲ء میں حکومت برطانیہ سے علیحدگی کا معاملہ درپیش تھا.

اسی عرصہ میں عراق اور نجد کے درمیان پھر کشیدگی پیدا ہو گئی. واقعات اس طرح ہیں. کہ ۱۹۲۹ء کے آواخر میں فرحان ابن مشہر نجد سے بھاگ کر عراق میں پناہ گزین ہو گیا. اور اپنے آپ کو شاہ فیصل کے رحم پر چھوڑ دیا. شاہ فیصل نے سلطان نجد کے مطالبہ پر خود عمل نہ کیا. لیکن ابن مشہر کو ریاض چلے جانے کیلئے سمجھایا سجھایا اگرچہ وہابی سلطان نے ابن مشہر کی جان بخشی کا وعدہ کیا تھا. مگر وہ نہیں چاہتا تھا. کہ فیصل الدویش کے نقش قدم پر چل کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالے. آخر کار اس نے اسی امر پر آمدگی ظاہر کی. کہ شام سے ہوتا ہوا ابن سعود کے پاس آئے. مگر ابن مشہر کو شام کی کشش اور دلچسپیوں نے نجد نہ آنے دیا. اس طرح وہابیوں کو ایک آئینی شکار سے ہاتھ دھونا پڑا. قدرتی طور پر عراق اس الزام کا سب سے زیادہ مستحق تھا.

ان سب باتوں کے باوجود دونوں بادشاہوں کی ملاقات کے وقت سے ہر دو ممالک میں یک گونہ قربت پیدا ہو چکی تھی. چنانچہ اپریل ۱۹۳۱ء میں جنرل نوری پاشا السعید وزیر اعظم عراق ابن سعود کو ملنے کیلئے حجاز پہنچا. اور ۸ اپریل کو مکہ معظمہ میں دو معاہدوں پر دستخط کئے گئے.

اگرچہ سلطان ابن سعود اور شاہ فیصل کے درمیان دوستانہ معاہدہ ہو گیا تھا. لیکن شاہ فیصل کے بھائی امیر عبداللہ والئے شرق یردن سے کسی قسم کا تصفیہ نہ ہو سکا. بلکہ حالات نے ہر دو ممالک کے تعلقات کو اور زیادہ پیچیدہ کر دیا. مناسب معلوم ہوتا ہے. کہ نجد اور شرق یردن کے درمیان کشیدگی کا ذرا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا جائے.

اس سے پہلے یہ معلوم ہو چکا ہے. کہ ۱۹۲۱ء میں حائل کو فتح کرنے کے بعد وہابیوں نے اپنا اثر شرق یردن کی سمت پھیلانا چاہا تھا. مگر انگریزوں کی فضائی طاقت کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانا پڑی. اسی طرح ۱۹۲۵ء میں معاہدہ جدہ کے ذریعہ حکومت نجد اور حکومت شرق یردن نے باہمی مقابلہ کے سدباب کی کوشش بھی کی. پھر یہ بھی دیکھا جا چکا ہے. کہ ۱۹۲۷ء میں فیصل الدویش نے نجدی بدوؤں کی ایک جماعت کی مدد سے اپنے طور پر لوٹ مچا رکھی تھی. اب ایک شامی فرحان ابن مشہر نے غارتگری شروع کر رکھی تھی اس کا

ذکر اُوپر گزر چکا ہے۔ ۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء میں جرائم پیشہ بدوؤں کی ایک کثیر التعداد جماعت کی مدد سے اُس نے شرق یرون پر حملے شروع کر دیئے۔ اور بنی سخر وغیرہ قبائل کو بے حد نقصان پہنچایا۔ قدرتی طور پر اس کے جواب میں شرق یرون کے قبائل نے بھی لوٹ مار شروع کر دی۔ چنانچہ ہوتیت نے جوف پر حملہ کر دیا۔ جسے ابن سعود نے نہائت جانفشانی سے حاصل کیا تھا۔ اور جو ۱۹۲۵ء کے معاہدہ کی رُو سے نجد میں شامل ہو چکا تھا۔

صاف ظاہر ہے کہ اس وقت حکومت شرق یرون ہوتیت کی حرکات کی ذمہ دار نہ ہو سکتی تھی کہ وہابیوں کے غیض و غضب کا شکار ہوتی۔ اتفاق سے مارچ اور اپریل ۱۹۲۹ء میں حالات نے ایک اور پیچیدہ صورت اختیار کر لی یعنی فرحان ابن مشہر اور اُس کے ساتھی صحرائے عرب کو عبور کر کے کویت کی طرف گئے۔ جہاں اُنہیں فیصل الدویش ملا۔ اب اس تحریک کی ذمہ داری تمامتر ہوتیت پر عائد نہیں ہوتی تھی۔ اگرچہ یہ بھی صحیح تھا کہ جوف کے بعض قبائل مثلاً شہرارت اور رولا وغیرہ نے ابن مشہر کا ساتھ دیا تھا۔ مگر حالات اور واقعات کی ستم ظریفی یہ ہے۔ کہ یہ حملے عین اُس وقت ہوئے جبکہ سلطان ابن سعود وسطی اور مشرقی عرب میں باغیوں سے جان توڑ کر مقابلہ کر رہا تھا۔

ریاض میں یہ مشہور ہو گیا کہ حکومت شرق یرون باغیوں کی حمایت اور پشت پناہی کر رہی ہے اس سے دونوں حکومتوں میں اور غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ ابن سعود کو باغیوں سے زیادہ شرق یرون کے قبائل پر غم و غصہ تھا چنانچہ فیصل الدویش کی طرف سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ہوتیت پر دو زبردست انتقامی یلغاریں کی گئیں۔ اور اُسے بُری طرح پامال کر دیا گیا۔

اس عرصہ میں عراق انگریزوں کی وساطت سے نجد کے ساتھ گفتگوئے مصالحت کر رہا تھا۔ اِدھر برطانوی حکام چاہتے تھے۔ کہ نجد اور شرق یرون میں بھی صلح ہو جائے۔ چنانچہ انگریزی فضائی طاقت کے ذریعہ نجدیوں کو حملہ سے باز رکھا گیا۔ اور ۱۹۳۰ء میں عمان میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ ابھی کانفرنس کسی نتیجہ پر پہنچنے نہ پائی تھی۔ کہ ہوتیت والوں نے فضائی طاقت کی نظر سے بچ کر نجدیوں پر چھاپہ مار دیا وہابیوں کے جذبات اس واقعہ سے مشتعل ہو گئے۔ اور انہوں کو انتقام لینے کی اجازت مل گئی۔ اس طرح یہ کانفرنس ناکام رہی۔ نجد اور شرق یرون کے درمیان شکوک بڑھ گئے۔ اور حکومت عمان کی وقعت شرق یرون کے قبائل کی نظروں سے گر گئی۔

۱۹۳۳ء میں عمان اور ریاض کے درمیان ایک دفعہ پھر گفتگوئے مصالحت شروع ہوئی۔ آپس میں

دوستانہ معاہدہ ہُوا یا نہیں ہُوا۔ یہ ایک دوسرا سوال ہے۔ مگر اس تمام جنگ و جدل سے سلطان ابن سعود نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ اُسے اپنی وسیع مملکت میں جدید ترین ذرائع آمدورفت اور آلات پیغام رسانی سے کام لینا چاہئیے علماء نے اُسے اس امر کا فتویٰ دیدیا ہے۔ کہ شریعت کی رُو سے یہ باتیں جائز ہیں۔ چنانچہ اب وُہ ہوائی جہاز اور موٹر کاریں منگوا سکتا ہے۔ اور اپنی سلطنت کا گوشہ گوشہ وائرلیس کے ذریعہ ایک مرکز پر لا سکتا ہے۔

باب سی و دوئم

حجاز پر تمدّن جدید کی یورش

سلطان ابن سعود نے ابھی اپنی سلطنت میں آلات سائینس کی درآمد کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ کہ مغربی طاقتوں نے اپنے طرز عمل میں تبدیلی کرتے ہوئے سلطان کی آزادی کو تسلیم کر لیا اور اپنے سفیر بھیج دئے چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلا اقدام حکومت فرانس کا تھا جس نے آواخر ۱۹۲۹ء میں اپنا سفیر بھیج دیا۔ حکومت برطانیہ نے اسکی تقلید میں فروری ۱۹۳۰ء میں سر انیڈر یورائن کو اپنا پہلا سفیر بنا کر بھیجا۔

ہر غیر مسلم حکومت کے سفیر متعینہ جدہ کے پاس ایک مسلمان نمائندہ موجود ہے جو وقتاً فوقتاً مکہ معظمہ جا سکتا ہے۔ بعض مسلمان حکومتوں کی طرف سے تجویز پیش کی گئی تھی۔ کہ اُنکے سفیر مکہ شریف میں رہائش رکھیں لیکن سلطان ابن سعود نے کہا۔ کہ سفیر ہونے کی حیثیت سے سب یکساں سلوک کے مستحق ہیں۔

یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی ہے۔ کہ عرب میں سلطان ابن سعود کا استحکام اور دنیا میں عالمگیر کساد بازاری کی ابتداء ایک ہی وقت میں واقع ہوئی۔ عرب جیسے بے گیاہ مُلک میں نہ تو قدرتی ذرائع پیدائش ہیں۔ اور نہ ہی یہاں کے باشندے محنت و مشقت کے عادی ہیں۔ اگر ایسے ملک کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے تو پھر خیر و عافیت معلوم۔

وہابی سلطنت کے دشمنوں کیلئے یہ ایک سُنہری موقعہ تھا۔ کہ ابن سعود اور اسکی تباہ حال رعایا میں پھوٹ ڈال دی جائے۔ دوسرے لفظوں میں جزیرہ نمائے عرب کے ہر حصّہ میں غدر اور بغاوت کا احتمال

تاجر نالاں تھے تو دوسری طرف بدّو پریشان اور تباہ حال۔ لیکن اسکے باوجود ملک بھر میں امن رہا۔ اگر کوئی اور زمانہ ہوتا تو تمام ملک بغاوت، شورش اور ہنگامہ آرائی سے محشرستان بن گیا ہوتا۔ مگر سلطان عبدالعزیز کے عہد حکومت میں یہ چیز قصۂ پارینہ ہو چکی ہے۔

انجام کار سلطان ابن سعود کو ایسا طریقۂ کار اختیار کرنا پڑا۔ جو گذشتہ صدی کے وہابیوں کیلئے باعث صد ننگ و عار ہوتا۔ سردست یہ کہنا قبل از وقت ہے۔ کہ اس اقدام کا اثر مستقبل قریب میں نجد و حجاز پر کیسا پڑے گا۔ ۱۹۳۳ء میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک جماعت کو مراعات دی گئیں تاکہ وہ جدہ سے مکہ معظمہ تک ریلوے لائن تعمیر کر سکے۔ اس کیلئے انہیں حکومت مکہ کو کچھ رقم دینی پڑی۔ تقریباً اسی زمانہ میں ایک مرکزی بنک کے قیام کے لئے رعایت نامہ لکھا گیا جس کا مشیر اول سابق خدیو مصر عباس حلمی پاشا بنا۔ اس کے علاوہ امید کی جاتی ہے کہ الحصا میں تیل کے چشمے اور حجاز میں معدنیات کی کانیں دریافت ہونگی۔

یہاں اس خیال کا دوبارہ اعادہ کرنا مناسب ہے۔ کہ سلطنت سعودیہ کی آئندہ ترقی اور خوشحالی کا دارو مدار تمام تر امید پر ہے۔ ورنہ موجودہ صورت میں اس کا انحصار حاجیوں کی تعداد پر ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ سائنس کے ذریعہ حکومت کے انتظامات میں بیشمار آسانیاں پیدا کی جا سکتی ہیں مگر جس ملک میں نہ زرخیزی ہو۔ نہ پانی وہاں بیچاری سائنس اکیلی کیا کرے۔

باب سی و سوئم

نجد اور یمن کی جنگ

ناظرین کو معلوم ہے کہ اہالیان یمن کے دل میں سلطان ابن سعود کے خلاف ۱۹۲۰ء سے خلش موجود تھی امام یحیٰی والئے یمن ایک عرصہ تک ترکوں کے خلاف برسرپیکار رہا تھا۔ جنگ عظیم کی پیچیدگیوں اور ترکی سلطنت کی تباہی نے کچھ ایسے حالات پیدا کر دئیے تھے کہ اس نے یمن میں آزاد اور خود مختار حکومت قائم کر لی تھی جنگ عظیم سے بہت پیشتر ترکوں اور امام میں سلسلہ جدال و قتال شروع ہو چکا تھا۔ بڑے بڑے شہروں اور ساحلی علاقے

پر ترک قابض و متصرف تھے۔ لیکن اندرونِ ملک اور پہاڑی علاقوں میں امام کا تسلط تھا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جنگِ طرابلس ہوئی تو اٹلی نے اپنے حریف کو زک دینے کی غرض سے امام یمن کو مدد دینا شروع کیا چنانچہ رفتہ رفتہ یمنی عساکر کی تنظیم اطالین افسروں کے ماتحت عمل میں آئی۔ اٹلی نے جدید طرز کا بہت سا اسلحہ یمن کو فراہم کر دیا۔ خاص عرب میں یمن سب سے زرخیز علاقہ ہے۔ اور وہاں کے باشندے نسبتاً مہذب اور متمدن ہیں۔ اب منظم اور خود مختار حکومت قائم ہوئی۔ تو ترقی کی بہت سی راہیں باز ہو گئیں۔ اس قسم کے حالات کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ یمنیوں کے دل میں خیال پیدا ہو گیا۔ کہ وہ عرب کی سب سے سر برآوردہ آبادی ہیں۔ چنانچہ امام یمن نے توسیع مملکت کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دئیے یمن کے مشرقی علاقوں میں حکومت انگلشیہ کا اثر و نفوذ قائم تھا۔ اس لئے اس سمت میں کامیابی محال تھی یمن کے شمال میں عسیر کی آزاد ریاست قائم تھی لیکن طاقت و سطوت میں امام یمن کے مقابلے میں بہت کمزور تھی۔ امام یمن نے اس پر ہاتھ صاف کرنا چاہا ادریسی والئے عسیر نے سلطان ابن سعود کی سیادت قبول کر کے اپنی حفاظت کا انتظام کر لیا۔ سعودی افواج نے امیر سعود کی قیادت میں بہا اور وادی تہامہ وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ امام منہ دیکھتا رہ گیا۔ اس وقت تک امام یمن اٹلی کی مدد عسکری تنظیم اور جدید اسلحہ کی فراوانی کے گھمنڈ پر ابن سعود کی نیم مہذب افواج کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اور سمجھتا تھا۔ کہ جب چاہونگا ان سے نپٹ لونگا۔ ان حالات کا مختصر ذکر کسی گذشتہ باب میں آچکا ہے ادریسی والئے عسیر سمجھتا تھا۔ کہ نجد و یمن کی کشمکش میں وہ آزادانہ حکومت قائم کر سکیگا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ ابن سعود اس کے علاقے سے اپنا تسلط اٹھانے کیلئے تیار نہیں تو اس نے سلطان کے خلاف بغاوت کر دی۔ اور مقابلہ کی طاقت نہ دیکھکر یمن میں پناہ لی۔ نجد اور یمن میں رقابت اور مسابقت کی آگ ایک مدت سے سلگ رہی تھی۔ اس واقعہ نے چنگاری کا کام دیا چنانچہ نومبر سنہ ۱۹۳۳ء میں نجد اور یمن کے درمیان حرب و ضرب کا آغاز ہو گیا۔ امام یحییٰ کے نوجوان ولیعہد شہزادہ سیف الاسلام احمد نے حدود نجد کو عبور کر کے بدر پر قبضہ کر لیا۔ اور اسکے بعد ایک ایسے مقام پر فروکش ہو گیا جہاں سے نجد کا پایۂ تخت صرف دس روز کی مسافت پر واقعہ تھا۔ ظاہر ہے کہ یمن کی طرف سے اس تجاوز کے بعد سلطان ابن سعود خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا چنانچہ اُسے لازماً مدافعت کا بندوبست کرنا پڑا۔ سلطان نے یمن سے ادریسی کی حوالگی کا مطالبہ کیا لیکن سیف الاسلام احمد نے اُسے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ یہ دعویٰ بھی کیا کہ عسیر دراصل یمن کا حصہ ہے اس پر سلطان ابن سعود نے امام یحییٰ سے خط و کتابت کی۔ بالآخر عسیر مملکت نجد کا ایک مجوزہ علاقہ تسلیم کر لیا گیا ادریسی

تھا۔ اور فی الواقعہ جنوبی اور شمالی حجاز میں دو برائے نام شورشیں ہوئیں پہلی بغاوت ۱۹۳۲ء میں قبیلہ بلی کے ایک شیخ ابن رفادہ کی قیادت میں ہوئی۔ ابن رفادہ کے پاس چار پانچ سو آدمیوں کی جماعت تھی۔ جولائی میں وجہ کے نزدیک باغیوں اور شاہی فوجوں کا مقابلہ ہوا جس میں باغیوں کی کامل طور پر بیخکنی کی گئی۔ اور ابن رفادہ کا سر قلم کر دیا گیا۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد عسیر کے ادریسیوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ انکی سرکوبی کیلئے ابن سعود کی طرف سے گورنر جبل کو بھیجا گیا چنانچہ اوائل ۱۹۳۳ء میں وہ بھی اپنے کئے کو پہنچے۔

۱۹۳۲ء میں یہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ سلطنت سعودیہ کیلئے کوئی ولیعہد مقرر کیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ کہ سلطان ابن سعود اپنے بڑے فرزند امیر سعود کو اپنا جانشین مقرر کریگا۔ یہ نوجوان شہزادہ وضع قطع اور عادات واطوار کے لحاظ سے اپنے والد کا مثیل ہے چونکہ اس کی زندگی کا معتدبہ حصہ بدوؤں کے ساتھ جنگ و جدل میں گزرا ہے۔ اسلئے وہ انکی فطرت کا بخوبی واقف ہے۔ کیونکہ امیر سعود کو غیر ممالک میں جانے کا اتفاق بھی ہوا ہے۔ اسلئے وہ مغربی سیاست و تدبر سے بھی نا آشنا نہیں۔

مئی ۱۹۳۳ء میں سرکاری طور پر امیر سعود کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا گیا۔

۱۹۲۹ء کی بغاوت سے بہت پہلے سلطان عبدالعزیز موٹر کاروں کے فوائد کا معترف ہو چکا تھا۔ حجاز اور نجد کے درمیانی وسیع خطے میں موٹر کار کا استعمال اونٹوں سے بدرجہا زیادہ مفید اور مؤثر ہے اگر کچھ فرق ہے تو مصارف کا ہے یعنی اونٹ سستے ہیں۔ اور موٹر کار قیمتی۔ فتح حجاز سے پہلے بھی ابن سعود نے خلیج فارس کے راستہ سے موٹر کاریں منگائی ہوئی تھیں سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ موٹروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

ابتداء میں موٹروں کا استعمال محض آرام و آسائش کی غرض سے تھا۔ مگر ۱۹۲۹ء کی بغاوت نے سلطان ابن سعود کو مجبور کر دیا۔ کہ وہ سائینس کی مدد حاصل کرے۔ کیونکہ سلطان کو اس بات کا علم تھا کہ عرب جیسے وسیع ملک پر مؤثر حکمرانی کیلئے ضروری ہے۔ کہ سلطنت کے گوشہ گوشہ سے مرکز کا بالواسطہ تعلق ہو۔ اس چیز کے حصول کیلئے سلطان نے مسلح کاریں، وائرلیس اور فضائی طاقت کو ناگزیر سمجھا۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء کے اواخر میں چار ہوائی جہاز خرید لئے گئے۔

۱۹۳۰ء میں سلطان نے مارکونی کمپنی لندن کو اپنی سلطنت میں وائرلیس کے اسٹیشن تعمیر کرنے کیلئے

ٹھیکہ دیا۔ جو ۱۹۳۳ء میں پورا ہوا۔ اس وقت مکہ معظمہ۔ ریاض۔ تبوک۔ جدہ۔ قاف۔ حائل۔ بریدہ۔ قطیف۔ جبیل اور عقیر کے مقامات پر بے تار برقی کے اسٹیشن نصب ہو چکے ہیں۔ انکے علاوہ سلطان کے پاس چار لاریاں ہیں۔ جن میں وائرلیس کے سٹ لگے ہوئے ہیں۔ انکی مدد سے سلطان جہاں کہیں بھی ہو۔ اپنے ملک کے گوشہ گوشہ سے باخبر رہ سکتا ہے تاہم پیام کے اس جدید ترین طریقہ کی بدولت عرب کی حکومت میں ایک انقلاب عظیم کوئی غیر متوقع چیز نہیں۔ فی الحال بے تار برقی صرف حکومت کے استعمال کیلئے مخصوص ہے۔ بیرونی دنیا کے ساتھ سلسلہ جاری نہیں ہوا۔

اگرچہ وائرلیس کی اجارہ داری حکومت کو حاصل ہے۔ لیکن موٹر کار خریدنے میں کوئی رکاوٹ نہیں حجاز و نجد کے درمیان صرف حاجیوں کی نقل وحرکت کیلئے موٹروں کی آمدورفت ہے۔ بعض موٹر کمپنیوں میں حج کے دنوں میں اس قدر زبردست مقابلہ ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک دوسرے کا گلا کاٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ چونکہ عرب میں کوئی اور تجارت نہیں ہے۔ اسلئے سلطان ابن سعود نے موٹروں کی اجارہ داری پر زور نہیں دیا۔

سلطان ابن سعود نے کاشتکاری کو فروغ دینے کے سلسلے میں بہت کچھ خدمت کی ہے مگر مصیبت یہ ہے۔ کہ عرب میں پانی کا خاطر خواہ انتظام نہیں یہاں کوئی دریا بھی نہیں۔ وادیوں میں صرف برسات کے موسم میں پانی جمع ہو جاتا ہے۔ باقی تمام سال خشک رہتی ہیں ۱۹۳۰ء میں ابن سعود نے پانی کے نلکوں کی مشینری منگا کر کاشتکاروں میں تقسیم کی تھی۔ بعض جگہ بورنگ کرنیکا نتیجہ نہایت حوصلہ افزا ثابت ہوا۔ مگر بدقسمتی سے یہ کامیابی محدود علاقوں میں ہی نصیب ہوئی۔

سلطان ابن سعود کی نمایاں شخصیت کا اعجاز ہے۔ کہ ۱۹۲۶ء سے لیکر آجتک ملک میں کسی قسم کی کوئی بغاوت نہیں ہوئی۔ حالانکہ اقتصادی بدحالی کا اثر دوسرے ملکوں کی طرح عرب پر بھی پڑا ہے ۱۹۳۲ء میں صرف ابن رفادہ نے سر اٹھایا تھا۔ اول تو وہ اتنا ضعیف تھا۔ کہ اسے بغاوت نہیں کہا جا سکتا۔ دوئم وہ حجاز میں نہ تھا اسکے علاوہ ایک اور آفت یہ تھی۔ کہ ۱۹۲۶ء و ۱۹۲۹ء کے بعد عازمان حج کی تعداد میں بتدریج کمی واقع ہونی شروع ہو گئی۔ عالمگیر کساد بازاری کے ہاتھوں بیچارے حاجی بھی نالاں تھے۔ ان میں اتنی مقدرت نہ رہی کہ ایسی اقتصادی بدحالی کے زمانہ میں دیار حبیبؐ کی زیارت کیلئے آسکیں۔

۱۹۳۳ء میں حالات نے نہایت نازک صورت اختیار کر لی تمام ملک خشک سالی کا شکار ہو گیا عرب جیسے بے آب و گیاہ ملک میں یہ عارضہ اکثر ہوا کرتا ہے تجارت مردہ ہو گئی۔ قرضہ ادا نہ کیا جا سکا۔ ایک طرف

کی روش مصالحانہ رہی تھی جب امن و صلح کیلئے تمام کوششیں رائیگاں چلی گئیں۔ تو سعودی افواج امیر سعود ولیعہد سلطنت کی سرکردگی میں آگے بڑھیں۔ سلطان کی افواج نے کوہستان ہرات کو فتح کر لیا یمن کی افواج جو اس علاقے کے قلعوں پر متسلط تھیں۔ ان کو زبردستی گھیر لیا گیا یمنی فوجیں پیچھے ہٹنا شروع ہو گئیں۔ نجدی فوج نے مقام حرص پر حملہ کیا۔ یہ بندرگاہ حدیدی سے بیس۲۰ میل کے فاصلے پر واقعہ ہے۔ حرص اور میدی میں امام یحییٰ کے بہت سے مستحکم قلعے تھے۔ اور تین۳ ہزار فوج ان قلعوں میں موجود تھی۔ حرص کے قلعے تو پہلی ہی یلغار میں فتح ہو گئے۔ اسکے بعد نجدی افواج نے میدی پر حملہ کیا۔ یہ بہت مستحکم بندرگاہ تھی۔ اس میں تیرہ قلعے تھے جن میں تیس۳۰ بڑی توپیں اور مشین گنیں پڑی ہوئیں تھیں یہاں تین دن جنگ ہوتی رہی۔ جو بہت ہی ہولناک تھی۔ خون کی ندیاں گلی کوچوں میں بہنے لگیں۔ امام یحییٰ کی فوجیں بالآخر بھاگیں۔ سعودیوں نے ان کا تعاقب کیا۔ اور سب کو قتل کر ڈالا۔

میدی کی فتح کے بعد ۴ ہ۲ اپریل کو سعودی فوج نے عبس پر حملہ کیا۔ اور دشمن فوج کو قید کر کے طبہ پر حملہ کر دیا۔ اور اُسے بھی فتح کرتے ہی زہران اور زبیدیہ پر قابض ہو گئی۔ تہامہ یمن کے ساحلی میدانی علاقے میں امام یحییٰ کی جتنی بھی فوجیں تھیں۔ بیحد خوفزدہ ہو کر بغیر کسی ترتیب کے بھاگ کھڑی ہوئیں۔ حدیدہ کی بندرگاہ بھی خالی ہو گئی۔ اور یہ شہر پانچ دن تک بغیر کسی حکومت کے رہا یہاں کے سپہ سالار سلیم بک نے اپنے آپ کو انگریزی جنگی جہاز کے حوالے کر دیا یمنی فوج کے فرار کے بعد ہی تہامہ کے شافعی قبائل نے بغاوت کر دی اور امام کی فوجوں پر ہر طرف سے ٹوٹ پڑے۔ دیکھتے دیکھتے تہامہ کا پورا علاقہ ہر قسم کی حکومت سے خالی ہو گیا لیکن حالات ابتر ہونے نہیں پائے سعودی علم ہر جگہ لہرانے لگا۔ اور تہامہ میں امن و سکون قائم ہو گیا۔

اس دوران میں امام یحییٰ نے سلطان ابن سعود سے درخواست کی کہ سلسلہ جدال و قتال بند کر دیا جائے اور نجران میں یمنی افواج سے محاصرہ اُٹھا لیا جائے۔ یہ بھی ظاہر کیا کہ وہ ادریسی کو سلطان ابن سعود کے حوالہ کر دیگا اور اپنی افواج کو کوہستان سے واپس بُلا لیگا۔ اور جو لوگ بطور یرغمال اسیر ہیں۔ رہا کر دئے جائینگے۔ سلطان نے جواب دیا کہ جب تک ادریسی بمعہ رشتہ داروں کے حوالہ نہ کیا جائیگا۔ لڑائی بند نہ ہوگی۔ اس اثناء میں فلسطین سے مفتیٔ اعظم یمن اور حجاز کے درمیان صلح کیلئے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ اور امن و امان پیدا کرنے کے لئے کوشش کرتے رہے۔

مفتوحہ علاقوں کے سرداران نوہیہ۔ الزہر ابن عباس اور وادی عورنے سعودی حکومت کی اطاعت

اختیار کرلی۔ خبر مشہور ہوئی۔ کہ امام یحیٰی کا انتقال ہوگیا ہے۔ ایک خبر یہ بھی تھی۔ کہ امام یحیٰی کی رعایا نے بغاوت برپا کر دی۔ اور امام کو قتل کر دیا صنعا اور دیگر قصبات میں انقلاب پیدا ہوگیا۔

حدیدہ کی بندرگاہ پر سعودی فوج نے قبضہ کرلیا۔ برطانوی جہاز اس بندرگاہ میں برطانوی رعایا کی حفاظت کیلئے پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ حدیدہ کی اطلاعات سے امام یحیٰی کی وفات کی خبر کی تردید ہوگئی۔ امیر فیصل سلطان ابن سعود کے دوسرے شہزادے نے حدیدہ میں حکومت اور امن وامان قائم کرنیکے بعد صنعا یمن کے دارالسلطنت کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ اور اس سمت کے بعض مقامات فتح کرلئے۔ امیر احمد الشوقی نے جو سلطان کے دوسرے جیش کے کمانڈر تھے۔ ایک قافلہ گرفتار کیا جس میں دو یورپین تھے۔ اور افواج یمن کیلئے سامان جنگ بیجا رہے تھے صنعا کی طرف پیش قدمی کرنے میں سعودی حکومت کا بھی بہت کچھ نقصان ہوا۔ خبر یہ تھی کہ دو ہزار آدمی نو ۹ مسلح کاریں بتیس ۳۲ توپیں اور تین سو ساٹھ ۳۶۰ اونٹ ضایع ہوئے۔ لیکن بعد میں سعودی ایجنسی قاہرہ نے اس خبر کی تردید شایع کردی۔ اسی دوران میں یہ بھی ثابت ہوگیا۔ کہ صنعا کی تمام رعایا امام یمن کی وفادار ہے۔

امام یمن نے ہر سمت میں شکست اٹھا کر صلح کیلئے درخواست کی۔ اور سلطان ابن سعود کی جملہ شرائط کو مان لیا۔ اس صلح کیلئے سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین اور محمد علی پاشا کے وفد کی مساعی بہت حد تک ذمہ دار تھیں۔ بالآخر معاہدہ صلح بیس برس کیلئے ہوگیا۔ امام یمن کی وہ فوجیں جو سلطان ابن سعود کی فوجوں سے دوران جنگ میں آملیں تھیں۔ امام یمن کی جانب سے ان کے جان ومال کی حفاظت کا عہد پیمان کیا گیا۔ یمنی افواج نے نجران کے علاقے کو بالکل خالی کردیا۔ حسن ادریسی اس کے اہل وعیال اور ساتھی سلطان کے حوالے کردئے گئے۔ جن پہاڑیوں پر یمنی افواج نے قبضہ کرلیا تھا۔ خالی کردی گئیں۔ مختلف قبائل جن کو فریقین نے دوران جنگ میں بطور یرغمال اسیر کرلیا تھا۔ ہر دو حکومتوں کو واپس کردئے گئے۔ دونوں حکومتوں کی سابقہ حدود کو فریقین نے تسلیم کرلیا۔ اور بظاہر کوئی متنازعہ فیہ امر فریقین میں باقی نہ رہا۔

اس جنگ میں امام یحیٰی والئے یمن کی تیس ۳۰ ہزار فوج قتل ہوئی۔ سعودی افواج کے ہاتھ تیس ۳۰ ہزار بندوقیں بیشمار توپیں اور بہت سا سامان جنگ ہاتھ آیا۔ حکومت یمن کی برسوں کی تیاریاں خاک میں مل گئیں۔ اور عرصہ تک کیلئے بہت سی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ولیعہد یمن کا غرور جاتا رہا۔ ثابت ہوگیا کہ یمنی تنظیم اور مرفہ الحالی باشندگان نجد کے عزم اور شجاعت کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتی۔

اس جنگ سے پیشتر بہت سے بیرونی لوگوں کا خیال تھا۔ کہ امام یمن سلطان سے طاقت ور ہے

کو سلطان نے معافی دیدی۔ اور عسیر میں واپس آنیکی اجازت بھی دیدی لیکن شہزادہ سیف الاسلام احمد اس فیصلہ سے مطمئن نہ ہُوا۔ اور اپنی فوجوں کو حدود نجد پر جمع کرنے کیلئے طرح طرح کے بہانے تلاش کرنے لگ گیا۔ لیکن سلطان ابن سعود نے ان تمام باتوں کے باوجود خط وکتابت اور تدبر وسیاست سے ہی متنازعہ امور کا تصفیہ کر لینا چاہا اور دنیائے اسلام کی ان تمام انجمنوں کو جنہوں نے نجد و یمن کی جنگ روکنے کیلئے سلطان کو خطوط لکھے تھے یقین دلا دیا۔ کہ انکی طرف سے کوئی اقدام نہ ہوگا۔ لیکن اگر فریق مخالف جارحانہ رویہ اختیار کریگا۔ تو مدافعت لازم آئیگی اس دوران میں امام یحییٰ کا ایک مکتوب بھی اخباروں میں شائع ہُوا جس میں بڑی حد تک مصالحانہ انداز اختیار کیا گیا تھا۔ لیکن سیف الاسلام احمد کی طرف سے جتنے اعلانات شائع ہوئے۔ سب کے سب جدال وقتال کے اشتیاق سے معمور تھے۔ اُس نے اپنی فوجی طاقت کے متعلق بڑی تعلّی سے کام لیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ امام یحییٰ اپنے شوریدہ سر ولیعہد کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنا ہُوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس نوجوان کی ناعاقبت اندیشی عربوں کے درمیان خونریزی کرا کر رہیگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ عرب کی یہ دونوں ریاستیں کمزور ہو جائیں گی۔

دسمبر ۱۹۳۳ء میں سلطان ابن سعود کا ایک مکتوب جو ۲۳ شعبان کو ریاض سے چلا تھا بمبئی کے مشہور نجدی تاجر شیخ قصیبی کے پاس پہنچا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ والئے یمن حُسنِ تدبیر کے ساتھ آپ ہی معاملات حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن سعودی مطالبات کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ اب تک کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ ہم پُوری کوشش کرینگے۔ کہ امن وامان قائم رہے۔ اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر مدافعت کرنی پڑیگی۔ سب قوت صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مندرجہ بالا مکتوب اور امام یحییٰ کے اعلانات سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ فریقین امن ودوستی کے خواہش مند ہیں۔ لیکن پھر بھی یمنی افواج نے تمام بین الاقوامی قوانین کو پس پشت ڈال دیا۔ اور نجدی سرحدوں میں داخل ہوگئیں۔ اور نجران پر قبضہ جما لیا۔ اس واقعہ کے بعد سلطان ابن سعود نے بھی الٹی میٹم دیدیا جس کے اہم نکتے یہ تھے:۔

۱۔ یمن کی فوجیں نجران کی تمام زمینیں خالی کردیں۔

۲۔ ادریسی خاندان کے تمام افراد سعودی حکومت کے حوالے کردئیے جائیں۔

۳۔ یمن سعودی حکومت کے خلاف جو پروپیگنڈا کر رہا ہے۔ بند کردے۔

۴۔ یمن کی حکومت سعودی اور یمنی معاہدات کی پابندی کرے۔

۵۔ امام یمن تہامہ اور عسیر کی تمام موجودہ سرحدوں کو فوراً قبول کرلے۔

امام یمن نے ان تمام مطالبات کو ماننے سے انکار کیا۔ اس پر سلطان ابن سعود نے عسیر اور نجران کے وفادار قبائل میں بہ کثرت ہتھیار تقسیم کر دئیے۔ تاکہ وہ امام کی حملہ آور فوجوں کا مقابلہ کر سکیں۔

اسی اثنا میں حکومت یمن اٹلی سے سامان جنگ خرید کرتی رہی چنانچہ پینتیس ۳۵ ہزار بڑے صندوق چار جہازوں میں بھر کر آئے۔ ان صندوقوں میں مختلف قسم کے ہتھیار تھے۔ نیز اٹلی نے کلدار توپیں اور پہاڑی توپیں بھی معقول تعداد میں بھیج دیں۔ امام یحییٰ نے ایک ہوائی بیڑہ کی ترتیب بھی شروع کر دی جس کے لئے اسلامی ممالک سے ہوا باز مہیا کرنے کی تجویز تھی۔

نجران پر قبضہ کر چکنے کے بعد یمنی افواج وادی دواس میں پہنچ گئیں۔ نجران کی آبادی اب مقابلہ کیلئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ قبائل یام نے جو، اسی قبیلے میں یمنی لشکر کو شکست دیکر نجران سے نکال دیا۔ شکست خوردہ فوج ترتیب سے پیچھے ہٹتے ہوئی صفدار پہنچ گئی۔ ظاہر ہے کہ یمنی عساکر کو یہ شکست منظم نجدی افواج کے مقابلے میں نہیں ہوئی بلکہ نجران کے قبائل یام کی بے قاعدہ یورش نے ہی امام یحییٰ کی ان افواج کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

اس وقت یمن کے ہزارہا نوجوان جدید اسلحہ سے مزین ہو کر یا تو نجدی یمنی سرحد پر جمع تھے۔ یا حدود نجد کو عبور کر چکے تھے نجران سے شکست کھا کر ولیعہدین ذ عسیر کے ساحلی علاقہ کیطرف سے پیش قدمی شروع کر دی ادھر سلطان ابن سعود نے ایک طرف اپنے ولیعہد امیر سعود کو نجدی قبائل کا قائد اعظم مقرر کر دیا۔ اور دوسری طرف امیر فیصل کو ساحلی علاقے کی حفاظت کیلئے روانہ کر دیا۔ حالات کی رفتار سے مجبور ہو کر امام یحییٰ نے سلطان کی بعض شرائط کو تسلیم کر لیا۔ وہ شرائط یہ تھیں۔ کہ دونوں حکومتیں موجودہ سرحدوں کو برقرار رکھیں۔ ایک دوسرے پر قطعاً زیادتی نہ کریں۔ بلکہ باہم حلیف بنکر عرب کی آزادی کیلئے کوشش کریں۔ ان شرائط پر عارضی صلح ۲۳ رمضان کو ہو گئی۔ لیکن اس صلح میں نجران کے علاقہ کا جھگڑا باقی رہ گیا۔ اس تنازعہ کے تصفیہ کیلئے سلطان کیطرف سے فواد بک حمزہ وکیل وزارت خارجیہ مندوب مقرر ہوئے۔ امام یحییٰ کی طرف سے سید عبداللہ ۲۵ جنوری ۱۹۳۴ء کو صنعا سے ابہا کی طرف روانہ ہو گئے۔

باہمی گفت و شنید کے باوجود مکمل صلح نہ ہو سکی یمنی حکومت نجران کے علاقے پر قبضہ کر لینا چاہتی تھی لیکن سلطان کوئی علاقہ حوالہ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس عرصہ میں ہر دو حکومتوں کی فوجیں سرحدوں پر پڑی ہوئی تھیں جنگ وجدل کیلئے بیتاب ہو رہی تھیں۔ معمولی جھڑپیں بھی ہوتی رہیں۔ کئی ماہ کا عرصہ اسی طرح صرف ہو گیا۔ آخر ۱۸ اپریل کو نجد اور یمن کی جنگ پھر زور شور سے شروع ہو گئی۔ کئی ماہ کے پورے دوران میں سلطان

اور نجد و یمن کی حدود پر قیام امن امام یحییٰ کی امن پسندی. عافیت کوشی اور مصلحت بینی پر منحصر ہے. خیال یہ تھا. کہ یمن متموّل و آسُودہ حال مُلک ہے حکومت منظّم و متمدّن ہے. اور باشندے شاہراہِ ترقی پر گامزن ہیں عنقریب ایک طاقتور آزاد عربی سلطنت بنا چاہتی ہے. لیکن اس جنگ کے حالات نے روزِ روشن کی طرح سے ثابت کر دیا. کہ ابن سعود عرب کا طاقتور ترین فرمانروا ہے. اور امام یمن اس سے یارائے ہمسری نہیں رکھتا. نجدی شجاعت و بسالت کار آزمُودہ قائد کی سرکردگی میں اوسط درجے کی طاقت کے جدید اسلحہ اور عسکری تنظیم و تربیت کا مقابلہ کر سکتی ہے. اور قومیتِ عرب کی آئندہ اُمیدیں سلطان ابن سعود کی ذات سے وابستہ ہیں.

باب سی و چہارم

ابن سعود پر قاتلانہ حملہ

۱۹۳۵ء کے حج کے دنوں میں دُنیا بھر کے اخبارات میں خبر شائع ہوئی تھی. کہ سلطان ابن سعود پر خاص حرم میں قاتلانہ حملہ ہوا. تفصیل اس واقعہ کی یہ ہے. کہ یہ حادثہ جُمعہ کے دن پیش آیا. جُمعرات کو حج ہوا تھا. ابن سعود مسجد الحرام کے گرد چوتھی مرتبہ طواف کر رہا تھا. کہ بعض لوگوں نے جو چھُروں سے مسلح تھے. اُس پر حملہ کر دیا. وہ ابھی حجرِ اسود کے قریب پہنچا تھا. کہ حملہ آوروں کے گروہ کا لیڈر اُس پر لپک پڑا. شہزادہ سعود ولیعہدِ سلطنت ابن سعود کے ساتھ تھا. اُس نے حملہ آور کو پکڑ کر دُور کر دیا. لیکن قبل اس کے کہ وُہ دوبارہ کوشش کرتا. سلطان کے باڈی گارڈ میں سے ایک سپاہی نے اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا. اس عرصے میں دوسرے قاتلوں نے بھی ابن سعود پر حملہ کر دیا. لیکن وُہ سلطان کو نقصان پہنچانے سے قبل ہی باڈی گارڈ کے نوجوانوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے. سلطان اور ولیعہد نے نہایت سکونِ خاطر سے طوافِ کعبہ مکمل کیا. اس حادثہ میں باپ بیٹا دونوں بال بال بچے. دونوں صحیح سلامت اور تندرست رہے. اس دن اُنہوں نے اپنے معمولی مشاغل اور روزمرہ کی مصروفیتوں کو حسبِ دستور جاری رکھا. عید الضحےٰ کے بعد جو وفود اُن کو تکمیلِ حج پر مبارکباد دینے کے لئے پیش ہوئے. اُن کو شرفِ ملاقات بخشا.

بعد میں معلوم ہُوا کہ حملہ آور یمن کے زیدی تھے۔ امام یمن کو جب اس حادثہ کا علم ہُوا۔ تو اُنہوں نے ایک سرکاری اعلان میں اس ناکام اور بزدلانہ حملے پر انتہائی رنج و قلق کا اظہار کیا۔ اُنہوں نے لکھا کہ یہ بات قابلِ یقین نہیں کہ قاتلانہ حملہ کرنے والے یمنی زیدی ہیں۔ تاہم تحقیق و تفتیش کی غرض سے حکومت یمن نے سید عبداللہ الوزیر کو جو کہ یمن کے سفیر متعینہ جدہ ہیں۔ اور اُن ایام میں مکہ معظمہ میں مقیم تھے۔ ہدائت کی کہ وہ حکومت سعودیہ عربیہ کی خواہشات اور ہدایات کے مطابق اس ہولناک واقعے کی پُوری تحقیق و تفتیش کرے۔ حکومت سعودیہ نے تحقیقات کی تو معلوم ہُوا۔ کہ حملہ آور تعداد میں تین تھے۔ اور تینوں یمن کے باشندے اور زیدی عقیدہ رکھتے تھے وہ سلطان ابن سعود اور اُسکے ولیعہد پر عین مسجد الحرام کے اندر مطاف میں حجر اسود کے ٹھیک سامنے حملہ آور ہوئے باڈی گارڈ کے آدمیوں نے یکے بعد دیگرے تین حملہ آوروں کو گولی سے ہلاک کر ڈالا۔

اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ کہ اس حادثہ پر سلطان نے اضطراب کا اظہار نہ کیا بلکہ انتہائی سکون و اطمینان کے ساتھ طواف کے بقیہ تین شیوط پُورے کئے۔ بادی النظر میں سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ زیدیوں کو اس اقدام کی کونسی وجہ تھی۔ نجد اور یمن میں جو اختلافات پیدا ہوئے تھے۔ وہ بظاہر مدت ہوئی مٹ چکے تھے۔ اس باب میں سلطان کا طرزِ عمل اس قدر پسندیدہ اور قابلِ قدر و تشکر رہا تھا کہ یمنیوں کو کوئی شکایت نہ ہونی چاہیئے تھی بلکہ اُلٹا اُنہیں سلطان کا رہینِ منّت ہونا چاہیئے تھا۔ یہ جنگ حقیقت میں امام یحییٰ اور اُن کے عجلت کیش ولیعہد کی کوتہ اندیشی کا نتیجہ تھی۔ سلطان نے اختلافی مسائل کو گفت و شنید کے ذریعے سے طے کرنیکی کئی مرتبہ کوششیں کیں۔ اور ہر موقعہ پر جنگ سے اجتناب کیا۔ لیکن یمن کے بعض لوگ یہ خیال کرنے لگے کہ ابن سعود اسلئے مصالحت پر آمادہ ہے۔ کہ وہ یمن کے منظّم اور تربیت یافتہ عساکر کے مقابلہ کی تاب نہیں رکھتا۔ اس غلط خیال کے مطابق اُن کے حوصلے بڑھتے گئے۔ یہانتک کہ اُنہوں نے بلا پس و پیش نجدی علاقوں پر حملہ کر دیا جب معاملات اس حد پر پہنچ گئے۔ تو سلطان ابن سعود کو مجبوراً جنگ کرنی پڑی۔ جب نجدی اخوان سلطان کے حکم سے میدان میں اُترے۔ تو یمنی فوجیں میدان سے بھاگ نکلیں۔ اُنہوں نے ہر جگہ شکست کھائی یمن کے اکثر اہم مقامات نجدیوں کے قبضہ میں آ گئے۔ اسوقت یمن والوں کو بھی مصالحت کی ضرورت پیش آئی۔ اگر ابن سعود چاہتا تو یمن کے بیشتر حصہ پر قبضہ جما سکتا تھا لیکن اُس نے انتہائی فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی سے مصالحت کو لبیک کہا۔ اور عدیم النظیر تدبر و سیاست سے یمن کے مفتوحہ علاقوں کو خالی کر دیا۔ اُس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا۔ کہ اس جنگ میں اس کے سامنے

فتح و تسخیر کا مطمع نظر نہ تھا بلکہ اپنے جائز حقوق اور ملکی حدود کی محافظت پیش نظر تھی۔

سلطان کے دل میں یمنیوں کے خلاف یا حکومت یمن کے خلاف اس وقت تک کوئی تکدر نہیں تھا۔ بلکہ اس نے قاتلانہ اقدام سے چار روز پیشتر چھ وا لیج کو ممتاز حاجیوں کے ایک مخصوص اجتماع میں اس امر پر مسرت کا اظہار کیا تھا۔ کہ حکومت یمن کے ساتھ ان کے تعلقات نہائیت خوشگوار ہیں۔

یمن کے باشندوں کا بیشتر حصہ زیدی المذہب ہے۔ یہ لوگ اختلاف مذہب کی بنا پر نہیں چاہتے کہ حجاز کی مقدس سرزمین نجدیوں کے قبضہ و اقتدار میں رہے۔ عام طور پر معلوم ہے کہ ایک عرصہ سے یمنی افواج جدید اسلحہ سے مسلح ہیں۔ اور اٹالین افسروں نے ان کو عسکری تعلیم و تربیت دی ہے۔ یمنی سمجھتے تھے کہ ابن سعود نے حائل۔ حجاز۔ اور عسیر کی پسماندہ ریاستوں کو فتح کر لیا تو کیا ہوا جب یمن کے عساکر سے مقابلہ پڑیگا تو قدر و عافیت معلوم ہوگی۔ لیکن آخری جنگ نے ثابت کر دیا کہ یمنی تنظیم و تربیت نجدی جوش اور ذوق شہادت کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں یمنی افواج کو قدم قدم پر ہزیمت ہوئی۔ کہیں بھی وہ جم کر مقابلہ نہ کر سکیں۔ اگر ابن سعود مصالحت اور مفاہمت کیلئے تیار نہ ہوتا۔ تو قریب تھا کہ نجدی پورے یمن کو فتح کر لیتے۔ اہم مقامات نجدیوں کے قبضہ میں آ ہی چکے تھے۔ یمن کا دارالسلطنت صنعا سخت خطرے میں تھا۔ کہ یمن نے مجبور ہو کر صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ ابن سعود نے کمال عالی ظرفی سے تھام لیا۔ بظاہر تو صلح ہوگئی۔ لیکن یمنیوں کو دل ہی دل میں بہت رنج اور صدمہ پہنچا چنانچہ اکثر لوگ سعودیوں سے انتقام لینے پر تلے ہوئے تھے۔ غالباً ندامت اور انتقام کے کچھ ایسے ہی جذبات ہونگے جنہوں نے حملہ آوروں کو اس مذموم اقدام پر آمادہ کیا۔

اتنی بات خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کہ اس معاملہ میں یمنی حکومت نے دانشمندی اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا۔ اور اپنی پسندیدہ روش سے عرب کے امن و امان کو خطرے سے بچا لیا۔ اگر وہ اس حادثہ پر سلطان ابن سعود سے ہمدردی کا اظہار نہ کرتی۔ اور حملہ آوروں سے جو سلوک ہوا۔ اسکے بارے میں احتجاج کرتی۔ تو عجب نہ تھا کہ نجد اور یمن میں پھر سے جنگ چھڑ جاتی اور آپس کی اس چپقلش سے اغیار فائدہ اٹھاتے۔

جب قاتلانہ حملے کی خبر پہنچی تو دنیا بھر میں سلطان کے بہی خواہوں کو صدمہ پہنچا۔ اور انہوں نے اظہار رنج و قلق کیا۔ انہوں نے سلطان کی سلامتی پر اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کیا۔ لیکن سلطان کے مخالفین کو اسے بدنام کرنیکا ایک اور بہانہ ہاتھ آیا۔ طرح طرح کے اتہامات تراشے گئے۔ انہوں نے مشہور کرنا شروع کیا کہ سلطان نے نہتے اور امن پسند یمنیوں کو بلا قصور حرم مقدس میں قتل کروا دیا۔ عام طور پر معلوم ہے۔ کہ شریعت اسلامیہ

کی رُو سے حدودِ حرم میں کسی کو قتل کرنا یا ایذا دینا حرام ہے۔ مقصود یہ تھا کہ حرم کی امنیت و مامونیت کے خیال سے مسلمانوں کے دلوں میں سلطان ابن سعود کے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات پیدا ہوں۔ اور وہ انکی اخلاقی ہمدردی سے محروم ہو جائے۔ مخالفین بھی یہ نہیں بتا سکے۔ کہ آخر قاتلانہ حملے کی صورت میں سلطان ابن سعود کے باڈی گارڈ کے لئے اور کیا چارۂ کار تھا۔ کیا وہ حملہ آوروں کو اجازت دیدیتے کہ وہ اُن کے محبوب امیر کو انکی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیں۔ کیا سلطنت کی حفاظت کیلئے یہ ضروری نہیں تھا کہ اس ناپاک اور مذموم اقدام کرنے والوں کو وہیں کیفرِ کردار تک پہنچا دیا جاتا۔

سلطان ابن سعود نہایت متوکّل انسان ہے۔ اُس نے کبھی اپنی حفاظت کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔ اس کی سواری کیلئے کبھی سڑکیں بند نہیں ہوئیں۔ کبھی عام لوگوں کی آمد و رفت نہیں رُکی۔ کبھی سپاہی پہرے کیلئے کھڑے نہیں ہوئے۔ اسکی لبریز عمل زندگی میں بارہا سخت خطرات پیش آچکے ہیں۔ لیکن وہ ذاتی حفاظت کے خیال سے کبھی مضطرب نہیں ہوا۔ اور نہ ہی کبھی اُس نے کوئی احتیاطی تدابیر اختیار کی ہیں۔ اس کا راسخ ایمان ہے۔ کہ ہر شخص کی موت کا وقت مقرر ہے۔ اُس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔ بیشمار جھتوں میں ایسے مواقع پیش آئے کہ اسکی زندگی ہتھیلی پر تھی۔ لیکن اس میں اس قدر ضبطِ نفس اور سکونِ خاطر ہے۔ کہ کبھی خفیف سے خفیف اندیشے کا بھی اظہار نہیں ہوا۔

باب سی و پنجم

(۱)

حکومت سعودیہ کا مستقبل اور اقتصادیات

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ موجودہ سعودی حکومت سلطان ابن سعود کی بے نظیر قابلیت اور عدیم المثال شخصیت کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اسکی زندگی کے بعد اس کا دیر تک قائم رہنا یقینی نہیں ہے۔

بلاشک و شبہ موجودہ حکومت صرف ابن سعود کے قوتِ بازو کے بل بوتے پر قائم ہے۔ گو یہ صحیح ہے۔ کہ

بعض موافق حالات نے بھی مساعدت کی ہے لیکن پھر بھی بلا خوف تردید اتنی بات کہی جا سکتی ہے کہ محض اُسکی گرانقدر مساعی کے طفیل آل سعود کا جلاوطن اور زوال پذیر خاندان اس وقت عظیم الشان مملکت پر حکمران ہے لیکن ابن سعود کی کارکردگی محض ذاتی رفعت اور عظمت کے خیال سے نہیں ہے۔ بلکہ مذہبی عصبیت اور جوش کیوجہ سے ہے جس نے عرب کے دلوں کو گرما دیا ہے۔ اور قوائے عملیہ کو جمود و سکون کی قید و بند سے آزاد کر دیا ہے یہ مقدس جذبہ اسکی زندگی کے بعد بھی یقیناً قائم رہے گا۔ اور جب تک رہے گا۔ حیات بخش اور جان آفرین ہوگا۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ مذہبی تعلیم اور اصلاح و تہذیب کی دعوت نے نجد میں نہایت سازگار اور مساعد فضا پیدا کر دی تھی۔ ابن سعود کے علاوہ اور بھی کوئی لائق حکمران ہوتا۔ تو یقیناً کامیاب ہوتا۔ ابن سعود کی کامیابی کا راز اس میں مضمر ہے۔ کہ اُس نے نہایت قابلیت اور لیاقت سے نجدیوں کے مذہبی جوش کی رہنمائی کی ہے اور اُن سے برموقعہ اور برمحل کام لیا ہے۔ اگر اُنہوں نے کہیں اعتدال سے تجاوز کیا ہے۔ تو اُس نے اُن کی زیادتیوں کی تلافی کر کے اعتدال و ثواب کی راہ اختیار کی ہے۔ جہاں حوصلہ شکن اور رُوح فرسا حالات نے اُن کو پست ہمت کیا ہے۔ تو اُس نے اُنکی حوصلہ افزائی کی ہے۔ محنت و مشقت کی ہر مہم میں اُن کا ساتھ دیا ہے۔ اور موقعہ بموقعہ ہاتھ بٹایا ہے۔ اُنکی غیر معمولی شجاعت اور بسالت کو اپنی سیاست و تدبر سے زیادہ مؤثر اور کارگر کر دیا۔ اور اپنی عظیم شخصیت سے اپنی رعیت کے ہر فرد کو متاثر کر دیا ہے۔

پہلی سعودی سلطنت کو مصری حکومت نے عثمانی سلطان کے حکم سے تباہ و برباد کیا تھا۔ اُس زمانے میں حالات اس قسم کے تھے۔ کہ محض مذہبی وجوہات کی بنا پر جنگ ہو سکتی تھی۔ آج حالات میں اتنا انقلاب ضرور ہو گیا ہے۔ کہ سلطنتیں محض مذہبی اختلافات کی بناء پر برسر پیکار نہیں ہوتیں آج کی جنگ سیاسی اور اقتصادی اغراض و مقاصد کے ماتحت ہوتی ہے۔ اس وقت یہ قرین قیاس نہیں ہے۔ کہ کوئی اسلامی حکومت حجاز کی حکومت کے وہابی ہونے کیوجہ سے اس پر حملہ آور ہو۔ فی زمانہ اسلامی حکومتیں بہت کمزور ہیں۔ اور اپنے تحفظ میں اس قدر مصروف ہیں۔ کہ حجاز ایسے ملک پر حملہ کرنے کی فرصت اور ہمت نہیں پا سکتیں۔ اقتصادیات کے اعتبار سے حجاز اس قدر بے بضاعت اور پسماندہ ملک ہے۔ کہ حملہ آور فاتح کیلئے کبھی بھی مالی منفعت کا باعث نہیں ہو سکتا۔ واقعہ ہے کہ سلاطین عثمانی کے زمانے میں حجاز کے اخراجات مُلکی اُسکی آمدنی سے ہمیشہ بہت زیادہ ہوتے تھے۔ اور یہ کمی دیگر صوبجات کے محاصل سے پوری کی جاتی تھی۔

نجد کے سوا دنیا بھر کی اسلامی سلطنتوں میں آج مذہب اتنا دخیل نہیں جتنا آج سے سو برس پیشتر تھا
جس طرح سے حجاز کیلئے اسلامی حکومتوں کی طرف سے مستقبل قریب میں کوئی خطرہ نہیں اسی طرح پر مغربی اقوام
کی دست وبرد کا احتمال بھی بہت کم ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ مغربی حکومتوں کے بے پناہ استعمار کی راہ میں اس
ملک کی مالی بدحالی اور اقتصادی پسماندگی حائل ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ مغرب کی متعدد حکومتیں
سیاسی نقطۂ نگاہ سے اپنا اثر ورسوخ حجاز میں قائم کرنا چاہتی ہیں۔ اور آئے دن اس سلسلے میں کوشاں
رہتی ہیں لیکن کوئی طاقت بھی حجاز پر براہ راست حکومت کرنے کی خواہش مند نہیں۔ اُن کی زیادہ سے زیادہ
خواہش یہ ہے۔ کہ حجاز کا کوئی حکمران ایسا نہ ہو جسکی روش اُن کے بارے میں مخالفانہ اور معاندانہ ہو۔ مثال کے
طور پر انگریزی حکومت پیش کی جا سکتی ہے جنگ عظیم کے بعد اس قسم کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ کہ اگر
انگریز چاہتے تو براہِ راست حکومت کرنے کی کوشش کر سکتے تھے لیکن اُنہوں نے مصلحت اسکے خلاف
سمجھی۔ اور شریف حسین کو حجاز کے تخت پر بٹھا دیا۔ البتہ انگریزی حکومت دن رات اس فکر میں رہتی ہے۔ کہ
حجاز میں زیادہ سے زیادہ اثر ونفوذ پیدا کر لیا جائے۔ اس غیر طبعی خواہش کیلئے عذر یہ پیش کیا جاتا ہے۔ کہ
کیونکہ دنیا بھر کی کسی سلطنت میں مسلمان اتنی کثیر تعداد میں آباد نہیں جتنے حکومت انگلشیہ میں ہیں اس
لئے حکومت کی مصلحت یہ ہے۔ کہ حجاز میں انگریزی رعایا کے حاجیوں کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک ہو۔

مذکورہ بالا تصریح سے ثابت ہو گیا ہو گا۔ کہ بالفعل سعودی حکومت کو بیرونِ ملک سے کوئی خطرہ
لاحق نہیں سب سے زیادہ اندیشہ اندرونی زوال وانحطاط کا ہے لیکن اقتصادی پستی کی جو وجہ بیرونی
خطرہ کے فقدان کا باعث ہے۔ وہی وجہ غیر موافق حالات میں اور کمزور حکمران کے عہد میں اندرونی زوال
کا باعث ہو سکتی ہے۔ سعودی حکومت کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ صحرائی عربوں کیلئے گذر اوقات کا ذریعہ
پیدا کیا جائے۔ ظاہر ہے۔ کہ نجدیوں کی تنگ دلی اور تعصب حجاز میں پوری قوت سے قائم نہیں رہ سکتا۔ غیر
ملکی لوگوں سے روابط اور مروجہ تعلیم کی فراوانی سے لازمی طور پر ان لوگوں میں رواداری پیدا ہو گی۔ اور وہ
وقت واقعی نہایت مبارک ہو گا۔ بشرطیکہ نجد رواداری کے ساتھ اپنی جبلی عصبیت اور مذہبی جوش کو قائم
رکھ سکے۔

گذشتہ باب میں ذکر آ چکا ہے۔ کہ سلطان ابن سعود کی سب سے بڑی اصلاح یہ ہے۔ کہ اُس نے صحرائی
بدوؤں کو زراعت میں مشغول کر کے اُنکی مستقل بستیاں آباد کر دی ہیں۔ اور اُن کو تحریک اخوان میں شامل کر کے

ایک تربیت یافتہ اور منظم جماعت بنا دیا ہے۔ لیکن اس اصلاح کی راہ میں بڑی دقّت یہ ہے کہ ایک تو زراعت کے قابل اراضیات معقول تعداد میں میسّر نہیں آسکتیں۔ دوسرے اندرونِ ملک میں پانی کی بیحد قلت ہے۔ موجودہ مقدار سے تو روزمرہ کی ضروریات زندگی بھی بخوبی پوری نہیں ہوسکتیں۔

حجاز کے محاصل کا سب سے بڑا ذریعہ حج کی آمدنی ہے۔ مختلف وجوہات سے یہ آمدنی غیر یقینی ہے اور وثوق کے ساتھ اس پر حصر نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ساتھ ہی یہ واقعہ ہے۔ کہ حج اسلام کا جزو لاینفک ہے۔ اور اصولی ارکان میں سے ہے اس لئے حجاج کی تعداد کے متعلق چنداں فکر کی گنجائش نہیں۔

حجاز میں ابھی تک کوئی صنعت وحرفت ایسی نہیں۔ جو کہ ملک کی مالی حالت پر اثر انداز ہوسکے۔ زراعت بہت کم ہے۔ اور خام اجناس کی پیداوار ملک کی ضروریات کیلئے بھی کافی نہیں۔ کسی زمانے میں خلیج فارس کی موتی کی تجارت ساحلی نجدیوں کی خوش حالی کا باعث تھی لیکن جنگِ عظیم کے وقت سے یہ تجارت تباہ ہو چکی ہے۔ اور بالفعل وسیع پیمانے پر منفعت بخش نہیں۔ لیکن ممکن ہے۔ کہ یہ تجارت پھر کسی وقت چل نکلے۔ اور معقول تعداد کے گذران کا باعث ہوسکے۔

گذشتہ زمانے میں حجاز اور نجد میں گھوڑے اور اونٹ کی تجارت بہت زوروں پر تھی۔ اب یہ کاروبار بالکل گرا ہوا ہے۔ موٹر کاریں دنیا کے ہر حصے میں رواج پذیر ہو رہی ہیں۔ اور نقل وحرکت کے سریع رفتار ذرائع کے مقابلے میں اونٹ اور گھوڑے کا مقبولِ عوام ہونا محال ہے۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ کہ صوبہ الحصا میں تیل کے چشمے اور حجاز میں معدنیات کی کانیں ہیں لیکن ابھی تک یہ خیال پایۂ تصدیق کو نہیں پہنچ سکا۔ اسلئے جبتک کانکنی کا کام شروع نہ ہو۔ تب تک اس بارے میں کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔

البتہ اتنا بیان کر دینا نہایت ضروری ہے۔ کہ جس طرح سلطان ابن سعود نے اپنی مملکت میں کامل امن وامان پیدا کر دیا ہے۔ اسی طرح سے وہ اقتصادیات کی طرف سے غافل نہیں ہے۔ اور جہانتک ممکن ہے۔ اپنے ملک کی زراعت اور تجارت کو ترقی دے رہا ہے۔ خوشحالی اور آسودگی کیلئے اس کی سخت ضرورت ہے۔ اور سعودی حکومت نے اس ضرورت کو باحسن وجوہ پورا کر دیا ہے۔ ملک کے وسائل اور ذرائع اور طبائع کی صلاحیت کیمطابق اقتصادیات میں بھی خفیف ترقی ہو رہی ہے لیکن تعلیمی ترقی کی طرح سے اقتصادی ترقی کے نتائج بھی چند برسوں میں قابلِ اعتنا نہیں ہوسکتے۔

(۲)

اجنبی مداخلت کی راہیں باز ہو گئیں

ایک عرصے سے دولت سعودیہ اور مغربی سرمایہ داروں کے مابین حجاز کی معدنی دولت کے متعلق گفت و شنید جاری تھی شروع میں سلطان ابن سعود کی خواہش تھی۔ کہ خالص اسلامی سرمایہ کی کمپنیاں معرض وجود میں آئیں اور حجاز کے قدرتی ذرائع و وسائل کو ترقی دیں لیکن مسلمانان عالم کے انتشار اور اقتصادی پست حالی کی وجہ سے ایسی کمپنیوں کی ترتیب و تشکیل نہ ہو سکی۔ ادھر سلطان کو تہذیب و اصلاح کے ہر قدم پر مالی دقتوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ مجبوراً اُس نے مغربی سرمایہ داروں سے معاملہ کر لینا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ حال میں سلطان نے ایک انگریزی کمپنی سے حجاز مقدس میں کانکنی کے متعلق معاہدہ کر لیا ہے۔ اس اجارے کی بعض اہم شرائط ذیل میں درج ہیں:۔

۱۔ حکومت کمپنی کو یہ حق دیتی ہے۔ کہ وہ ضروری حد تک اُن معدنیات کو جو حکومت کی ملک میں ہیں مثلاً مٹی۔ پتھر۔ چونا۔ گارا اور دیگر اسی قسم کی اشیاء استعمال کر سکتی ہے لیکن لکڑی صرف خانگی ضرورت کے ماسوا مکانات و تعمیر کیلئے بلا معاوضہ استعمال کرنے کا حق نہیں۔

۲۔ ان حقوق کے معاوضہ میں کمپنی حکومت کو خاص وسائل نقل و حرکت و آمد و رفت استعمال کرنے کا حق خطرات کے وقت عطا کرتی ہے۔ اگر اس استعمال کی وجہ سے نقصان پہنچے۔ تو اس کا معاوضہ ادا کیا جائیگا۔ خواہ وہ نقصان اُن وسائل کی اندرونی خرابی کی وجہ سے ہو۔ یا حکومت کے استعمال اور اس کے سامان کی نقل و حرکت کی وجہ سے۔

تشریح:۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اُن تخمینی منافع کا معاوضہ نہ دیگی۔ جو اس زمانہ استعمال میں کمپنی اُن وسائل سے حاصل کر سکتی ہے یا یہ کہ اتفاقیہ یہ وسائل کسی اچانک غیبی سبب کی بنا پر بیکار ہو جائیں یا نقصان پہنچ جائے۔ تو اس کا معاوضہ بھی حکومت کمپنی کو نہ دیگی۔

(۳) اگر کوئی زمین کسی شخص کے ٹھیکہ یا ملک میں ہو۔ اور کمپنی کو کانکنی یا معدنیات کی تحقیقات یا اُسکی درستگی کیلئے اس زمین کی ضرورت ہو۔ تو کمپنی اس زمین کے مالک یا ٹھیکیدار کو مناسب معاوضہ دیکر اُسے حاصل کر سکتی ہے۔ اور اس بارے میں حکومت بھی اُسکے حصول کیلئے کمپنی کو مدد کریگی۔ خواہ کمپنی کا مفاد

اس زمین کی سطح یا اسکو کھودنے سے وابستہ ہو۔

دفعہ ششم (۱) کان کنی وغیرہ مذہبی اور مقدّس مقامات مثل مقابر و مساجد میں نہیں ہوسکتی اور نہ کمپنی ان مذہبی مقامات کو کسی اور غرض کیلئے استعمال کر سکتی ہے۔

(۲) کمپنی اوقات دفتر میں مجاز عمّال حکومت کے سامنے حکومت کی اطلاع کیلئے تمام رجسٹر پیش کریگی اور متعلقہ معلومات میں آسانیاں بہم پہنچائیگی۔

(۳) کمپنی کے تمام عمّال وکارکن حکومت کے انتظامی سیاسی اور دینی معاملات میں مملکت عربیہ کے اندر کوئی مداخلت نہ کرینگے۔ اور جو شخص اسکی خلاف ورزی کریگا۔ اسے قانون حکومت کے مطابق جلاوطنی اور جرمانہ کی سزا دی جائیگی۔

تشریح: مطلب یہ ہے۔ کہ اس بارہ میں عمّال کمپنی کے ساتھ وہی قانونی سلوک کیا جائیگا جو حکومت کی رعایا کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

(۴) کمپنی کے محکمہ انتظامی میں چند ایسے اشخاص ہونگے جنہیں خود کمپنی منتخب کریگی۔ مگر وہ کمپنی کیلئے اجنبی رعایا کو ملازم نہ رکھیں بلکہ سعودی رعایا کو مقدم سمجھیں۔ جب تک کہ انہیں کمپنی کے کام کیلئے ایسے آدمی ملتے رہیں۔ ہاں جب اسکے خاص کاموں کیلئے یہاں آدمی میسر نہ آئیں۔ تو وہ انہیں مقرر کرنے سے پہلے حکومت سے مشورہ کرینگے۔ اور انکے ناموں کی اطلاع ایک ماہ قبل دینگے۔ اگر حکومت نے اس مدّت میں ان پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ تو کمپنی اسے حکومت کی رضامندی سمجھے گی۔ اسی طرح منتظمین کمپنی کے لئے اس کا بھی حق نہیں کہ وہ سعودی رعایا سے ایک ماہ سے زائد کا معاہدہ کریں۔ مگر حکومت کے مشورے کے بعد ایسا کر سکتے ہیں۔ اگر پندرہ روز کے اندر حکومت کمپنی کو اس قسم کے استفسار کا جواب نہ دے تو کمپنی اس سکوت کو حکومت کی رضامندی سمجھے۔

(۵) کمپنی اس امر کا لحاظ رکھیگی۔ کہ وہ اپنے عمّال کیلئے اندرون مملکت میں کام لینے کے متعلق ایسے ضوابط منظور کریگی۔ جو حکومت عربیہ سعودیہ کے مروّجہ قوانین سے یا جو آئیندہ وضع کئے جائیں متصادم نہوں

(۶) کمپنی حکومت کیلئے چند نسخے ان تمام ضوابط اور احکام کے پیش کریگی۔ جو معاہدہ ہذا کے مطابق اس کام کو انجام دینے کیلئے اس نے وضع کئے ہیں۔

(۷) کمپنی حکومت کے سامنے خاص خاص معلومات بہم پہنچانے کیلئے چھ ماہ کے اندر گذشتہ چھ ماہ

کے کاموں کی رپورٹ پیش کریگی۔

(۸) کمپنی عہدہ داران حکومت یا وکلاء حکومت کیلئے جو اپنے فرائض انجام دینے آئیں۔ وسائل نقل و حرکت و ذرائع آمد و رفت میں آسانیاں بہم پہنچائیگی۔

(۹) فی الحال حکومت نے کمپنی کو یہ ٹھیکہ دفعہ سوئم کے فقرہ ت کی اور دفعہ پنجم کے فقرہ الف کی شرائط مذکورہ بالا کے مطابق دیدیا ہے لیکن کمپنی جب معلومات حاصل کرلے۔ اور ان معلومات سے عملی فائدہ حاصل کرنے کا قصد کرے۔ تو وہ ایک یا چند ماتحت کمپنیاں معدنیات کو نکالنے۔ انہیں صاف کرنے یا کان کنی کا سامان بہم پہنچانے کیلئے قائم کرنا چاہے۔ تو یہ بڑی کمپنی حکومت کو ماتحت کمپنی یا چند کمپنیوں کے راس المال میں پندرہ فیصدی حصص دیگی۔ اور ماتحت کمپنیوں پر وہ شرائط لازم ہونگی جو قرارداد (ب) میں بیان کیگئی ہیں۔ نیز یہ کہ بڑی کمپنی حکومت عربیہ سعودیہ کی رعایا کے سامنے دس فیصدی حصص پیش کریگی جنکا قبول کرنا یا رد کرنا تین ماہ کے اندر تاریخ پیشی سے ضروری ہے۔

اس ماتحت کمپنی یا کمپنیوں کیلئے یہ امر ضروری ہوگا۔ کہ وہ اپنے فرائض پوری محنت و کوشش سے انجام دیں۔ یہانتک کہ کم وقت میں وہ معدنیات فن تعدین کے مطابق تجارت کے قابل ہو جائیں کانکنی کے اعمال میں آلات و سامان کانکنی کا منگانا اور انہیں بلا دِ عربیہ سعودیہ میں پہنچانا شامل ہے۔ مزید برآں اس میں کھودنا۔ زمین کو برمانا۔ معدنیات کو صاف کرنا۔ سڑکیں بنانا۔ خیمے کھڑے کرنا۔ سوار یاں رکھنا۔ وسائل آمد و رفت و ذرائع نقل و حرکت مہیا کرنا۔ مکانات تعمیر کرنا۔ اور وسائل کھدائی کا بہم پہنچانا بھی شامل ہے۔ فن کانکنی کے لحاظ سے وسائل کھدائی کی تین قسمیں ہیں۔

نیز اسی طرح کانکنی کے اعمال میں یہ داخل ہے۔ کہ زمین کے نیچے علم طبقات الارض کے اصول پر کھدائی کے ذریعہ پانی اور دیگر قسم کے مواد کی معلومات بہم پہنچائی جائیں۔

(۱۰) مندرجہ بالا شرائط کے مطابق ایک ٹھیکہ یا چند ٹھیکے اس شرط پر دئے جائیں گے۔ کہ ایک کمپنی یا چند کمپنیاں جو مذکورہ بالا اغراض کیلئے قائم ہوں۔ وہ ٹھیکہ ملنے کی تاریخ سے نصف سال کے اندر غیر صاف شدہ معدنیات کا پانچ فیصدی حصہ حکومت کو ادا کریگی۔ اور اس بناء پر دوران کانکنی دفعہ چہارم کے فقرہ ت کے مطابق جسکا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ زرِ معاوضہ خود بخود ساقط ہو جائیگا۔

دفعہ ششم:۔ یہ معاہدہ حکومت کی طرف سے مندرجہ ذیل اسباب کی بناء پر فسخ ہو سکتا ہے:۔

(۱) جس وقت کمپنی تین ماہ سے زائد مدت کیلئے اپنا کام بند رکھے۔ اس شکل میں حکومت کمپنی کو ایک خط لکھکر یا تار دیکر معاہدہ کالعدم کر دیگی۔

تشریح:- کام بند ہونیکے یہ معنی ہیں۔ کہ جب کمپنی ہذا کا کوئی نمائندہ جو بلاد عربیہ کیلئے متعین تھا۔ متواتر تین ماہ تک یہاں موجود نہ رہے۔ تو سمجھا جائیگا۔ کہ کمپنی نے کام بند کر دیا۔

(۲) کمپنی کو کسی ایک رقبہ یا تمام رقبہ جات میں اس حالت میں کام بند کرنے کا حق ہے جبکہ کمپنی کے ماہرین آپس میں غور و فکر اور بحث کریں۔ لیکن اس شکل میں کام بند کرنے سے تیس دن پہلے بذریعہ تار حکومت کو اطلاع دینی ہوگی۔ تار بھیجنے کی شکل میں پھر اسکی تائید تحریر کے ذریعہ بھی ضروری ہے تین ماہ سے زیادہ کام کا بند کرنا اسباب قاہرہ کے ماسوا کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ اور اس حالت میں حکومت کو بموجب فقرہ ع۱۔ یہ حق حاصل ہے۔ کہ وہ:-

(۱) ایک رقبہ میں جہاں کام بند ہوا ہو یا تمام رقبہ جات میں معاہدہ کو منسوخ کر دے۔

(۲) جب کبھی یہ معاہدہ منسوخ کیا جائیگا۔ تو مندرجہ ذیل تجاویز کے علاوہ تمام دفعات میں معاہدہ مذکورہ کالعدم سمجھا جائیگا۔

(الف) کمپنی کی تمام جائیداد غیر منقولہ مثلاً سڑکیں۔ حوض۔ کوئیں وغیرہ معہ اپنے تمام متعلقات و مکانات و سواریوں کے فسخ معاہدہ کی شکل میں بلا معاوضہ حکومت کی ملک ہو جائیگی۔

(ب) کمپنی کی تمام جائیداد منقولہ کی مناسب قیمت جو بلاد عربیہ میں رائج ہے۔ حکومت کمپنی کو ادا کر دیگی۔ بشرطیکہ وہ اس جائیداد منقولہ کو لینا پسند کرے۔ اور اگر تیس۳۰ دن کے اندر فسخ معاہدہ کے بعد قبول کرنے کی اطلاع نہ دے۔ تو کمپنی مجبور ہوگی۔ کہ وہ چھ ماہ کے اندر اس کو لے جائے۔ ورنہ اس کے بعد وہ تمام منقولہ اشیاء بھی بلا کسی معاوضہ کے حکومت کی ملک شمار کی جائیں گی۔

متذکرہ بالا شرائط کی تصریح میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اتنی بات صاف ظاہر ہے کہ حجاز اور دولت سعودیہ کو اقتصادی فوائد و منافع حاصل ہوں یا نہ ہوں حکومت انگلشیہ کو اس مقدس سرزمین میں مداخلت کرنے کیلئے وسیع میدان ہاتھ آگیا ہے۔ اب مدبران انگلستان جب چاہیں پورے ملک میں استعمار کے جال بچھا سکتے ہیں۔

---

(۲)

اشتباہ

آئے دن اخبارات میں حجاز کی معدنی دولت کے متعلق خبریں شائع ہوتی ہیں۔ مشہور ہے کہ عنقریب حجاز کی مقدس سرزمین میں زر و مال کے وافر خزانے دریافت ہونے والے ہیں۔ اور سلطان ابن سعود مغربی سرمایہ کی متعدد کمپنیوں کو معینہ مدت کیلئے اجارے دینے والے ہیں۔ واضح ہے کہ ابتک مسلمانوں کے منبع و ماخذ کا تحفظ دو باتوں پر مبنی تھا۔ ایک تو مغربی طاقتوں کی باہمی رقابت دوسرے حجاز کی اقتصادی پستی اور مالی بدحالی معلوم ہے کہ مغربی طاقتیں ایسے ملک میں استعمار کا جال پھیلانے سے گریز کرتی ہیں۔ جہاں جلبِ منفعت کے معقول امکانات نہ ہوں۔ مسلمانوں کے مذہبی احساسات کا احترام کسی کو ملحوظِ خاطر نہیں۔ اگر حجاز میں معدنیات کی کانیں مل گئیں۔ تو یقیناً چند سرمایہ دار مالامال ہو جائیں گے۔ سلطان ابن سعود کو عارضی طور پر بہت معقول محاصل میسر آئینگے۔ حجاز کی عام مالی حالت میں بھی خفیف سی ترقی ہو جائیگی۔ اور بہت سے بیکاروں کو کسبِ معاش کے ذریعے حاصل ہو جائینگے۔ لیکن حجاز کی آزادی اور مسلمانانِ عالم کی ناموس کا خدا حافظ ہوگا۔ استعمار کی طاقتیں اس قدر ہمہ گیر ہیں۔ کہ سازش سے عسکری دباؤ سے۔ امن و امان کے بہانہ سے تہذیب و شائستگی کی نشر و اشاعت کے بہانے سے۔ غرض یہ ہے کہ ہزاروں طریقوں سے ملکوں کی آزادی اور قوموں کی خود مختارانہ زندگی کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دیتی ہیں۔ اور ٹلنے کا نام نہیں لیتیں۔ مشرقی ممالک کی تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔ کہ ابن سعود کی ریاست سے زبردست سلطنتیں اس جوع الارضی کا شکار ہو چکی ہیں۔ ابن سعود میں اس قدر مالی اور عسکری طاقت نہیں ہے۔ کہ کسی ایک مغربی طاقت کا مقابلہ کر سکے اسکی ریاست کے مالی اور اقتصادی ذرائع اس قدر محدود ہیں۔ کہ طویل جنگ تو کجا۔ معمولی چپقلش کی بھی بساط نہیں۔ صرف مذہبی جوش و خروش قومی شجاعت و جسارت اور آزادانہ خود سری اور سرکشی سے جدید اسلحہ اور منظم تربیت یافتہ افواج کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ مشرق نے دیکھ لیا ہے کہ قومی غیرت اور حمیت خرید لی جاتی ہے۔ تہوّر و شجاعت برتر نظام کے سامنے کوئی چیز نہیں۔ مذہبی جوش کچھ عرصہ کے بعد فرو ہو جاتا ہے۔ حوصلے پست اور جرأتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ زر و مال کے لالچ سے ہزاروں قومی غدار پیدا ہو جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ قومی شرافت اور ملی حمیت کا استعمار اور محکومیت کے شکنجے میں گھٹ گھٹ کر دم نکل جاتا ہے۔ قوم ہمیشہ کیلئے یا کم از کم طویل مدت کیلئے مُردہ اور بالکل بے دست و پا ہو جاتی ہے۔

اس کتاب کے مؤلف کی ایزدِ متعال سے اسکی قدرتِ کاملہ اور رحمتِ واسعہ کے طفیل اور حضور سرورِ کائنات محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام و ناموس کے طفیل دُعا ہے۔ کہ حجاز میں معدنیات دستیاب نہ ہوں۔ اور استعمار پسندوں کو خشک اور بے آب و گیاہ مٹی کے سوا اس مقدس مُلک میں کچھ ہاتھ نہ آئے۔ آمین ثم آمین۔

باب سی و ششم

(۱)

نجد میں سلطان کا تکلّف سے تنفّر اور طریقِ انصاف

ابن سعود کی عادت ہے۔ کہ امورِ سلطنت کو عوام کے مواجہ میں سرانجام دیتا ہے جب وُہ ریاض میں سکونت پذیر ہو تو محل کی سیڑھیوں پر جو کہ وسیع صحن کے بالمقابل بنی ہوئی ہیں بلا تکلف بیٹھ جاتا ہے سفر کی حالت میں خیمہ کے دروازہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ دیہات اور قصبات کے دورہ میں یا تو کسی کھلے چوک میں یا کسی مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھتا ہے۔ اسکے اردگرد شیوخ اور اکابرین ہوتے ہیں۔ اُسکی باڈی گارڈ بھی ساتھ ساتھ موجود رہتی ہے جنگجو وہابیوں کی ایک چیدہ جماعت ہے۔ جو کہ لمبے عبا پہنے ہر وقت اسلحہ بند رہتی ہے۔

نظم و نسقِ سلطنت کے جملہ معاملات اور داد خواہی اور انصاف طلبی کے کل مقدمات اس جمگھٹ کی موجودگی میں پیش ہوتے ہیں۔ مقدمات مختلف نوعیتوں کے ہوتے ہیں۔ کہیں چاہات کے متعلق تنازعہ ہو مویشی چرانے اور چراگاہ کے حقوق کے متعلق جھگڑا ہے سرحد کے بارے میں فریقین کا اختلاف ہے۔ ندی نالوں کے متعلق چپقلش ہے۔ مویشی کے ملکیت کے بارے میں نقصِ امن کا احتمال ہے۔ نقصانِ جانی زدوکوب قتل و غارت چوری چکاری کے استغاثے ہیں۔

ہر شخص کو ابن سعود کے حضور میں بذاتِ خود عرض معروض کرنے کا حق ہے کسی ماتحت اور رشتہ دار کی مداخلت نہیں ہوتی۔ تحریری درخواست ہونا بھی ضروری نہیں۔ بڑے اہم معاملات کا زبانی تصفیہ ہو جاتا

ہے کسی مقامی حاکم کے فیصلے سے مرافعہ بھی زبانی ہو سکتا ہے۔ سلطان بسا اوقات نرمی اور فراخ حوصلگی سے سلوک کرتا ہے بعض اوقات سختی کا اظہار بھی ہوتا ہے پیشتر ازیں ذکر ہو چکا ہے۔ کہ اگر ابن سعود مشتعل ہو جائے۔ تو بالکل مغلوب الغیظ ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ عام طور پر تیز کلام ہے۔ لیکن بہت جلد غصہ اتر جاتا ہے انصاف پروری کے معاملے میں بڑے چھوٹے کا امتیاز روا نہیں رکھتا۔ بلا رعایت اور بے لوث فیصلہ سنا دیتا ہے۔ مظلوم کی دادرسی اور ظالم کی سرکوبی اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے۔ سلطنت میں کوئی نہیں جو خواہ کتنی حیثیت اور وجاہت کیوجہ سے بچ سکتا ہو۔ ہر شخص دوسرے پر تعدی کرنے سے خائف ہے۔ جانتا ہے کہ سلطان کا غضب و قہر اچانک ٹوٹ پڑیگا یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کو سلطان کے عدل و انصاف پر کلی اعتماد ہے۔ اور سلطنت میں کامل امن و امان قائم ہے۔

ہر معاملے اور ہر قضیے میں شریعت حقہ کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے جو اصول وضع کئے ہیں ان کے مطابق تصفیہ معاملات ہوتا ہے۔ اگر کسی بات کے متعلق قرآن مجید میں حکم موجود نہ ہو۔ تو سنت رسول اللہ صلعم پر حصر کیا جاتا ہے۔ قرآن کے احکام کے ماتحت ابن سعود کو رعیت کے مال و جان پر پورا اختیار حاصل ہے بشرطیکہ اس کا فیصلہ خلاف شریعت نہ ہو وہ موت تک کی سزا دے سکتا ہے۔ اسکے فیصلہ کی کوئی اپیل نہیں البتہ وہ خود نظر ثانی کر سکتا ہے۔

سائل اور مسئول الیہ دونوں حاضر ہوتے ہیں۔ انکے مواجہہ میں مقدمہ کی سماعت ہوتی ہے۔ کوئی مبہم اور پیچیدہ ضابطہ مقرر نہیں۔ وکلاء پیروی نہیں کر سکتے۔ نہ تو کسی شخص کو فریب اور مکر کی دلائل پیش کرنیکی اجازت دی جاتی ہے۔ جھوٹ کو سچ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ شہادت اسی وقت لیجاتی ہے۔ اور فوری فیصلہ سنا دیا جاتا ہے۔

مغربی مصنفین نے اسکے انصاف اور طریق عدالت کی بہت سی مثالیں بیان کی ہیں۔ نہایت اختصار کے ساتھ یہاں چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں:۔

ایک بدوی چوری کے الزام میں ماخوذ ہوا۔ مستغیث نے حلف اٹھایا کہ ملزم ایک مرے ہوئے اونٹ کے پاس سے گذرا۔ کاٹھی بھی وہیں پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس نے اٹھا لی۔ اونٹ اور کاٹھی مستغیث کی ملکیت تھی۔ یہی شہادت معقول قرار پائی۔ ابن سعود نے فوراً حکم سنا دیا۔ جلاد نے چوری کی سزا میں ملزم کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا۔ بعد میں ملزم کی تشہیر عوام میں کر دی گئی۔

ایک مرد اور ایک عورت زنا کے الزام میں پیش ہوئے۔ عورت فاحشہ تھی۔ مرد بدچلن ہونیکے علاوہ میخوار بھی تھا۔ کویت سے شراب لایا کرتا تھا۔ ابن سعود نے حکم دیا۔ کہ عورت کو کوڑے مار کر شہر بدر کر دیا جائے۔ مرد کے کوڑے وہیں لگوائے گئے۔ اور حکم ہؤا۔ کہ اگر وہ جان سے بچ جائے۔ تو نجد میں رہنا نہ پائے۔ ورنہ سزائے موت دیجائیگی

دو آدمیوں میں تنازعہ ہو گیا۔ ہاتھا پائی میں ایک شخص مارا گیا۔ مقتول کے ورثا خون کے دعویدار ہوئے۔ قاتل کو سزائے موت سنا دیگئی۔ لیکن اسکے رشتہ داروں نے خون بہا دینا چاہا۔ ابن سعود نے مقتول کے ورثا کو نہایت معقول رقم بطور خون بہا دلوا دی۔ اور قاتل کو رہا کر دیا۔

ناظرین کو معلوم ہے۔ کہ شریعت اسلامیہ کے مطابق اگر مقتول کے ورثا رضامند ہو جائیں۔ تو قصاص کے عوض خون بہا دیا جا سکتا ہے۔

ایک عورت روتی ہوئی ابن سعود کے حضور میں آئی۔ اور استغاثہ کیا۔ کہ اسکے ہمسایہ کی گائے اسکے باغ میں داخل ہو کر اس کا گھاس کھا گئی ہے۔ طلب ہونے پر ہمسایہ نے حلف پر انکار کیا۔ ابن سعود نے حکم دیا۔ کہ گائے کا پیٹ چاک کیا جائے۔ گائے کے معدہ میں بہت سا گھاس موجود تھا۔ گائے کی نعش تو مالک کے پاس رہی۔ لیکن اُسے نقصان رسانی اور حلف دروغی کی سزا میں بھاری جرمانہ ہؤا۔

کئی سال ہوئے بعض اہل مکہ نے سلطان ابن سعود کو بھیجنے کیلئے ایک محضر تیار کیا تھا۔ اس میں محکمہ حفظان صحت کی شکایات درج تھیں۔ یہ محضر ایک شخص مسمی حسن سلیمان کو دیا گیا۔ تاکہ سلطان کی خدمت میں پہنچا دے۔ نائب السلطنت امیر فیصل سلطان کا دوسرا لڑکا جو حجاز کا وائسرائے تھا۔ موجود نہ تھا۔ اسکی عدم موجودگی میں اسکے مشیر خاص شریف حسین عدنان اور شیخ عبد العزیز عتیقی حکومت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ جب انہیں اس محضر کا حال معلوم ہؤا۔ تو انہوں نے شخص مذکور کو طلب کیا اور محضر لے لینا چاہا۔ اس نے انکار کیا۔ اس پر شریف حسین عدنان نے غصہ میں آکر اُسے دو گھنٹے کیلئے قید کر دیا۔ شخص مذکور جب رہا ہؤا۔ تو اس نے جلیل القدر عہدہ داروں کے خلاف نالش کر دی۔ نالش میں حسب ذیل امور درج کئے۔

۱۔ کہ انہوں نے سلطان کی توہین کی۔ کیونکہ وہ محضر لے لینا چاہا۔ جو خاص اس کیلئے مخصوص تھا۔ اور سائل کو بارگاہ سلطانی تک پہنچنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

۲۔ کہ انہوں نے بغیر کسی قانونی موجب کے مدعی کو دو گھنٹے حراست بیجا میں رکھا۔

۳۔ انہوں نے سرکاری محکمہ کے خلاف شکایات کی تحقیقات نہیں کی۔

سلطان نے دعویٰ سنکر حسب ذیل تنقیحات برآمد کیں۔ اور امور قرار طلب کے تصفیہ کیلئے کاغذات مجلس تفتیش کے حوالے کردئیے۔

۱۔ کیا مدعا علیہما کو اس کارروائی کا حق تھا۔ جو انہوں نے کی۔

۲۔ کیا انہیں ایسی کارروائیاں کرنے کیلئے چھوڑ دینا چاہئیے۔

مجلس تحقیقات نے تحقیقات کی۔ مدعی۔ مدعا علیہما اور گواہوں کے بیانات سنے۔ اور بالآخر سلطان کے سوالوں کے یہ جواب بھیجے۔

انہیں ہرگز ہرگز حق نہ تھا۔ کہ ایسی کارروائی کریں۔ اور انہیں بغیر سزا کے نہ چھوڑنا چاہیئے نیز انہوں نے ایک قانون مرتب کر دیا۔ کہ جو عہدہ دار بھی اپنے اختیارات سے متجاوز ہو کر کارروائی کریگا۔ یا کسی شخص کے قانونی حقوق سے ناجائز تعرض کریگا۔ اُسے سرکاری خدمت سے بلا پنشن علیحدہ کر دیا جائیگا۔

مجلس کا فیصلہ معلوم کر کے سلطان نے دونوں عہدہ داروں کو فوراً ملازمت سے برطرف کر دیا۔ اور آئیندہ کیلئے بھی انہیں سرکاری خدمت سے محروم کر دیا۔

اہالیان ہندوستان اس قسم کے انصاف کے عادی نہیں۔ وہ پیچیدہ مغربی ضابطوں کے دلدادہ ہیں۔ انکی نگاہ میں اس قسم کی مختصر کارروائیاں انصاف و دادپروری سے بعید ہیں۔ لیکن شائد انہیں معلوم نہیں۔ کہ مغربی تمدن میں کورٹ فیس اور متعدد و مختلف اخراجات کی صورت میں انصاف کی قیمت وصول کی جاتی ہے۔ عدالت میں اس قسم کا ماحول لازمی طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ غریب اور بے بضاعت آدمی دادرسی حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر کرتا بھی ہے تو معقول اثاثہ تباہ کرنیکے بعد۔ لیکن ابن سعود کی سلطنت میں انصاف کا کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا۔ نہ ہی کثیر اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ قاضی کی عدالت اور خود ابن سعود کا دربار ہر کس و ناکس کیلئے ہر وقت کھلا رہتا ہے۔

نجد میں جرائم کی سزائیں شریعت اسلامیہ کے مطابق دی جاتی ہیں۔ بعض مغرب کے دلدادہ ان سزاؤں کو سخت سمجھتے ہیں۔ یورپ کے معترضین تو ان سزاؤں کو سراسر وحشیانہ بتاتے ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے اور تاریخ میں متعدد شہادتیں اس امر کے ثبوت کی موجود ہیں۔ کہ جہاں جہاں اور جس جس وقت اسلامی تعزیر کو رائج کیا گیا۔ امن و امان میں نمایاں اور معتدبہ ترقی ہوئی۔ اور جرائم کا ارتکاب بہت کم ہو گیا چنانچہ اعداد و شمار کے مقابلے سے اور سیاحین کے مشاہدہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ کہ یورپ کے بڑے سے بڑے مہذب

اور شائستہ ملک کے مقابلہ میں ابن سعود کی سلطنت میں جرائم کی وارداتیں بہت ہی کم ہوتی ہیں۔

ابن سعود کی سادہ اور خالی از تکلف معاشرت سے جہاں نجدی قوم کو فوائد و منافع حاصل ہیں خود اسے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ یوں کہنا چاہئیے کہ وہ خود ہر وقت ابتلا و امتحان میں مبتلا رہتا ہے صحرا میں ہو یا بستی میں اس کے اردگرد ایک ہجوم سا لگا رہتا ہے جو اسکی خفیف سے خفیف حرکت کو نگاہ میں رکھتا ہے۔ ابن سعود اخفا کی کاروائی عمل میں نہیں لا سکتا۔ حکومت کا کوئی عنصر یا نظام ایسا نہیں جسکی وجہ سے وہ اپنی ذمہ واری کو دوسروں کے سر ڈال سکے۔ ہر حکم اور ہر کاروائی کا وہ بذات خود ذمہ وار ہے۔ ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس قسم کے حالات میں اگر وہ کہیں کمزوری اور عجز کا اظہار کر بیٹھے یا اپنی ناواقفیت اور عدم استقلال کا ثبوت دیدے۔ تو اسکے لئے نتائج و عواقب کس درجہ خطرناک ہوں یا ایک لفظ میں اس کا تخت سلطنت زیر و زبر ہو سکتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ اُسے ہر وقت اور ہر لحظہ بیدار، مستعد اور مصروف رہنا پڑتا ہے۔ عام حکمران اس قسم کے کوائف کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن نجد کے فرمانروا کی کامیابی کیلئے یہ سب باتیں ناگزیر ہیں۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ تاوقتیکہ نجد کا فرمانروا نجد بھر میں سب سے بڑا شجاع و فیاض سب سے بڑا پابند شرع بہترین مدبر، مسلم الثبوت فقیہ اور ماہر سیاستدان نہ ہو۔ اس کا تخت سلطنت پر ایک عرصہ تک متمکن رہنا ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ از روئے انصاف کہنا پڑتا ہے کہ ابن سعود موجودہ عرب کی عظیم ترین شخصیت ہے۔

---

(۴)

سلطان ابن سعود کا روزانہ پروگرام

سلطان ہر روز صبح کاذب کیوقت بیدار ہو جاتا ہے۔ اتنی سویرے کہ محل کے خدام ابھی خواب راحت میں ہوتے ہیں۔ وہ اپنی معمولی اور طبعی سادگی سے وضو کیلئے خود ہی پانی لے لیتا ہے کسی کو اپنی خدمت کیلئے نہیں جگاتا۔ وضو کے بعد قرآن کی تلاوت بہت خضوع و خشوع سے کرتا ہے۔ یہ ہر روز کا معمول ہے۔ اسمیں کبھی ناغہ نہیں ہوتا۔ اتنے میں فجر کی اذان ہو جاتی ہے۔ ابن سعود مسجد کو چلا جاتا ہے۔ جماعت کے ساتھ فریضہ صبح ادا کرتا ہے کیونکہ وہ صرف سلطان اور ملک ہی نہیں۔ بلکہ نجدیوں کا امام ہے۔ اسلئے بسا اوقات خود ہی امامت کرتا ہے۔ بڑے بڑے نجدی علماء مقتدی ہوتے ہیں۔ نماز کے بعد محل کو واپس آتا ہے۔ خاندان کے افراد جمع ہوتے ہیں ناشتہ پیش

ہوتا ہے۔ کھانا مغربی طرز کا تیار نہیں ہوتا۔ خالص نجدی وضع کا ہوتا ہے۔ ابن سعود تمام خاندان کے ساتھ ناشتہ تناول کرتا ہے۔ اس دوران میں تبادلِ خیالات بھی ہوتا رہتا ہے۔ یگانگت تو پہلے سے ہے اس سے اور اختلاط بڑھتا ہے کامل راحت اور یک جہتی کا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ ناشتہ کے بعد دفتر کے اوقات شروع ہوتے ہیں۔ سلطان اپنے ایوان میں بیٹھ جاتا ہے۔ سرکاری کاغذات ملاحظہ کرتا ہے۔ خطوط اور مختلف عہدہ داروں کے مراسلے پیش ہوتے ہیں۔ وُہ ہر ایک کیلئے احکام لکھتا ہے۔ سیکرٹری کے توسط کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ سلطان خود ہی جملہ امور سر انجام دیتا ہے۔ سرکاری کاموں میں اسی طرح ڈھائی تین گھنٹے فرصت نہیں ہوتی۔ اسکے بعد وہ ایوان عام میں آتا ہے۔ یہاں اکابرین ملت اور اعیانِ دولت پہلے سے حاضر ہوتے ہیں۔ ان سے گفت و شنید شروع ہوتی ہے۔ اسمیں کوئی تکلف اور حجاب نہیں ہوتا۔ انتہائی سادگی اور صاف گوئی سے کام لیا جاتا ہے۔ اسکے بعد اخوان کے وفود جو دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوتے ہیں۔ حاضر ہوتے ہیں۔ ایسے وفود ہر روز ملک کے مختلف حصوں سے آتے رہتے ہیں۔ اور یہ تانتا کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ لوگ خود سلطان سے تربیت یافتہ ہیں۔ اسلئے بڑی ہی بے تکلفی سے باتیں کرتے ہیں ان لوگوں کے اوصاف اپنے مقام پر بیان ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ بہت جری اور بے باک ہوتے ہیں سلطان کے روبرو بھی بڑے آزاد مزاج ہیں اپنے امام سے اس طرح سے گفتگو کرتے ہیں جیسے کہ بڑے بھائی کے سامنے ہیں وُہ اس کو یا عبدالعزیز کہہ کر پکارتے ہیں۔ شاہی آداب و القاب کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ یہ طرزِ خطاب خود سلطان کا مقرر کردہ ہے۔ وُہ کسی دوسرے طریقے کو پسند نہیں کرتا۔ وُہ اسے اتباعِ سلف صالح سمجھتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اخوان کی جماعت میں عزتِ نفس اور احساسِ ذمہ داری پیدا ہو۔ اگر وُہ خوشامد اور چاپلوسی کے عادی ہو جائیں۔ تو ذہنیت کے غلامانہ اور خیالات کے پست ہونیکا احتمال ہے۔

سلطان چاشت کے وقت ایک دوسرے ایوان میں جاتا ہے۔ اس جگہ کو مجلس کبیر کہتے ہیں۔ یہاں نجد کے بڑے بڑے شیوخ اور علماء موجود ہوتے ہیں۔ آل سعود کے متعدد افراد بھی آتے ہیں۔ عائل کے خاندان رشید اور مہنا کے خاندان عائد کے اُمرا بھی جو ابسنجد کے مفتوح اور ریاض میں زیرِ نگرانی لیکن بہت عزت و احترام سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ موجود ہوتے ہیں اس مجلس میں سلطان کی گفتگو ہر قسم کے معاملات پر ہوتی ہے۔ دین و مذہب۔ تاریخ سیاست۔ ادب شعر و سخن ہر موضوع پر خیالات آرائی ہوتی ہے۔ آزادی اور صفائی سے باتیں ہوتی ہیں۔ ہر شخص متانت اور سنجیدگی سے گفتگو کرتا ہے۔ گفتگو ٹھوس اور پُر مغز ہوتی ہے۔ ہرزہ سرائی اور بیہودہ گوئی سے سخت اجتناب ہے۔

ہمیشہ ہوا و ہوس کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ تمہیں عقل و تدبر سے کام لینا چاہیئے۔ اور تجربہ کار اور قابل لوگوں کو منتخب کرنا چاہیئے کیونکہ اگر یہ مجلس صحیح بنیادوں پر قائم ہو جائیگی۔ تو ملک اُس سے بڑے بڑے فوائد حاصل کر سکیگا۔ تم وہی لوگ منتخب کرو جنہیں مخلص اور باشندوں کے حقوق کی حفاظت کرنیوالا یقین کرتے ہو۔ یہ اسلئے کہ حکومت تو کسی نہ کسی طریق سے اپنے حقوق حاصل کر ہی لیتی ہے۔ لیکن باشندے کے حقوق تلف ہو سکتے ہیں۔ لہذا ایسے لوگوں کا انتخاب ہونا چاہیئے۔ جو تمہارے حقوق کے تحفظ کی قابلیت و جرأت رکھتے ہوں۔ یہ لوگ تمہارے وکیل اور تمہارے نمائندے ہونگے۔ والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ"

سلطان ابن سعود کی دوسری تقریر کا خلاصہ جو مجلس شوریٰ کے ارکان کے سامنے ہوئی حسب ذیل ہے

"حضرات ارکان مجلس! میں آپ کو سلام کرتا اور اس اعتماد پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں جس کا آپ کے ابنائے ملک نے آپ کو اہل سمجھا اور آپ کو اس مجلس کیلئے منتخب کیا۔ مجلس شوریٰ درحقیقت اُن بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے جن پر قانونی حکومتیں قائم ہوا کرتی ہیں۔ یہی وہ شوریٰ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے اس قول میں وارد ہے۔ "وامرہم شوریٰ بینہم" میں یہ دیکھ کر نہایت مسرور ہوں۔ کہ آپ اس مجلس میں یک ہو کر ملک کی خدمت اور حدودِ شرعیہ کے قیام و حفاظت کی کوششوں میں حکومت کا ہاتھ بٹانے آئے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے ہماری گردن پر ایک بڑی امانت رکھ دی ہے۔ ہم اس بوجھ کے اُٹھانے میں اپنے تئیں اہل فضل و حمیت کی امداد و اعانت کا محتاج پاتے ہیں یہی سبب ہے۔ کہ ہم نے شہر کے رؤساء و اکابر کو اس مجلس کیلئے دعوت دی۔ اور انہوں نے آپ کو اپنے اعتماد کا اہل سمجھکر منتخب کر لیا۔ اب ہم نے اپنی ذمہ داری اُٹھا کر آپ کے کاندھوں پر رکھ دی ہے۔ میں بصد عجز و زاری اللہ بزرگ و برتر سے دعا کرتا ہوں۔ کہ وہ آپ کو ملک اور اہل ملک کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آپ اپنے فرائض کی انجام دہی کے اثنا میں دیکھ لینگے۔ کہ حکومت اصلاحات کے جاری کرنے میں پوری طرح سنجیدہ اور مستعد ہے یقیناً آپ نے اس کا آغاز اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا ہوگا۔ ہم نے تفتیش و اصلاح کی ایک علیحدہ مجلس بنا دی ہے جس کا کام یہ ہے۔ کہ حکومت کے تمام محکموں کی جانچ کرے۔ اور ان صورتوں پر غور کرے جن سے انکی اصلاح و درستگی ہو سکتی ہے۔ یہ کمیٹی اپنے عمل کا ایک مرحلہ طے کر چکی ہے لیکن ابھی اُسے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

"عنقریب آپ کی مجلس میں بڑی بڑی تجویزیں پیش ہونگی۔ حکومت کے محکموں کے میزانیے بھی پیش ہونگے آپ اُن پر غور کرینگے۔ اور اپنے فیصلے صادر کرینگے۔ ملک کو سب سے زیادہ ضرورت پانی کی ہے۔ آپکے سامنے

جدید قسم کے کوئیں کھودنے کی تجویز آئیگی۔ اسی طرح اور بہت سے مفید کام آپ کو کرنے ہونگے۔ مثلاً جدّہ اور مکّہ کے مابین عمدہ سڑکوں کا اجرا مکّہ کی بعض سڑکوں کی توسیع ڈاک اور تار کے صیغہ کی اصلاح اس محکمے نے وہ تمام تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔ جو بین الاقوامی ڈاک خانوں کے ضمن میں شامل ہونے کے بعد اب اسے عمل میں لانی ہیں۔

"نیز تعلیم کی اشاعت کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ آپ کو اس پر غور کرنا اور تمام ملک کیلئے ایک ہی تعلیمی لائحہ (پروگرام) بنانا ہے۔ حکومت چاہتی ہے۔ تعلیم تمام ملک میں عام ہو جائے۔ کوئی قریہ بلکہ کوئی قبیلہ بھی اس سے محروم نہ رہنے پائے۔ نیز حفظان صحت حجاج کے آرام و راحت مطوفوں کی تنظیم اور اسی طرح کے تمام اہم کام آپ کے سامنے ہیں۔ اور آپ کی توجّہ کے منتظر ہیں۔ آخر میں اس مجلس کے افتتاح کا اعلان کرتا ہوں۔ اور اللہ تعالےٰ سے التجا کرتا ہوں۔ کہ ہمارے تمام کاموں کو کامیاب کرے۔ والسلام علیکم"

نوٹ:۔ واضح رہے۔ کہ مندرجہ بالا خلاصے کلکتہ کے موقر جریدہ الہلال کی مختلف اشاعتوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اصل تقریریں اس کتاب کے مؤلف کے پاس بھی موجود ہیں۔ لیکن الہلال کے لائق ادارہ سے بہتر ترجمہ و اختصار ممکن نہ تھا۔ اسلئے انہیں بہتر اور نہائت موزوں سمجھ کر درج کر دیا گیا۔

باب سی و نہم

سلطان کی سیرت

سلطان ابن سعود نہائت طویل القامت اور قوی الجثہ ہے۔ قد ٹھیک چھ فٹ چار انچ ہے ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں قد و قامت کیوجہ سے نمایاں نظر آتا ہے جسم سڈول اور بھرا ہؤا ہے۔ بازو لمبے اور ہاتھ بڑے بڑے ہیں۔ رنگ گندمی ہے۔ ناک لمبا اور بڑا سا ہے پیشانی کشادہ اور باہر کو ابھری ہوئی۔ رخسار بھرے ہوئے ہیں بہیئت مجموعی نقش و نگار بہت نمایاں ہیں۔ ایک آنکھ میں موتیا بند کی شکائت ہو گئی تھی اسلئے اکثر اوقات عینک استعمال کرتا ہے۔ آنکھیں چمکیلی ہیں۔ دانت اُجلے اور مضبوط ہیں۔ ٹھوڈی بڑی بھری

ہوئی اور استقلالِ طبیعت اور استحکامِ ارادہ کا ثبوت دیتی ہے۔

اعضاء طاقتور اور جسم بے حد کسرتی ہے۔ سلطان بیحد محنت و مشقت کا عادی ہے اور ضرورت کے وقت آرام کا نام تک نہیں لیتا۔ کیونکہ ابتدائی زندگی جدوجہد اور کشمکش میں گذری ہے۔ اسلئے اُسے تعیّش اور تنعّم کا کبھی خیال بھی نہیں گذرا۔ کئی کئی دن متواتر اُونٹ اور گھوڑے کی سواری کر لیتا ہے۔ بسا اوقات ہفتہ بھر کیلئے سونے کا وقت نہیں ملا۔ اُونٹ کی پیٹھ پر ہی اُونگھ سی آگئی ہے۔ کمخوابی اور بے آرامی سے اسکے قوائے ذہنی اور عقلی پر اثر نہیں پڑتا۔ سواری میں اس قدر سرعت اور تیزی سے کام لیتا ہے کہ مختلف مہموں میں بہت کم لوگ اس کا پورا ساتھ دے سکے ہیں۔

سلطان کی شکل و شباہت کو دیکھکر خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنے اندر بے پناہ قویٰ رکھتا ہے۔ طاقت و سطوت اسکے چہرے سے صاف نمایاں ہوتی ہے۔ غیر معمولی ذہانت۔ قوتِ ارادی۔ عزم و حزم۔ خوش خُلقی۔ تدبّر یہ وہ اوصاف ہیں۔ جو سلطان کی صُورت دیکھتے ہی آدمی محسوس کر لیتا ہے۔ اسکے انداز میں شاہانہ وقار اور تمکنت پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فیّاضِ مطلق نے اسے حکومت کیلئے ہی پیدا کیا ہے۔ طبیعت میں بیحد استقلال اور فلسفیانہ اضطراب رکھتا ہے۔ نچلا بیٹھ نہیں سکتا۔ کچھ نہ کچھ کام ضرور ہونا چاہئیے۔

سلطان وُہی لباس پہنتا ہے جسے نجد کے عام شرفا استعمال کرتے ہیں۔ قصابہ جس پر بالعموم گھوڑے کے بال اور گاہے ماہے زری کی تاریں ہوتی ہیں۔ زیبِ سر کرتا ہے۔ عربی عبا اور جُبّہ عام لباس ہے۔ بعض اوقات بڑھیا قیمت کی عبا بھی زیبِ تن کرتا ہے۔ سادہ وضع کی چھڑی بالعموم ہاتھ میں رہتی ہے۔ اسلحہ میں سے شمشیر اور پستول رکھنے کا خاص شوق ہے۔

سلطان سکون اور وقار کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتا ہے۔ گفتگو کی سطح عام نجدیوں سے بلند تر ہوتی ہے۔ زبان نہایت شستہ اور فقرے چُچے تُلے ہوتے ہیں۔ کوئی لفظ بغیر سوچے سمجھے زبان سے نہیں نکلتا۔ وہ اپنے دلائل و براہین کو واضح اور اطمینان بخش طریقہ میں بیان کرتا ہے۔ دورانِ گفتگو میں عرب کی عام عادت کے برخلاف وہ تقسیم امور یعنی اوّل و دوم سوم کے لحاظ سے نمبر شماری کرنے کا عادی ہے۔ سلطان کی آواز بلند اور پُر شکوہ ہے۔ دورانِ گفتگو میں جب جوش میں آجائے۔ تو بہت تیز گفتگو کرنے لگتا ہے اس حالت میں اکثر بدویانہ اور نجد کے مقامی محاورات استعمال کر جاتا ہے۔ آپکے لب و لہجہ اور حرکات و سکنات سے حکومت کا اظہار ہوتا ہے۔ یاوہ گوئی اور بیہودہ سرائی سے ہمیشہ اجتناب کرتا ہے۔ نہ خود کسی کی چاپلوسی

کرتا ہے۔ نہ خوشامدانہ گفتگو سُن سکتا ہے۔ لاف زنی سے سخت اجتناب ہے اگر کبھی اپنے معرکوں کا ذکر کیا بھی ہے تو محض اظہارِ شکرانِ نعمت کے طور پر کیا ہے گفتگو کے دوران میں انگلی سے یا عرب کی عام عادت کے مطابق چھڑی سے اشارہ کرنے کی بہت عادت ہے۔ اس انداز سے گفتگو زیادہ مؤثر اور یقینی ہو جاتی ہے۔

اور ممالک کی طرح عرب میں تاج و تخت کا دستور نہیں چنانچہ ابن سعود نے نہ کبھی تاج پہنا ہے نہ ہی تخت تیار کروایا ہے۔ اسکی معاشرت پادشاہت کے باوجود نہایت سادہ اور خالص عربی وضع کی ہے۔ خورد و نوش اور تمدن و معاشرت میں عام نجدی شرفاء سے سر مو فرق نہیں۔ یہانتک کہ ریاض کے شاہی محلات بھی قدیم عربی قصر کے نمونے کے ہیں۔ چند ضرورت کی چیزیں جدید وضع کی خرید لی گئی ہیں لیکن اصولِ معاشرت میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا۔ نشست و برخاست میں بھی عرب کی سادگی اور اسلام کی مساوات کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے سلطان ابن سعود کی نشست کسی طمطراق سے نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی کسی خصوصیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ بسا اوقات سلطان بلا تکلف فرشِ زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔ حکومت سعودیہ میں آداب اور کورنش کے غیر اسلامی رسم موجود نہیں۔ اسلامی اُصول کے مطابق ہر شخص سلطان کو السلام علیکم کہتا ہے۔ اور سلطان لازمی طور پر وعلیکم السلام کا جواب دیتا ہے۔ اراکین سلطنت اور عوام ابن سعود کو یا عبد العزیز کے سادہ نام سے مخاطب کرتے ہیں شفیق مصری اور دیگر سیاحین کا بیان ہے۔ کہ خطاب کا یہ طریق خود سلطان کا انتخاب ہے۔ وہ اس کے سوا اور کوئی طریقہ پسند نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ کوئی با اختیار فرمانروا نہیں چاہتا کہ اس قدر بے تکلفی سے مخاطب کیا جائے۔ لیکن حکومت سعودیہ میں آزادئ تکلم اور سادہ روی و صاف گوئی کی یہ تعلیم ہے۔ کہ سلطان خود اس کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے جو سادگی سلطان ابن سعود کے لباس اور معاشرت کے بارے میں ہے۔ وہ دیگر عادات و اطوار میں بھی قائم ہے۔

ابن سعود میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے۔ کہ بعض اوقات اسے بہت غصہ آتا ہے۔ اور غیظ و غضب میں بالکل مغلوب ہو جاتا ہے۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ جس قدر جلد غصہ بڑھتا ہے۔ اتنا ہی جلد اُتر جاتا ہے اور طبیعت ویسی ہی صاف اور کشادہ ہو جاتی ہے خشمناک حالت میں بعض اوقات سخت احکام جاری ہو جاتے ہیں۔ وہ فوراً واپس لے لئے جاتے ہیں۔ ابن سعود کو اپنے اعزہ و اقارب سے بہت محبت ہے۔ اپنے متوفی عزیزوں کی قبروں پر ہر ہفتہ جمعہ کے دن حاضر ہوتا ہے اپنے والد ماجد کا اس قدر احترام ملحوظِ خاطر تھا۔ کہ کوئی اہم اور غور طلب مسئلہ اُن سے استصواب رائے کئے بغیر فیصل نہیں ہوتا تھا۔ طویل عرصہ ہو چکا ہے۔ کہ امام عبد الرحمٰن اپنے ہونہار بیٹے کے

حق میں تخت و تاج کے حقوق سے دست بردار ہو گئے تھے۔ شرعاً اور قانوناً ابن سعود نجد کا خود مختار امیر ہے۔ اور ریاض کی پہلی فتح سے لیکر جملہ فتوحات اُسی کے ہاتھ پر ہوئی ہیں۔ لیکن ہمیشہ ریاض کے محل شاہی میں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ عبدالرحمٰن امیر ہیں اور ابن سعود اُن کا معمولی تابع فرمان جب وہ ریاض میں موجود ہوتا۔ تو اپنے والد ماجد کی زیارت کیلئے ہر روز باقاعدہ حاضر ہوتا تھا۔

ابن سعود کی والدہ عرصہ ہوا فوت ہو چکی ہیں۔ متعدد مغربی سیاحوں نے اس امر کی تصدیق کی ہے۔ کہ جب بھی وُہ وہاں موجود ہو۔ ہر جمعرات کے روز اپنی والدہ کی قبر پر حاضر ہوتا ہے۔ اور دُعائے مغفرت کرتا ہے۔ جہانتک ممکن ہے۔ اس مداومت میں کبھی ناغہ نہیں ہوا۔

شہزادی نورہ ابن سعود کی حقیقی ہمشیرہ ہے۔ اور بڑی لائق اور بیدار مغز شہزادی ہے۔ امورِ مملکت میں بہت صائب رائے رکھتی ہے۔ اپنے بھائی کو مفید اور کارآمد مشوروں سے مستفید کرتی رہتی ہے۔ ابن سعود کو اس سے بیحد محبت ہے۔ جملہ اعیانِ دولت اور ارکانِ سلطنت اس کا بہت احترام کرتے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ابن سعود نے متعدد معرکوں میں اس شہزادی کے نامِ نامی کو نعرہ جنگ کے طور پر استعمال کیا ہے۔

سلطان کو اپنے بیٹوں سے بھی بیحد محبت ہے۔ وُہ اُنکی لیاقت اور کامیابی سے بہت خوش ہوتا ہے لیکن مناسب موقعوں پر سرزنش اور تنبیہ سے بھی کبھی نہیں چوکتا۔ جب ولیعہدِ سلطنت شہزادہ سعود عسیر کے بعض علاقوں کو فتح کرنیکے بعد دارالسلطنت کو واپس آیا۔ تو ابن سعود نے شہر کے باہر اس کا استقبال کیا۔ اور اس کمسن فاتح کو بغلگیر ہو کر ملا۔ وُہ اُس کی شادمانی اور کامرانی سے بہت محظوظ ہُوا تھا۔ لیکن بیٹوں کی محبت نے کبھی اُسے نرمی اور چشم پوشی پر آمادہ نہیں کیا۔ وُہ اپنے بیٹوں کو مشکل اور کٹھن کام دیتا ہے۔ مشقت اور صعوبت کی زندگی کا عادی بناتا ہے۔ آرام کوشی اور تن آسانی سے دُور رکھتا ہے۔ سادہ اور خالی از تکلف زندگی کی رغبت دلاتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہُوا۔ کہ کوئی غلطی سرزد ہوئی ہو۔ اور اس نے تنبیہ نہ کی ہو۔

سلطان کی عادت ہے کہ میدانِ جنگ میں پوری شدت اور تندہی سے جنگ کرتا ہے لیکن مفتوحین کے ساتھ بہت آشتی اور نرمی کا سلوک کرتا ہے۔ اور جبتک وُہ خودسری یا بغاوت نہ کریں۔ رحمدلانہ سلوک سے متمتع ہوتے رہتے ہیں چنانچہ مثال کے طور پر یہ واقعہ ہے کہ حائل کے فرمانروا خاندان آلِ رشید کے بیشتر افراد ریاض کے محل شاہی میں بہت عزت کیساتھ فروکش ہیں۔ اور خورد و نوش۔ لباس۔ سواری۔ ضروریات۔ اخراجات۔ ملازمین اور سکونت کے لحاظ سے میں بالکل اپلخانہ سا سلوک پاتے ہیں۔ اس طرح پر متعدد عرب امراء ہیں۔ کہ وقتاً فوقتاً ابن سعود سے شکست کھا کر اس وقت

ریاض میں بہت آرام اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ عمدہ سپاہی ہونیکے باوجود ابن سعود درشت خو اور زشت رو نہیں جس قبیلہ اور آبادی کو اس نے فتح کیا ہے اس نے باشندوں کو عام امن و امان دیا ہے۔ اور جبتک وہ پرامن اور صلح جو رہے ہیں۔ ان کی جان اور مال کا پورا تحفظ کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ طائف وغیرہ مقامات پر اسکے بعض اخوان نے مظالم برپا کئے۔ مقدس مزاروں اور قبوں کو ڈھا دیا۔ اور نہتی اور امن پسند آبادی پر وحشیانہ سلوک روا رکھا۔ لیکن یہ صرف ایسی صورت میں ہوا جبکہ ابن سعود خود موقعہ پر موجود نہ تھا۔ اور اسکے غیر مہذب اور نیم وحشی اخوان مذہبی تعصب اور تنگدلی کیوجہ سے مشتعل تھے لیکن جونہی کہ وہ خود موقع پر پہنچا۔ امن و امان کا دور دورہ ہوگیا۔ اسکے اس رویہ سے بعض اوقات اسکے بہترین ارکان ناراض ہوگئے اس قسم کے واقعات کا جستہ جستہ بیان ہو چکا ہے۔

سعودی سلطنت میں کسی شخص کو محض مذہبی اختلافات کی بنا پر ستایا نہیں گیا۔ متعصب اخوان نے شیخ سنوسی اور بعض دیگر اصحاب کو تکلیف دینا چاہا تھا لیکن ابن سعود نے بروقت روک تھام کردی۔ ابن سعود ذاتی طور پر مذہبی رواداری کا حامی ہے۔ اور یہی سپرٹ اپنی رعیت میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ صوبہ الحصا میں اہل تشیع کی کثیر تعداد آباد ہے۔ اور ان کو بعض اہم شرائط کے ماتحت اپنے مذہبی مراسم اور شعائر ادا کرنیکی کامل آزادی حاصل ہے۔ یہ لوگ سعودی حکومت کے ماتحت پورے اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کوئی مذہبی روک ٹوک نہیں۔ حجاز میں حنفیوں، مالکیوں اور شافعیوں کی معقول تعداد موجود ہے سلطان ابن سعود نے آجتک ان پر کوئی مذہبی پابندی عائد نہیں کی۔ نہ ہی انہیں بالکل اپنے ہمخیال بنا لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ یہ رواداری اور فراخ حوصلگی سلطان کی ذات سے مخصوص ہے۔ عام نجدیوں میں ابھی تک وسیع الخیالی پیدا نہیں ہوئی

یہ عجیب بات ہے کہ شکست و ناکامی سے سلطان کی طبیعت کبھی متاثر نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسکے بے نظیر اور عدیم المثال اوصاف اپنی انتہائی صورت میں صرف اس وقت ظہور پذیر ہوتے ہیں جب اسے کوئی زک یا ہزیمت اٹھانی پڑی ہے۔ اکثر طبیعتیں افکار و آلام کے ہجوم اور ناکامی و نامرادی کی کثرت سے بجھ جاتی ہیں لیکن اسکی طبیعت میں استقلال کا وہ جوہر ہے جو کہ صرف دنیا کے بڑے بڑے مشاہیر میں پایا جاتا ہے اور انکی عظمت اور سطوت کی دلیل ہے۔

سلطان ابن سعود بے حد اولوالعزم ہے۔ ہفتوں بلکہ برسوں تک وہ ایک چیز پر غور و فکر کرتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے ذہن میں حتمی فیصلہ کر لیتا ہے تو کوئی بات اسکے آہنی ارادہ کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ نہ وہ دشمن کی طاقت

وسطوت کی پرواہ کرتا ہے۔ نہ ہی اُس کے وسائل و ذرائع کو خاطر میں لاتا ہے۔ نہ وہ عناصر طبعی کی درشتی سے مرعوب ہوتا ہے
اور نہ ہی حالات و کوائف کی نامساعدت سے متاثر ہوتا ہے۔ اس بات کے سینکڑوں ثبوت اسکے سوانح حیات میں
موجود ہیں بعض اپنے اپنے مقام پر بیان ہو چکے ہیں۔ کویت اور بحرین کی عزلت گزینی میں جبکہ وہ بے خانماں مسافر
کی حیثیت سے زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ اُس میں وُہی وقار اور جوش موجود تھا۔ جو آج پادشاہِ نجد و حجاز کی حیثیت
میں ہے۔ ابن سعود محض نظریئے کا دلدادہ نہیں۔ نہ ہی کبھی اُس نے شیخ چلی کے خواب دیکھے ہیں۔ وہ عمل اور محض
عمل کا قائل اور بندہ ہے۔ نہ کبھی اُس نے بلند آہنگ دعوے کئے ہیں۔ اور نہ ہی کسی ایسی چیز کی خواہش کی ہے
جس کے حاصل کرنے کی اس میں قدرت نہ ہو۔ خلافت اسلامیہ کا خوش آئند خواب اسکو راہِ عمل سے ہٹا نہیں سکا اور
نہ ہی ممالک عرب کی پادشاہت کے خوشنما خیال نے اسکو بہکایا ہے۔ سلطان ابن سعود میں ایک بڑی صلاحیت
یہ ہے کہ حالات و کوائف کے ساتھ نامعلوم اور غیر محسوس طور پر مناسبت کر لی تھی۔ حالانکہ وہابیوں کی روایات اور
نجد کی مصلحت اسکے خلاف تھی لیکن ابن سعود نے دیکھ لیا تھا۔ کہ ترکی حکومت کے مقابلے کی اُسمیں طاقت
نہیں ہے پھر جنگِ عظیم کے دوران میں اُس نے انگریزوں سے وظیفہ لینا قبول کیا۔ اور متواتر کئی برس تک لیتا
رہا۔ حالانکہ یہ اُسکی حمیت اور آزادروی کے خلاف تھا۔ اسکی طبیعت کی اُفتاد یہ ہے کہ وہ کسی کی ماتحتی گوارا
نہیں کر سکتا۔ نہ کسی غیر کو سلطنت کے معاملات میں مداخلت کرنے دینا چاہتا ہے لیکن اُس وقت ضرورت کا
اقتضا یہ تھا کہ وہ روپیہ اور اسلحہ حاصل کر کے اپنی حیثیت کو بڑھاتا۔ اور حاسد ہمسائیوں کی دست برد سے بچتا۔
اُس نے ایسے معاہدے کر لئے تھے جسمیں اسکی حیثیت مبہم اور عام عرب رئیسوں کی سی قرار دی گئی تھی۔ لیکن
جونہی کہ حالات نے مساعدت کی۔ اُس نے اپنی آزادانہ اور خصوصی حیثیت کا دعوےٰ کیا۔ اور غیر حکومتوں نے اُسے
تسلیم کیا۔

طبعی طور پر ابن سعود کی طبیعت میں اضطراب ہے۔ اسکی حرکات و سکنات سے بے چینی کا اظہار ہوتا ہے
لیکن مناسب وقت اور موافق حالات کے انتظار میں وہ بیحد صابر ہے چنانچہ واقعہ ہے کہ حجاز کی شریفی سلطنت اس
کی آنکھوں کے سامنے کمزور و تباہ ہو رہی تھی۔ وہابی حجاز کی فتح کیلئے بہت بیقرار تھے اور کئی برس تک حملہ کرنے
کیلئے مصر رہے لیکن تاوقتیکہ اُس نے کامل اطمینان نہیں کر لیا۔ حجاز پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ یعنی یہی صورت
حائل کی سلطنت کے بارے میں ہوئی۔ یہ ناہموار ریاست اپنے ضعف و اضمحلال میں تو وہ بچ کر رہی تھی۔ نجد کے ساتھ
اسکی دیرینہ مخاصمت تھی لیکن تاوقتیکہ فتح کا پورا یقین نہیں ہو گیا۔ ابن سعود نے اس پر حملہ نہیں کیا۔

سلطان میں زبردست قوتِ فیصلہ موجود ہے جب حالات و کوائف اچھی طرح سے معلوم ہو جائیں تو فوراً حتمی فیصلہ
کر لیتا ہے۔ فیصلہ کرنے میں اُسے کبھی تکلیف اُٹھانی نہیں پڑی، دماغ خود بخود صحیح فیصلہ کر لیتا ہے۔ اُسے ذہنی اختلال
اور پس و پیش کی شکایت جو کمزور طبیعتوں کا خاصہ ہے کبھی نہیں ہوئی اور نہ ہی فیصلہ کر چکنے کے بعد اُس نے کبھی
رائے کو تبدیل کیا ہے وہ صحیح معنوں میں اولوالعزم انسان ہے۔ اگر ایک دفعہ ارادہ کر لے تو کبھی ٹلنے کا نام نہیں لیتا
البتہ قوتِ فیصلہ کے استعمال میں وہ کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا۔ بلکہ عقل و ذہن سے کام لیتا ہے۔

دنیا کے بہترین سپاہی بہترین مدبر نہیں ہوتے لیکن ابن سعود بیک وقت اپنے ملک کا شجاع ترین سپاہی
شہرۂ آفاق جرنیل اور چالاک ترین مدبر ہے۔ ہر جنگ میں وہ خود عام سپاہیوں کی طرح لڑتا رہا ہے سینکڑوں دشمنوں
کو اُس نے اپنے ہاتھ سے تہہ تیغ کیا ہے۔ اسکے جسم پر متعدد گولیوں کے نشان ہیں۔ ہر میدان میں وہ اپنی سپاہ سے
پیش پیش رہا ہے سپاہ کے قائدِ اعظم کی حیثیت سے اسمیں خصوصیت یہ ہے۔ کہ ہر نجدی کو اسکی قابلیت پر پورا بھروسہ
اور اعتماد ہے۔ وہ ہر سپاہی سے ذاتی توجہ اور ملائمت سے پیش آتا ہے۔ ہر کام میں برابر کا حصہ لیتا ہے۔ ذاتی برتری
اور تفوق قائم کرنے کی کوشش نہیں کرتا فوج کی ترتیب جنگ کے موقعہ کا انتخاب عسکری ضروریات حرب و خدع
کے ذرائع اور مروجہ جنگ کے جملہ فنون میں مہارت تامہ رکھتا ہے۔ عارضی زک سے کبھی پست دل اور ہراساں
نہیں ہوتا سپاہیوں کے دل بڑھانے کا خداداد ملکہ رکھتا ہے جس جنگ میں وہ خود شریک ہو سپاہیوں کو فتح
کا پورا یقین ہوتا ہے یقیناً عمدہ جرنیل کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔

سپاہیانہ جسارت اور مدبرانہ حزم دو متضاد چیزیں ہیں۔ فیاضِ مطلق نے بہت کم انسانوں کو دونوں کا
برابر کا حصہ عطا کیا ہے لیکن ابن سعود میں دونوں وصف بدرجۂ کمال موجود ہیں۔ اس کے حزم و احتیاط کی یہ کیفیت
ہے کہ بعض مغربی سیاحوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ سیاسیات میں اس سے آج تک کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی
اگر اس بیان کو مبالغہ پر مبنی بھی سمجھا جائے۔ تو اس حقیقت میں انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ سیاست و تدبر کا فوق الفطرت مادہ
مبداءِ فیاض نے اُسے ودیعت کیا ہے۔ ناظرین کو معلوم ہے کہ اُسکی ولادت اندرونِ عرب کے ایسے حصہ میں وقوع
پذیر ہوئی۔ جو تہذیب اور سیاستِ حاضرہ سے بہت دور واقع ہے اُس نے محض عامیانہ اور بوسیدہ تعلیم پائی بچپن
اور عنفوانِ شباب کویت اور بحرین کے پست ماحول میں بسر کیا لیکن اسکی زندگی میں بارہا ایسے مواقع پیش ہوئے
کہ دُنیا کے مختلف ممالک اور اقوام کے بہترین افراد سے معاملہ کرنا پڑا۔ اور اُس نے اس خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے
نپٹایا کہ لوگ دنگ رہ گئے مغربی ڈپلومیسی کا تجربہ نہیں تھا لیکن فطری جوہر سے سیاسی گفت و شنید میں مغربی

طاقتوں کے بڑے بڑے نامور مدبر عاجز آ گئے۔ اور ابن سعود کی خواہش اور مصلحت کے بغیر اُسے مجبور نہ کر سکے مغربی سیاست دانوں نے کھلے الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ اس پر سیاسیات میں بازی لے جانا ناممکن ہے۔

اندرونِ ملک کے قبائل کے انتظام میں اُسے خاص ملکہ حاصل ہے۔ وہ مختلف قبائل کے حالات و کوائف اور اُن کے باہمی تعلقات سے بخوبی واقف ہے۔ اُن کے فطری رجحانات اُسے معلوم ہیں۔ اُن کی کمزوریوں اور کاوشوں سے آگاہ ہے۔ وہ اُن کے ساتھ دریا دلی اور فراخ حوصلگی سے سلوک کرنا جانتا ہے۔ لیکن ضرورت کے وقت تدبر و سیاست کا تلخ سبق بھی دے سکتا ہے بعض قبائل سے اُس نے ایسا پسندیدہ سلوک کیا ہے۔ کہ وہ ہمیشہ کیلئے اُسکے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ اور ہمیشہ اسکے ممد و معاون رہے ہیں بعض جماعتوں کے ساتھ اُس نے اس قدر سختی کی ہے۔ کہ ملک بھر کو عبرت ہوئی ہے۔ وہ وقت کے اقتضا اور ضرورت کی مصلحت کو بخوبی سمجھتا ہے۔ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ کی تخویف اور تہدید سے رام کر لیتا ہے۔ ہر شیخ کے ساتھ ایسے لوگ متعین ہیں جو حکومت کو اسکی حرکات و سکنات سے مطلع کرتے رہتے ہیں۔ ملک بھر میں کوئی واقعہ رونما نہیں ہوتا۔ کہ ابن سعود کو اسکی اطلاع نہ ہو۔ اپنی اپنی جگہ ہر شخص اور ہر قبیلہ سلطان کی سیاست و سخت گیری سے خائف ہے۔ لوگ سلطان کے قہر و جلال کی قوتوں کا تجربہ اُٹھا چکے ہیں۔ دوبارہ اُسے مشتعل نہیں کرنا چاہتے۔

مشرقی ممالک میں فرمانروا کے اقتدار کیلئے ضروری ہے۔ کہ اُسکے پاس زر و مال کی فراوانی ہو۔ ابن سعود بھی اس حقیقت کو جانتا ہے لیکن وہ طبعاً فیاض اور دریا دل واقعہ ہوا ہے۔ دولت جمع نہیں کرتا۔ مالِ غنیمت اور سالانہ خراج کی گرانقدر رقمیں اپنی رعیت کے ضرورتمند افراد میں بلا امتیاز دریا دلی سے خرچ کر دیتا ہے کبھی کوئی معقول رقم پس انداز نہیں کیگئی سلطان کی طرف سے مساکین اور فقرا کو برابر مدد پہنچتی ہے۔ علماء و مشائخ کے طبقات بھی انعام و اکرام سلطانی سے محروم نہیں رہتے۔ وقتاً فوقتاً ضرورت کی تمام چیزیں نقدی ملبوسات سواری وغیرہ انہیں عطا ہوتی ہیں۔ ابن سعود کو تالیفِ قلوب کا خاص خیال رہتا ہے۔ بعض لوگوں کو بڑی بڑی زمینیں صرف اسلئے دیگئی ہیں۔ کہ وہ سلطنتِ سعودیہ کے وفادار اور بہی خواہ رہیں۔ اور دولت کے لالچ میں نمکحرامی اور غداری نہ کرنے پائیں۔ ظاہر ہے۔ کہ طبعی طور پر جود و سخا کے اس مظاہرے میں نجدیوں کا حق فائق سمجھا جاتا ہے۔ لیکن حجازی اور دیگر صوبجات کے باشندے بھی بخوبی متمتع ہوتے ہیں۔ خوراک ملبوسات اور اسلحہ وغیرہ ہر قسم کی اجناس کے وافر انبار اور ذخائر موجود رہتے ہیں۔

ہر روز ملک کے مختلف حصص سے وفود آتے رہتے ہیں اور خود سلطان کے ہاتھ سے حسب استحقاق و

لیاقت انعام واکرام پاتے ہیں۔ کسی کو خورد ونوش کا سامان دیا جاتا ہے۔ کسی کو سواری عطا ہوتی ہے کسی کو خلعتِ فاخرہ سے سرفراز کیا جاتا ہے بعض لوگوں کو محض اسلحہ مرحمت کرنا ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح پر لاکھوں روپے کی اجناس ہر سال تقسیم ہوتی ہیں۔ اور یہ سلسلہ سالہا سال سے قائم ہے۔ استحقاق ولیاقت کا اندازہ خود ابن سعود کرتا ہے۔ نجدیوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ لوگ جوق در جوق آتے ہیں۔ اور سلطان کی نوازشات سے مستفیض ہوتی ہیں۔ اس طرح پر نجد کی سلطنت میں انعام واکرام کیلئے ایک خاص محکمہ قائم ہے۔ اور اپنے فرائض ووظائف کے اعتبار سے بہت اہم ہے سلطان کے احکام کے مطابق ہر روز فہرستیں تیار ہوتی ہیں۔ اور مشیر مال کمال دیانت سے انعامات حقداروں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ امین ریحانی اور سینٹ جان فلبی نے اپنی کتابوں میں اس محکمے کی کارکردگی کے متعلق اہم تفاصیل شائع کی ہیں۔

سلطان جہاں کہیں بھی ہو۔ اسکے محلات میں ایک وقت کے کھانے کیلئے عام دعوت ہوتی ہے۔ عام طور پر پلاؤ اور گوشت تیار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی سلطان بھی اس دعوت میں شریک ہوتا ہے۔ اور اپنی رعیت کے غریب ترین افراد کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھکر طعام نوش کرتا ہے۔ اخوت اور مساواتِ اسلامی کی یہ بہترین مثال ہے۔ یہ سلسلہ ریاض کے غریب باشندوں کیلئے ازبس غنیمت ہے۔ گرد ونواح کے لوگ بھی آجاتے ہیں۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ ہر روز ہزاروں آدمی جمع ہوتے ہیں۔ مہمانوں کی نشست وبرخاست میں کوئی تکلف نہیں ٹھیک عرب کی سادگی نظر آتی ہے۔ بیاہ شادی کی تقریبوں میں دعوتِ عام کا سلسلہ بہت وسیع پیمانہ پر ہوتا ہے۔ دور دور کے قبائل سے لوگ ہزاروں کی تعداد میں آتے ہیں۔ سلطان کی بیٹی کی شادی کی تقریبِ سعید پر پانچ ہزار بھیڑیں ذبح کی گئی تھیں۔

سلطان ابن سعود میں مہمان نوازی کی عادت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ناظرین کو بخوبی معلوم ہے کہ عرب کے عام باشندے بہت مہمان نواز واقعہ ہوئے ہیں صحرا کی معاشرت وتمدن میں مہمان نوازی کو خاص دخل ہے۔ یہ خوبی شرافت اور عظمت کی دلیل ہے جس طرح پر سلطان ابن سعود اور اوصاف میں اپنے ہمعصر اور ہم چشم عربوں میں بہت بڑھا ہوا ہے۔ اسی طرح پر وہ مہمان نوازی میں سب سے پیش پیش ہے مختلف مشرقی اور مغربی سیاح تو اس بارے میں اتنے رطب اللسان ہیں۔ کہ صفحے کے صفحے اپنی کتاب میں لکھ گئے ہیں۔ مہمانوں کیلئے جملہ اخراجات حکومت کیطرف سے ہوتے ہیں۔ اور ان کیلئے بہترین اشیاء مہیا کی جاتی ہیں۔ اور انکی دلداری اور دلدہی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں ہوتا مہمان نوازی کے احسانات میں مغربی حکومتوں کے نمائندوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ مہمان عالی

مرتبہ اور مشہور عالم ہو یا معمولی سیاح سب کے ساتھ بہترین سلوک کیا جاتا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ انہیں مسافت اور غریب الوطنی کیوجہ سے کوئی تکلیف نہ ہو۔ اور جب وُہ اپنے وطن کو لوٹیں تو سعودی حکومت کے خوشگوار تاثرات لیکر جائیں۔ امین ریحانی ایک شامی عیسائی شفیق مصری اخبار نویس۔ سردار اقبال علی شاہ ہندوستانی افغان اور لیفٹیننٹ جان فلبی اور کیپٹن آرم سٹرونگ وغیرہ مختلف سیاحوں نے ابن سعود کے اس وصف کا بیان یکساں مؤثر انداز میں کیا ہے۔

ناظرین کو معلوم ہے۔ کہ باوجودیکہ ابن سعود مطلق العنان فرمانروا نہیں۔ اور حکومت سعودیہ اہل الرائے کے باہمی مشوروں پر مبنی ہے لیکن پھر بھی عرب میں عام تعلیم کی پستی کیوجہ سے رائے عامہ مفقود ہے۔ اور معاملات ملکی اور قضایا کے بارے میں علماء دین کے فتاویٰ پر عملدرآمد ہوتا ہے۔ ابن سعود بھی بات بات پر انہیں لوگوں کے مشوروں پر حصر کرتا ہے۔ اور حتی المقدور ان کے آرا کو مسترد نہیں کرتا لیکن کیونکہ یہ لوگ سیاسیات اور ضروریات زمانہ سے قطعاً بے بہرہ ہیں۔ اسلئے بعض معاملات پر یہ لوگ صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ ایسے معاملات میں ابن سعود خود اجتہاد کرتا ہے۔ اور اپنی رائے سے فیصلہ کر دیتا ہے۔ علماء دین کی جماعت کو اُن کے مذہبی تقدس و عظمت اور عام اقتدار کے باوجود خالص سیاسی امور میں دخل انداز نہیں ہونے دیتا۔ بین الاقوامی تعلقات غیر اسلامی اور غیر وہابی عناصر مغربی حکومتوں سے اختلاط، سائنس کی جدید ایجادات و اختراعات اور حجاز کے بعض محکمہ جات کے مغربی انداز پر تاسیس و قیام کے بارے میں اگر ان لوگوں کی رائے پر عملدرآمد کیا جاتا تو ظاہر ہے کہ مختلف مشکلات اور گوناگوں تکالیف کا سامنا ہوتا لیکن ابن سعود میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے۔ کہ جہاں وُہ ان حضرات کا کلی اعتماد حاصل کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا۔ ان کو سیاسی اور خالص دنیاوی امور میں مداخلت بھی کرنے نہیں دیتا علمائے دین کے تلون اور وقتی اور ہنگامی ضروریات کی اس کشمکش نے مختلف اسلامی ممالک میں مختلف اوقات پر طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں لیکن ابن سعود کی عدیم النظیر فراست اور معاملہ فہمی نے اس دقت کو بخوبی رفع کر دیا ہے۔ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ پر بیک وقت ٹھیک کام کر رہی ہیں۔

مذکورہ بالا واقعہ کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے۔ کہ ابن سعود اپنی ذاتی اور معاشرتی زندگی میں پورا اتباع شریعت کرتا ہے۔ اس کا نقطۂ نگاہ اور مطمع نظر خالص اسلامی ہے۔ اسکے خیالات و افکار اور جذبات احساسات بھی اسلامی ہیں۔ دنیا پرستی زر طلبی اور مغربی تہذیب نے اُسے ملوث نہیں کیا۔ بلاشک و شبہ وُہ عرب کی آزادی اور عظمت کا سب سے بڑا علمبردار ہے لیکن قوم پرستی کے تنگ نظریہ سے وُہ کوسوں دور ہے اور ابھی تک

اسلام کی عظیم برادری کے روح پرور تخیل اور جاذبیت سے ناآشنا نہیں ہوا بعض ضروری ترمیمات کیساتھ وہ زندگی
کے ہر شعبے میں شریعتِ حقہ کا سختی سے کاربند ہے وضع قطع تراش خراش لباس اور خورد و نوش معاشرت اور تمدن کوئی
چیز ایسی نہیں جسمیں اسلامی نظریہ اور شرعی احکام ملحوظِ خاطر نہوں عبادات و معاملات میں وہ ایک باعمل فقیہہ کی مانند پورا
متقی و پرہیزگار ہے لیکن نہ ایسا تنگدل کہ شرعی اعتدال سے تجاوز کر جائے اور نہ ایسا وسیع الخیال کہ حمیتِ قومی اور غیرت
اسلامی بھی قائم نہ رہے طیب اور حلال طعام سے پرہیز نہیں اپنی منکوحہ بیویوں سے بھی خوب متفیض ہوتا ہے لیکن اسکے
باوجود دنیا پرستوں کی طرح اپنی عاقبت اور خدا پرستی سے غافل نہیں۔ آجتک سادہ عربی لباس کے علاوہ کوئی لباس زیب تن
نہیں کیا نہ ہی عربی عادات و خصائل کو کھویا ہے دنیا کے معاملات میں اعتدال اور میانہ روی اس کا اصول ہے۔ نہ وہ
اتنا حریص ہے کہ خیالی پلاؤ پکاتا رہے اور نہ ہی اتنا مسکین الطبع کہ اپنے خاندان کی عظمت اور ملک کی فلاح و بہبود کے
بارے میں کوشاں نہ ہو ظواہر شریعت میں وہ اپنی قوم اور رعیت کیلئے بہترین نمونہ ہے ہر حکم کی پابندی سب سے اول اپنی
ذات پر کرتا ہے۔ النواہی کے بارے میں اس سے بڑھکر سخت گیر کوئی نہیں۔ امر بالمعروف کے بارے میں بیحد کوشاں ہے
اسکی بہترین مساعی مسلمانوں کے اخلاق کی تہذیب اصلاح اور احکامِ شریعت کی ترویج و نفاذ کیلئے وقف ہیں قرآن
خوانی اور احادیث جنابِ رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام سننا اس کا محبوب ترین مشغلہ ہے نجد کے علماء سلطان اور اس
کے خاندان کے اعمال کی نگرانی اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں۔ اور خفیف سے خفیف فروگذاشت پر بھی اعتراض کرنے سے نہیں چوکتے
ناظرین کو معلوم ہے کہ نجد کے علماء دین سخت متعصب اور تنگدل ہوتے ہیں اور فروعی باتوں پر بیحد زور دیتے ہیں۔ اور
ادنیٰ فروگذاشت بھی گوارا نہیں کر سکتے یہی حال نجد کے عوام کا ہے وہابی خشک دماغی کیوجہ سے ایک دوسرے کا
اپنے تئیں نگران سمجھتے ہیں۔ اور اکثر اوقات تنقید و تنقیص کرتے رہتے ہیں۔ انکی موشگافیاں صرف عوام تک ہی محدود نہیں
انکی آزادی اور جسارت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ خود سلطان اور اکابرین سلطنت بھی انکے طعن و تشنیع سے محفوظ نہیں
ابن سعود کو شریعت کا اس قدر احترام منظور ہے کہ علماء کے اعتراضات اور عوام کی نکتہ چینی کو بہت خندہ پیشانی سے سنتا
ہے۔ اور شریعت کے احکام مانتا ہے چاہے اعتراض کرنیوالا کتنی ہی معمولی حیثیت کا فرد کیوں نہ ہو۔ امین ریحانی کا بیان ہے
کہ اسکے سامنے عوام کی ایک جماعت نے ابن سعود کی مونچھوں کی درازی پر اعتراض کیا اور اس نے شریعت کے
پاس خاطر سے وہیں مونچھیں کتروا کر چھوٹی کرلیں۔ اس قسم کے موقعوں پر اعتراض کو برا ماننے کا کبھی اسے خیال تک
پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ وہ معترض کی نیک نیتی کا مشکور ہوتا۔ خود اسکی حوصلہ افزائی نے نجدیوں میں یہ جسارت پیدا کر
دی ہے۔ ابن سعود اسے سلفِ صالحین کا اتباع سمجھتا ہے اور یہ اتباع اسکے فرائضِ دینی میں شامل ہے

بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ اسوقت دُنیا بھر کے قابلِ ذکر آدمیوں میں سے ابن سعود اتباعِ شریعتِ اسلامیہ میں سب سے بڑھا ہُوا ہے اور یقیناً یہی چیز اسکی عظمت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

باب چہلم

مذہب اور سیاست

اس باب میں ان شبہات پر بحث کیجائیگی جو اس کتاب کے پڑھنے والوں کے دلوں میں پیدا ہو رہے ہیں مثلاً کہا جاسکتا ہے کہ کیا ابن سعود کا طرزِ عمل ایسا نہیں۔ کہ اسے عصرِ حاضر کی روش کے خلاف جہاد کہا جائے یا دوسرے لفظوں میں مادی حکومتوں کی ضد کہا جائے؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ تمام دُنیا پر بالخصوص اور عالمِ اسلام پر بالعموم لامذہبیت اور دہریت مسلط ہو رہی ہے؟ کیا یہ امرِ واقعہ نہیں کہ سیاست کو مذہب سے جُدا کرنیکی ملحدانہ کوششیں ہو رہی ہیں؟

یہ سوالات نہایت پیچیدہ ہیں اور ایک حد تک ناقابلِ عبور بھی۔ وہابی بادشاہ کے نکتہ چین عام طور پر یہ دعوے پیش کرتے ہیں کہ سلطنت وہابیہ کے علاوہ اسلامی دُنیا میں ہر جگہ خصوصاً ترقی یافتہ حصّوں میں اگر قومی حکومتیں قائم نہیں ہوئیں۔ تو قومیت نمایاں طور پر کامیاب ہوگئی ہے چنانچہ ترکی اور مصر میں مغربی طرز کی وطنیت اور قومیت پیدا ہوگئی ہے جس نے مذہب کو پسِ پشت ڈالدیا ہے۔ اسی طرح فلسطین، شام اور عراق میں بھی یہی کیفیت ہے۔ ایران اور افغانستان میں اگرچہ ایسے حالات رُونما نہیں ہوئے مگر وہاں جن اصلاحی تحریکوں کو شروع کیا گیا ہے۔ ان سے توقع ہے کہ مذہب کو معاملاتِ حکومت میں عضوِ معطل سمجھکر کاٹ دیا جائیگا۔

بلاشبہ اسلامی ممالک کا مندرجہ بالا خاکہ صحیح ہے۔ قوم کے ہادی اور رہبروں کے دل و دماغ میں مغربیت سرایت کرچکی ہے چونکہ اکابرینِ ملت قومی زندگی کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ اسلئے دلیل کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اسلام میں تبدیلیاں پیدا کیجائیں۔ اور اس سلسلے میں ترکی کو قابلِ تقلید مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ جسطرح مصطفےٰ کمال پاشا کی قیادت میں ترکوں نے ترقی کی ہے اسی طرح دیگر اسلامی ممالک بھی اسکے نقشِ قدم پر چل کر عروج حاصل کریں مگر میری دانست میں یہ خیال الحاد و زندقہ ہے۔ ترکی میں حکومت کا مذہب اسلام نہیں رہا۔ ترک لوگ مغربی

بے راہ روی کے چکر میں آ کر اسلامی تعلیمات کو یکسر بھلا رہے ہیں۔ اور اپنے آباؤ اجداد کی روایات کو فراموشی اور نسیان کے سپرد کر رہے ہیں چونکہ ترکوں کی مذہبی حالت پر بحث کرنا اس کتاب کے مقاصد میں سے نہیں اسلئے اسے ترک کیا جاتا ہے لیکن یہ امر واضح اور بیّن ہے کہ اہل عرب ترکوں کی تقلید ہرگز نہیں کرینگے۔ اکثر عربی اکابرین نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ وہ صرف اسلامی تعلیمات پر کاربند رہیں گے۔

اس امر کے یقین کیلئے بھی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ دنیا کا مستقبل دہریت ہے یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام کبھی بھی نہیں مٹ سکتا۔ اگر اسلامی ممالک میں قومی حکومتیں قائم ہو گئی ہیں۔ اور انہوں نے اسلام میں من مانی تبدیلیاں بھی کر لی ہیں۔ اگرچہ ترکی میں لامذہبیت کا دور دورہ ہے مذہبی امور کو یکسر نظر انداز کیا جاتا ہے مگر اسکے باوجود اسلام کو مٹایا نہیں جا سکتا عربوں اور ترکوں میں نسلی تفاوت بھی ہے۔ اگر ترک اپنے عقائد تبدیل کر لیں تو کر لیں مگر عربوں سے یہ توقع نہیں وہ سرزمین جہاں یکے بعد دیگرے یہودیت عیسائیت اور اسلام ظاہر ہوا اسقدر جلد لامذہب نہیں ہو سکتی واضح ہو کہ روحانیت اور مادیت کی جنگ میں انجام کار فتح اوّل الذکر ہی کو حاصل ہوا کرتی ہے سیاستدان کچھ عرصہ کیلئے اپنی دماغی قابلیت سے مادی حکومت کو قائم رکھ لینگے مگر استحکام و استقلال کیلئے غیر مادی طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ جو صرف مذہب ہی مہیا کر سکتا ہے۔ تاریخ عالم اس حقیقت کے ثبوت میں بیشمار واقعات لئے ہوئے ہے

اسلام میں ہمیشہ علماء حقانی کی ایک جماعت رہی ہے جنہیں ان باتوں کا احساس رہا ہے جنگ عظیم سے بہت پہلے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں، مصریوں اور عربوں نے مذہب کا عصر حاضرہ کی روشنی میں مطالعہ کرنیکی کوشش کی مصر اور ہندوستان کی تحریکیں خاص طور پر دلچسپ تھیں ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب مسلمانانِ ہند پر ادبار کی گھٹائیں چھا گئیں تو علمائے کرام نے انہیں حکم دیا کہ "کتاب و سنت" پر مضبوطی سے قائم رہیں۔ لیکن روشن دماغ ہندوستانیوں کیلئے محض اتنی سی بات ناکافی تھی چنانچہ سر سید احمد خاں نے علیگڑھ میں ایک مسلم یونیورسٹی کی بنیاد رکھکر مسلمانوں میں ایک نئی مفکر جماعت کی طرح ڈالی جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ اسلام کو بیرونی آلائشوں سے پاک کیا جائے۔ اس جماعت کے متبعین نے نسلی امتیازات کی مخالفت کی۔ جو اسلامی تعلیم کے منافی تھے۔ اس نئی تحریک نے ہندوستان میں کئی صورتیں اختیار کیں کبھی کہا جاتا تھا کہ تہذیب مغرب سے جو چیز اسلام کے موافق ہے اُسے اختیار کیا جائے۔ اور کبھی سرے سے اس کی مخالفت کر کے صرف تعلیم قرآن پر زور دیا جاتا تھا سیاسی حالات نے مسلمانوں کو دوسرے طریقوں پر ڈال دیا۔ بہرحال ہر جگہ مقصد یہ تھا کہ اسلام کو صحیح اور سادہ حالت میں پیش کیا جائے۔ یہ چیز اصولی طور پر سلطان ابن سعود کے خیالات سے ملتی جلتی ہے مصر میں ایک جماعت پیدا ہوئی جو ان خیالات کی شدت سے پابند تھی جن پر ابن سعود کاربند ہے۔

گذشتہ صدی کے آواخر میں جمال الدین نامی ایک مصلح افغانستان سے قاہرہ کی طرف گیا جسکی پُر مغز تقریروں نے مصریوں کے دل میں گھر کرلیا۔ پھر مفتی اعظم شیخ محمد عبدہٗ کی سرپرستی میں جامع الازہر میں ایسے عقائد سکھائے جانے لگے جو اٹھارہویں صدی میں محمد عبدالوہاب نے اپنے ان پیروؤں کو سکھائے تھے جنہیں وہابی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ ان دنوں میں وہابی بالکل گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کا شیخ محمد عبدہٗ کے ساتھ بظاہر کوئی تعلق نہ تھا۔

شیخ محمد عبدہٗ کی تعلیمات مصر میں عام نہیں ہوسکیں۔ لیکن انہیں بالکل فراموش بھی نہیں کردیا گیا۔ کیونکہ اُسکے شاگرد اب تک اسلام کے احیاء کے سلسلہ میں سرگرم مساعی ہیں۔ اگرچہ شیخ محمد عبدہٗ کے شاگردوں اور اخوان کے درمیان نمایاں فرق ہے۔ اوّل الذکر مذہبی معاملہ میں رواداری سے کام لیتے ہیں اور مؤخر الذکر سخت گیر واقع ہوئے ہیں لیکن بعض باتیں ان میں مشترک ہیں۔ اس بناء پر کہا جاسکتا ہے۔ کہ انجام کار انہیں اسلام کی آسان اور عالمگیر تعلیمات کی طرف رجوع کرنا پڑیگا۔ لہٰذا وہابیت کی نسبت تنگ نظری کا گمان کرنا بھی جائز نہیں۔

اس میں کسی کو شک نہیں ہوسکتا کہ مذہبی خیالات کے لوگ انہیں اصولوں کے کاربند ہیں۔ اور وہابیوں کو حقیر نہیں سمجھتے لیکن بعض ایسے فرقے بھی ہیں۔ جو جدید ترین طریقہ تعلیم سے متاثر ہوکر اکثر پُرانے معتقدات کا رد کرتے ہیں اور وہابیت کے مخالف ہیں چنانچہ نئی روشنی کے مسلمان جنہیں ہم نے نکتہ چین کے نام سے یاد کیا ہے اور رجعت پسند مسلمانوں میں جو کہتے ہیں کہ "کتاب و سنت" پر عمل کرو۔ بعد المشرقین ہے نا معلوم اس کا انجام کیا ہو کیونکہ ہر زمانہ نئے خیالات اور معلومات لیکر آتا ہے عجب نہیں کہ اسلام میں بھی عیسائیت کی طرح تفرقہ پڑ جائے۔

المختصر اسلام میں اس وقت تین جماعتیں ہیں۔ اوّل حکومت پرست طبقہ اس میں اکثر ترکی کے اکابر شامل ہیں۔ اور مصر، ایران، عراق اور افغانستان میں بھی ایسے لوگ بکثرت موجود ہیں۔ دوم اصلاح پسند طبقہ۔ ان کی کثرت تا حال مصر میں ہے اور انکی سرگرمیوں کا دائرہ بھی وہیں تک محدود ہے۔ سوم رجعت پسند طبقہ۔ وہابی بھی اسی میں شامل ہیں۔ پہلا طبقہ یہ چاہتا ہے کہ انکی حکومت اور قومیت مضبوط ہو۔ اگر پیغمبرِ اسلام انکی حمائت کرے تو فبہا ورنہ وہ اپنی حکومت کا استحکام چاہتے ہیں۔ دوسرا طبقہ پہلے طبقہ کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ مذہبی امور کو سیاسی امور سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ حالانکہ اسلام میں مذہب کا نام سیاست اور سیاست کا نام مذہب ہے۔ اور تیسرا طبقہ یہ چاہتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلعم کے ہر قول اور فعل کا اتباع کیا جائے اور بس۔

صاف ظاہر ہے کہ سلطان عبدالعزیز کو تیسرے طبقہ سے تعلق ہے وہ حکومت پرست یا وطن پرست طبقہ سے بیزار ہے اور اپنی حکومت کو شریعت اسلامیہ کے سانچہ میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ نجد و حجاز کے

حکمران ہونیکی حیثیت سے اسے کئی اسلامی ممالک میں دخل حاصل ہے۔ نجد و حجاز میں اسلامی عظمت و شان کو برقرار رکھنے کی سلسلہ میں جو خدمات اُس نے بہم پہنچائی ہیں۔ اس کیلئے کروڑہا مسلمان اُسکے ممنونِ احسان ہیں لیکن اسکے اپنے مخصوص ارادے بھی ہیں۔ اسے اپنی عرب سلطنت کا احساس ہے اسے یہ بھی معلوم ہے کہ عجمیوں کے علاوہ خود عربی اُسے اپنا قائدِ اعظم سمجھتے ہیں چنانچہ دیگر ممالک کے عرب اگرچہ حصولِ آزادی کیلئے مغربیت کی رَو میں بہہ رہے ہیں لیکن عربی النسل ہونیکی حیثیت سے جو قدرتی رشتہ اُنکے درمیان موجود ہے۔ وہ واضح اور عیاں ہے۔ اصلاح پسند طبقہ کو بھی سلطان ابن سعود آڑے ہاتھوں لیتا ہے۔ اور اسلام میں جو تصرف وہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُنکی مخالفت کرتا ہے اصلاح دونوں چاہتے ہیں فرق اس قدر ہے کہ وہ اپنی عقل و فہم کے مطابق اصلاح چاہتے ہیں۔ اور یہ زمانہ نبوی کا اسلام پیش کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ دنیائے اسلام کے عام مسائل کے متعلق ادوروں کا خیال چاہے کچھ ہو ابن سعود یہ چاہتا ہے کہ جہاں کتاب اللہ کی طرف سے حد مقرر ہو جائے۔ وہاں بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کرنا چاہئیے یہی ابن سعود کا مذہب ہے۔ یہ حقیقت بھی نظرانداز کرنی نہ چاہئے کہ مقامات متبرکہ پر حکمران ہونیکی حیثیت سے ابن سعود کو دوسرے بادشاہوں کی نسبت بہت زیادہ فوقیت حاصل ہے۔ ہر سال حج کے موقعہ پر جو خیالات وہابی سلطان دوسروں تک پہنچاتا ہے بلا شُبہ اُنکی اشاعت نہایت وسیع اور دیرپا ہوتی ہے۔

مگر مقامات مقدسہ کے قبضہ کو ابھی زیادہ اہمیت دینی نہیں چاہئیے کیونکہ پہلی سلطنت کے وہابیوں نے بھی اکثر عجمی مسلمانوں کو اپنا ہم خیال کر لیا تھا مثال کے طور پر انیسویں صدی کے ابتدا میں ہندوستان میں وہابیت کی تحریک جاری ہوئی تھی، چنانچہ پنجاب میں انگریزوں کی عملداری سے پہلے ایک وہابیوں کی ریاست موجود تھی آجتک ہندوستان میں ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو دراصل وہابی ہیں۔ مگر اُنہیں اور نام سے پکارا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اہلِ حدیث حضرات اسی طرح جزائر شرق الہند میں وہابیوں کی کثیر تعداد موجود ہے۔ سوڈان میں بھی وہابی تحریک جاری ہوئی تھی۔ غرضیکہ شمالی افریقہ سے لیکر جزائر ملایا تک کے سُنی مسلمانوں نے وہابی سلطنت سے متاثر ہوکر اسلام کو بیرونی آلائشوں سے پاک کرنے کی سعی کی۔

جب پہلی وہابی سلطنت اپنی ناروا داری سخت گیری اور تعصب کے باوجود اس قدر کامیابی حاصل کرسکی تو کون کہہ سکتا ہے کہ سلطان عبد العزیز جیسے بیدار مغز نیک دل اور شریف بادشاہ کے عہدِ حکومت میں اسلام کو کس قدر تقویت حاصل ہو۔

باب چہل و یکم

تحریک وہابیت کا حشر

ابن سعود کے سوانح حیات اور تحریک اخوان کے عہد بعہد کے حالات اور وہابیوں کی دو صد سالہ زندگی کے واقعات مطالعہ کرنے سے ناظرین کے دلمیں تحریک وہابیت کے مستقبل کے متعلق ضرور خیال پیدا ہوا ہوگا جمہور مسلمانوں سے جزئی اور فروعی معاملات میں چاہے کتنا ہی اختلاف کیوں نہو۔ وہابیت کا اصل الاصول یہ ہے کہ معتقدات عبادات اور شعائر اسلامیہ میں جو ایزادئیں قرون وسطیٰ میں ہوگئی ہیں۔ اور جنکی سند کتاب و سنت میں موجود نہیں۔ انکو موقوف کرکے ابتدائی اسلام پر عملدرآمد کیا جائے بعد کی پیداوار کا اصطلاحی نام بدعت ہے۔ وہابی تعلیم کا سارا زور بدعت کے ترک پر ہے۔ وہابیوں کا تخیل یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے وقت میں جو اسلام رائج تھا۔ وہی قابل عمل ہے۔

باخبر ناظرین سے پوشیدہ نہیں کہ وہابیوں کے علاوہ دنیا بھر کے مسلمانوں میں اسوقت متعدد جماعتیں ہیں جنکی اصلاح پسندی و فلاح طلبی کا ذوق انہیں مجبور کر رہا ہے کہ جمہور مسلمانوں کو قرون اولیٰ کے اسلام کی طرف لوٹ جانیکی تعلیم دیں۔ یوں تو اس قسم کی جماعتیں مختلف اسلامی ممالک میں موجود ہیں لیکن سب سے مشہور مفتی اعظم محمد عبدہ مصری کے شاگرد ہیں مفتی ممدوح تحریک وہابیت سے کچھ تعلق نہ رکھتے تھے لیکن عمر بھر کی بہترین مساعی بدعت و ضلال کی گمراہی دور کرنے میں صرف ہوئیں کیونکہ علم و فضل میں علامۂ دہر اور یگانۂ عصر تھے اسلئے انکی تعلیمات کا اثر صرف مصر تک ہی محدود نہ رہا بلکہ اقصائے عالم میں پھیل گیا۔ مفتی صاحب ۱۹۰۵ء میں اسلام کی نہایت گرانقدر خدمات سرانجام دیکر راہئی ملک عدم ہوئے تو سید رشید رضا انکا قابل جانشین اپنے لائق پیشرو کے نقش قدم پر چلکر تجدید و اصلاح کی دعوت دیتا رہا مغرب کے علماء نے کھلے الفاظ میں تسلیم کر لیا ہے کہ رسالہ المنار نے جو سید موصوف کے زیر ادارت برسوں سے شائع ہوتا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے بہت سے پیچیدہ مسائل کو سلجھا دیا ہے۔ مفتی محمد عبدہ کے متعدد شاگرد خاموشی سے سرگرم عمل ہیں اور اسلام کیلئے نہایت خوشگوار فضا پیدا کر رہے ہیں۔

یہ جماعت اسلام کو نئے رنگ میں پیش کرتی ہے۔ اور ثابت کرتی ہے کہ اسلام میں تمدن معاشرت اور سائنس کی نئی نئی ترقیات کیساتھ دوش بدوش چلنے کی صلاحیت ہے ان لوگوں کا نظریہ ہے کہ اسلام کوئی فرسودہ اور بوسیدہ مذہب نہیں ہے کہ اسکی جاذبیت قرون وسطیٰ اور ازمنہ سابقہ کیلئے ہی وقف ہو۔ بلکہ یہ ان معتقدات کا مجموعہ ہے جو ازل سے بنی نوع انسان کی فطرت میں

داخل ہیں۔ اور ان اصولوں کا نام ہے جو ہر عہد ہر ملک اور ہر تمدن میں قابل قبولیت و عمل ہیں ان لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام میں نہ صرف یہی
صلاحیت ہے کہ یورپ اور امریکہ کے موجودہ تمدن کو اپنا لے بلکہ یہ استطاعت بھی رکھتا ہے کہ انسان کے ذہنی قوی کا منتہائے عروج
اور مادی تہذیب کا کمال اسکے زیر اثر حاصل ہو اس سلسلے میں یہ امر حیرت انگیز ہے کہ یہ لوگ بھی کتاب و سنت کو مسلمانوں کیلئے کافی سمجھتے
ہیں تقلید کو مذموم جانتے ہوئے اجتہاد کے دروازے جو صدیوں سے جمہور مسلمانوں کیلئے بند تھے کھولنا چاہتے ہیں۔ اور مذہب میں ہر بدعت
اور مابعد کی ایزادی کو رفع کرنا چاہتے ہیں اٹھارہویں صدی عیسوی کی اندرون عرب کی وہابیت اور بیسویں صدی کے مصری تجدد
و اصلاح کی مطابقت اور دونوں کی بدعت سے بیزاری تعجب انگیز ہے۔ دونوں تحریکوں کے ماحول اور ماخذ جدا ہیں مطمع نظر
بھی جدا جدا ہیں لیکن طریق کار اور لائحۂ عمل بالکل یکساں ہے۔

وہابیوں کے جو مختصر حالات بیان کئے گئے ہیں اُن سے چند خصوصیتوں کا حال ناظرین کو معلوم ہو چکا ہوگا وہابی بیحد خشک
مزاج تنگدل اور متعصب واقع ہوئے ہیں یہ لوگ مروجہ علوم عربیہ و اسلامیہ کو جو کہ مسلمانوں کی تیرہ ۱۳ سو برس کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہیں
نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مغربی علوم و فنون کی تحصیل کو ناجائز قرار دیتے ہیں اپنے مخصوص عقائد کے منوانے کیلئے تشدد کا
استعمال جائز سمجھتے ہیں غیر وہابی عناصر سے ارتباط پیدا نہیں کرنا چاہتے نقل و حرکت کے موجودہ وسائل اور ذرائع جنگ و جدل
کے جدید حربے اور سائنس کی ایجادات و اختراعات کو بدعت سمجھنے کیوجہ سے اختیار نہیں کر سکتے ہر قسم کی دنیاوی و اقتصادی
ترقی کو خدا پرستی کے منافی سمجھکر مذموم سمجھتے ہیں ظاہر ہے کہ ان میں سے اکثر خواص اُنکے جغرافیائی حالات اور مخصوص ماحول کا نتیجہ
ہیں نجد بیرونی دنیا اور موجودہ زمانہ کی تہذیب و شائستگی سے بہت دور ہے جبتک وہابی صرف نجد میں محدود تھے اُن کے لئے
ممکن تھا کہ جس قسم کی الگ تھلگ زندگی چاہیں بسر کریں نجد کے بے آب و گیاہ ملک میں زندگی اور اسکی دلچسپیوں سے بے بہرہ رہنا
عجب نہیں۔ خالص جداگانہ ماحول میں تعصب اور اجنبیوں سے نفرت پیدا ہونا بھی انوکھی بات نہیں لیکن اب نجدی شجاعت و
تہور نے حجاز کی مقدس سرزمین کو مفتوح کر لیا ہے۔ اب سعودی حکومت نے بین الاقوامی تعلقات پیدا کر لئے ہیں وہابیوں
کی تنہا پسندی اور عزلت گزینی ہمیشہ کیلئے ختم ہو گئی ہے چاہیں یا نہ چاہیں ان کیلئے لازمی ہو گیا ہے کہ غیر ملکیوں سے تجارتی
اور سیاسی تعلقات پیدا کریں حج کے محاصل بخوبی حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ غیر وہابی مسلمانوں کی ہر سال مہمانداری
کریں۔ اور خاطر و مدارت سے کریں۔

پہلی وہابی سلطنت نے ملحقہ علاقوں کے مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے اور انہیں قتل و غارت کیا۔ لوٹ مار تو
انکا معمولی کھیل تھا گذشتہ ابواب میں بیان ہو چکا ہے کہ ابن سعود نے رفتہ رفتہ گردونواح کی امارتوں کو فتح کر لیا ہے بعض مقامات
پر اُسکے اخوان نے تشدد اور ظلم سے کام لیا ہے۔ اب یمن کے سوا کوئی عرب ریاست وہابیوں کی سلطنت کے گرد پیش باقی نہیں

نہیں جو انگریزوں کے زیر اثر اور زیر حمایت نہ ہو انگریزوں کی عسکری طاقت اور نظامِ حکومت بالفعل ایسا مستحکم ہے کہ ابن سعود کیلئے ان علاقوں پر حملہ کرنا آسان نہیں ابھی تک اُسکے پاس جنگ کے جدید اسلحہ موجود نہیں نہ ہی منظم فوج ہے کہ کسی مغربی طاقت کا مقابلہ کر سکے نجدیوں کی جسارت اور مذہبی جوش اور ابن سعود کی پرشکوہ شخصیت کے علاوہ اسوقت تک سلطنتِ سعودیہ کے استحکام کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ اسلئے مستقبل قریب میں وہابیوں کی طرف سے کسی جارحانہ کاروائی کا امکان نہیں۔ البتہ اگر کوئی طاقت ان پر حملہ کرے تو وہ سلطنت و ناموس کی محافظت میں جانیں لڑا دینگے۔

بیسویں صدی میں مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے ذرائع وہ نہیں جو زمانۂ ماضی میں رائج تھے۔ اب وہابیوں کیلئے بھی ممکن نہیں کہ اپنے معتقدات کی اشاعت بنوکِ شمشیر کر سکیں۔ تشدد کا استعمال تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کیلئے انہیں صلح و آشتی سے کام لینا پڑیگا۔ اور ملک کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے تجارتی روابط پیدا کرنے ہونگے۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ دن بدن انکی درشتی اور خشونت کم ہوتی جائیگی اور رواداری اور بے تعصبی بڑھتی جائیگی ممکن نہیں کہ وہابی عرصہ تک مختلف ممالک اور اقوام کے لوگوں سے میل جول کریں۔ اور اجنبیوں کی نفرت قائم رکھ سکیں۔ مہذب و متمدن ممالک کی سیر و سیاحت سے وہابیوں کی خشک مزاجی اور خشک دماغی بھی جاتی رہیگی سلطنت کی ضروریات کے تحت ابن سعود کو اپنے ممالک میں مروجہ تعلیم عام کرنی پڑیگی جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نئے علوم و فنون کی روشنی بڑھتی جائیگی۔ اور سائینس کی یورش کے مقابلے میں وہابیوں کو اپنے معتقدات کے تحفظ کیلئے از سر نو علوم عربیہ اسلامیہ کی ضرورت پیش آئیگی۔ اس طرح پر عام تعلیمی حالت اور ذہنی کیفیت ترقی پذیر ہوگی سعودی سلطنت کبھی مستحکم نہیں ہو سکتی جبتک کہ نظامِ حکومت کے موجودہ طریقے نقل و حرکت کے متمدن وسائل اور آرام و آسائش کی نئی ایجادات اعتدال کیساتھ اور شرعی نقطۂ نگاہ کے ماتحت اختیار نہ کیجائینگی۔ اس طرح پر اگر دین میں نہیں تو دنیا کی بہت سی بدعتیں قوانین فطرت کے زور سے وہابی معاشرت میں خود بخود داخل ہو جائیں گی۔

اس وقت وہابیوں کے حالات و کوائف پر کتنے ہی اعتراض کیوں نہ ہو سکیں لیکن اگر ابن سعود کی قوم اور سلطنت کو امن و آشتی کی فضا میں پرورش و ترقی کے مواقع میسر آ گئے۔ تو خالص توحید اور اسلام کے پاکیزہ اور بے لوث معتقدات جب علوم عربیہ اسلامیہ کی روشنی میں مغربی علوم و فنون اور مغربی تمدن کی پسندیدہ باتوں سے ہمدگر ہونگی تو نہایت خوشگوار نتائج پیدا ہونگے۔ اور جزیرۃ العرب جو ہمیشہ سے مسلمانوں کا مذہبی مرکز رہا ہے۔ انکی نشاۃ ثانیہ کی نئی وعوت دیگا۔ یقیناً وہ وقت مسلمانانِ عالم کی خوش قسمتی اور بہبود کا ہوگا۔

”سلسلہ مشاہیر اسلام“

التماس

جنگِ عظیم کے شروع ہوتے تک اسلامیانِ عالم کا زوال و انحطاط اپنی منزلِ آخرین تک پہنچ چکا تھا۔ مسلمانوں کا جذبۂ حریت، انکی سرفروشی، مذہب اسلام سے انکا والہانہ عشق ایک عرصے سے کافور ہو چکا تھا۔ انکے قوائے عملیہ میں ضعف اور حیاتِ اجتماعی میں فساد پیدا ہو چکا تھا۔ تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی۔ انتظام و انصرام ملکی کی ابتری۔ طبائع کی افسردگی۔ عناصرِ حکومت کی پژمردگی۔ عظیم آبادیوں کے جمود و سکون اور تنظیم و تربیت اور عزم و استقلال کے عام فقدان کی وجہ سے ہر طرف اضمحلال و اختلال کے آثار نمایاں تھے۔ یورپ کے استعمار اور مغربی حکومتوں کی ریشہ دوانیوں نے ترقی کی راہیں مسدود کر دی تھیں، انکی عدم استعداد و صلاحیت اور کمزوری اور واماندگی ایک عالم پر آشکارا ہو چکی تھی۔ مغربی مدبر مسلمانوں کو سیاسی دنیا سے حرفِ غلط کی طرح سے محو کر دینے کا پورا تہیہ کر چکے تھے۔ مگر اپنی باہمی رقابت کی وجہ سے اپنی نامحمود اور مذموم تجاویز پر عمل پیرا ہونے سے قاصر تھے۔ شومئے بخت سے جنگ کے اختتام کے قریب چند ماہ کی مدت ایسی بھی آئی کہ دنیا بھر میں کوئی گوشہ ایسا نہ رہا۔ جہاں مسلمان آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ ہر جگہ غلامی و نامرادی کا دور دورہ تھا لیکن خداوندِ عالمین کو ابھی مسلمانوں کی عزت و توقیر منظور تھی۔

مسلمانوں میں ابھی تک زندگی کی کوئی رمق باقی تھی۔ ان حوصلہ شکن اور روح فرسا حالات کے بعد وہ جہادِ حریت اور جنگِ آزادی شروع ہوئی جسمیں نتیجہ کے طور پر ایک طرف ترکی کے مردِ بیمار نے پوری شکست کے بعد کامل فتح پائی۔ اور صدیوں کے کھوئے ہوئے وقار کو پھر سے حاصل کر لیا۔ دوسری طرف ایران نے روسیوں اور انگریزوں کی حمایت سے منہ موڑ کر سرخروئی حاصل کی، ادھر افغانستان نے بنوکِ شمشیر استعمارِ انگلستان کے تار و پود کو بکھیر دیا۔ اور ادھر مصر نے ماتحتی کی ذلت بخش حالت پر قناعت کر چکنے کے بعد آزادی کی وہ تحریک شروع کی جسمیں بہت سے اہم مراحل بنک طے ہو چکے ہیں غرض یہ ہے۔ کہ عالمِ اسلام کے ہر حصے اور ہر گوشے میں صدیوں کے جمود و سکون کے بعد ایک عظیم ہیجان پیدا ہو گیا عزمِ تازہ کی لہر ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گئی۔ اور جان بخش اور روح پرور آزادی کے صدیوں کے خفتہ جذبات بیدار ہونے لگے لیکن ہندوستانی مسلمانوں کو اسلامی دنیا کے حالات و کوائف سے بے انتہا شغف ہے۔ مگر وفورِ ذوق شوق کے باوجود انہیں اس انقلابِ عظیم کے مفصل حالات سے پوری طرح آگاہی نصیب نہیں ہوئی۔ ہندوستان کے اسلامی اخبارات ”عالمِ اسلام“ کے عنوان کے ماتحت ایک دو کالم ہر اشاعت میں وقف کر دیتے ہیں۔ مگر انمیں نہ تو اِستنادِ واقعات

کا خیال ہوتا ہے۔ اور نہ ہی حوادث و کوائف کی اہمیت ملحوظِ خاطر ہوتی ہے۔ ربط و تسلسل کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اُردو زبان میں ایسی کتابیں بہت کمیاب ہیں جو کہ مستند اور قابلِ وثوق طریق سے مفصّل واقعات مہیا کر سکیں، اب اردو زبان کی بے مائیگی کی مرثیہ خوانی کہنہ داستان ہو چکی ہے، اخذ و تحصیل معلومات کی اس دیرینہ ضرورت کو پورا کرنے کیلئے "یہ سلسلہ مشاہیر اسلام" قائم کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اسلامی ممالک کے متعلق جداگانہ اور مستقل کتابیں شائع کیجائینگی۔ ہر ایک کتاب میں ایک اسلامی مُلک کی عصرِ حاضرہ کی مکمّل تاریخ کے علاوہ سیاسی، تعلیمی، اقتصادی، عمرانی، تمدّنی معاشرتی، اصلاحی اور اخلاقی حالات پوری تفصیل و تصریح سے درج کئے جائینگے۔ اور ہر قسم کے ضروری اعداد و شُمار مہیا کئے جائینگے۔ ہر جلد گرانمایہ معلومات کا بیش بہا خزینہ ہوگی۔ پبلک کے سامنے بہترین اور بلند ادبی معیار کا لٹریچر پیش کیا جائیگا۔ طرزِ تحریر نہایت دلکش اور پسندیدہ ہوگی۔ طباعت و اشاعت کا اہتمام بہتر سے بہتر طریق پر کیا گیا ہے۔

تجویز یہ ہے کہ اس سلسلے کیلئے مذاقِ سلیم رکھنے والے اصحاب کا ایک حلقہ بنا لیا جائے اور جو کتاب طبع کی جائے وہ مارکٹ میں پھینکنے سے پیشتر اس حلقۂ احباب میں تقسیم کردیجائے۔ اس مقصد کیلئے ہم نے مستقل خریدار پیدا کرنے کا تہیّہ کر لیا ہے۔

اس سلسلے کے مستقل خریدار بننے کیلئے آپکی جیب پر کوئی مالی بار نہیں پڑیگا۔ ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہمارے مستقل خریدار جو اس سلسلے کے ممبر بھی تصوّر کئے جائینگے ہمیں کوئی سالانہ مالی امداد دیں۔ یا اُنہیں ممبر بنا کر فیس داخلہ یا دیگر کسی بہانے سے کچھ نہ کچھ طلب کیا جائے۔ مستقل خریدار بننے کیلئے یہ کافی ہوگا کہ آپ بذریعہ پوسٹ کارڈ کارکنانِ سلسلہ کو اپنا پورا نام اور مستقل پتہ بھیج دیں۔ تاکہ آپکا نام رجسٹر میں درج کر لیا جائے۔ سلسلہ کی طرف سے جو کتاب شائع ہوگی۔ وہ عام پبلک سے ۲۵ فیصدی کم قیمت پر آپ کی خدمت میں ارسال کردی جائیگی۔ محصول ڈاک اور پیکنگ وغیرہ کا صرف پچاس فیصدی آپکے ذمہ ہوگا۔

کیا آپ سلسلہ کے افادہ اور دلچسپی کو مدِّ نظر رکھکر مستقل خریدار بننے کی استدعا کو شرفِ قبولیت بخشینگے۔ اور جلد از جلد اطلاع دیکر رہینِ منّت فرمائیں گے؟

منیجر

"سلسلہ مشاہیر اسلام"

جالندھر شہر

(قمر الدین کاتب باغ شیخ کرم بخش جالندھر شہر)